ڈاکٹر فرمان فتح پوری

حیات اور کارنامے

تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی اردو

نگراں:
ڈاکٹر زیبا محمود
ریڈر شعبہ اردو
گنپت سہائے پی جی کالج
سلطان پور

مقالہ نگار
منیب اختر
گنپت سہائے پی جی کالج
سلطان پور

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی
فیض آباد (یوپی)

DR. FARMAN FATEHPURI
HAYAT AUR KARNAMEY

Thesis

Submitted for the Degree of
Doctor of Philosophy

in
URDU

Under the supervision of
Dr. Zeba Mahmood
Reader, Urdu Department
Ganpat Sahai P.G. College
Sultanpur (U.P.)

By
Muneeb Akhtar
Research Scholar
Ganpat Sahai P.G. College
Sultanpur (U.P.)

Dr. RAM MANOHAR LOHIYA AVADH UNIVERSITY
FAIZABAD
2008

فہرست

ابتدائیہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بیسویں صدی کے صف اول کے مایۂ ناز، محقق ونقاد اور ادیب ہیں۔ ان پر اب تک بہت سے کام ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خوش نصیب ہیں کہ ان کے ہم عصروں نے بھی ان کی تحریروں کو سراہا اور اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو ادب میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں انہیں کم عمری سے ہی ادب سے جو شغف رہا وہ تاحیات قائم ہے۔ ساری زندگی وہ ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے۔ ان کا وسیع وعمیق مطالعہ اور ہر پہلو کو سیر بحث سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

اس مقالہ میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادبی زندگی کے ہر پہلو سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ہر بات حوالوں کے ساتھ درج ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی زندگی کا ایک اہم جز نیاز و نگار سے تعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسی سلسلے کی ان پر یہ تحقیقی مقالہ ہے تاکہ ان کی شخصیت اور کارنامے کو بخوبی سمجھا جاسکے۔

مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں فرمان صاحب کے عہد کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس وقت کے سیاسی، سماجی وادبی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی حیات کے مختلف گوشے اور ان کے حالات زندگی اور ہندوستان سے ہجرت اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم میں ڈاکٹر صاحب کے کارنامے تصانیف خاص کر نیاز و نگار سے خصوصی تعلق پر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اس باب میں ڈاکٹر صاحب کی تصنیفی وتالیفی کتابوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فرمان صاحب کی تصانیف نیاز و نگار سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

باب چہارمیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نثری خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ جو کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری بحثیت محقق ونقاد، غالب شناس، اقبال شناس، ہندی اردو تنازعہ، منظوم داستانیں انیس شناسی، قمر زمانی بیگم پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اسی باب میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی مقدمہ نگاری

مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی باب میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تذکرہ نگاری پر تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخر میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری بحیثیت ایڈیٹر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب رسالہ نگار کو آج تک بخوبی اپنی خدمت مسلسل انجام دیتے رہے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے تمام ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی شعر گوئی پر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا تھا مگر تھوڑے عرصے بعد انہوں نے شاعری ترک کر نثر کو اپنا لیا اور آج تک اپنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نثر کی طرف مائل ہونے کے باوجود شاعری سے دور نہ رہ سکے اور نثر و نظم کو اپنی تحریروں کے ذریعہ قاری کو مستفید پہونچاتے رہے۔

باب ششم میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ادبی و تنقیدی نظریات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ہفتم یہ مقالہ کا آخری باب ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادبی خدمات کا مجموعی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالہ کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

میں اپنے اس تحقیقی مقالہ کو پایۂ تکمیل پر پہونچاتے ہوئے آج بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں میں ان سبھی لوگوں کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنہوں نے اپنے پرخلوص تعاون اور خاموشی کے ساتھ قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ جب میں ریسرچ کے خارزار میں قدم رکھا اور فرمان کی تصانیف کے سلسلے میں چھان بین شروع کی تو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ مختلف لائبریریوں کے چکر لگائے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی آزاد لائبریری میں فرمان صاحب کی چند کتابیں مل سکیں وہاں کی لائبریرین شائستہ آپا نے فرمان کے متعلق جو بھی کتابیں تھیں دستیاب کرایا اور انہوں نے مختار الدین احمد آرزو سے ملنے کا مشورہ دیا جب میں شام کو ان سے ملنے گیا تو مایوسی ہوئی فرمان صاحب کی کتاب تذکرہ نگاری کے سوا ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔

میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک ہفتہ مقیم رہا۔ علی گڑھ کے دوستوں میں محمد پرویز، نظام الدین، رفیق اور عبداللہ نے میری ہر ممکن مدد کی۔

دہلی میں جامعہ ملیہ دہلی کی ذاکر حسین لائبریری میں بھی فرمان کی چند کتابیں دستیاب ہوسکیں۔ غالب

اکیڈمی دہلی میں شریف صاحب، شمیم حیدر نقوی صاحب فرمان کی کتابوں کے سلسلے میں کافی مدد کی یہاں فرمان صاحب کی غالب کے متعلق زیادہ تر مواد فراہم ہوگئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو ہند دہلی جو فرمان صاحب کے دوست ہیں فرمان صاحب جب بھی دہلی آئے ان کے مہمان رہے۔ میں ان سے دوبار ملاقات کے لئے گیا مگر بدنصیبی کہ وہ نہ مل سکے ان سے ٹیلی فونی گفتگو فرمان اوران کی تصانیف کے متعلق ہوتی رہی۔

میں بے حد مشکور ہوں عاکف بک ڈپو دہلی ظفر صاحب کا ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی، مکتبہ جامعہ دہلی، کا جنہوں نے فرمان کی کتابوں کو ہندوستان میں شائع فرمایا، ان سب سے زیادہ میں خدا بخش لائبریری کا مشکور ہوں جہاں ہر طالب علم پہونچ کر سیراب ہوجاتا ہے۔ اس لائبریری میں رسالہ نگار کے مکمل سیٹ اور قریب قریب فرمان کی سبھی تصانیف یہاں پر مل گئے۔ مجھے لائبریری کے مہمان خانے میں قیام کے لئے کمرہ بھی مل گیا تھا جس سے میری آسانیاں اور بھی بڑھ گئیں۔

لائبریری کے ڈائرکٹر امتیاز احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر سلیم الدین احمد، اسسٹنٹ لائبریرین ابومظفر عالم اور لائبریری کے سبھی اسٹاف کا میں بہت شکر گذار ہوں جنہوں نے میری کتابوں کی فراہمی میں مدد کی۔ مظفر صاحب نے مجھ سے فرمان کے متعلق جو کتابیں لائبریری میں نہ مل سکیں ان سب کتابوں کا لسٹ بھی لیا۔ اور جلد منگانے کا وعدہ بھی کیا۔ مظفر صاحب نے مواد کی فراہمی میں نہ صرف میری ہر طرح سے مدد کی بلکہ اپنائیت اور خلوص کا برتاؤ بھی کیا اردو اکیڈمی یو پی لکھنؤ کا بھی میں بے حد ممنون ہوں کہ اکیڈمی نے وظیفہ سے نوازتے رہے۔

سب سے پہلے میں اپنے استاد ڈاکٹر زیبا محمود صاحبہ کے مشفق برتاؤ اور نیک دعاؤں کی تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ کالج اور گھریلو زندگی کی مصروفیت ہونے کے باوجود کچھ وقت ہم طالب علموں کے لئے نکال لیتی۔ میں اپنے بڑے ماموں، بڑے بھائی، بھابھی اور حقیقی و نسبتی بھائی بہنوں کا بھی ممنون و مشکور ہوں جو وقت بروقت مجھے تسلی و حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کے علاوہ دوستوں میں ان کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ دوستوں میں محمد اخلاق، اختر پرویز، ودیعت، اشتیاق بشیر وغیرہ نے ہر طرح سے ساتھ دیا۔

آخر میں اس خدائے پاک ذات کا شکر گذار ہوں جس کے قبضے میں جان ہے جس نے مجھے پیدا

کیا۔ شعور عطا کیا علم دیا اور اس لائق بنایا کہ اچھے برے کی تمیز کر سکوں۔ میرے امی ابو بڑے بھائی چھوٹی بہن صوفیا اپی نے میرے پڑھنے لکھنے میں ہر ممکن مدد کی۔ میرے والدین کی دعائیں سدا میرے ساتھ رہیں ابو کی شفقت امی کی مسکراتی نظریں اور انکے آنچل کی ٹھنڈی چھاؤں ہمیشہ مجھ پر سایہ فگن رہے، انکی دعاؤں کا ثمرہ ہی تو ہے جو میں اس لائق بن سکا۔ ایک بار پھر میں اپنے بڑے بھائی کا دل عمیق گہرائیوں سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ایک مشفق باپ کا فرض ادا کیا پردیس میں رہتے ہوئے میری اس عمر میں حتی الامکان مدد کی۔

ایک بار پھر میں اپنے استاد صاحبہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ علمی وادبی مصروفیت ہونے کے باوجود انہوں نے کوشش بھر میرا تعاون و رہنمائی کرتی رہیں۔ انشاء اللہ آئندہ بھی ان کی عنایتوں اور رہنمائی سے لبریز ہوتا رہوں گا۔

پیش کردہ
منیب / فنر

☆☆☆

باب اول

عہد کا پس منظر

سیاسی، سماجی و ادبی حالات

عہد کا پس منظر۔سیاسی ،سماجی وادبی حالات

ہندوستان ایک سانحہ ایک مایوس کن دَور سے گذرا میرا اشارہ تقسیم ہند کی طرف ہے جب سیاسی ہیجان اپنے نقطہ عروج پر تھا اور قیام پاکستان سے دلسوز و دل دوز حادثے رونما ہو رہے تھے یعنی ہندوستان ایک مکمل مرقع افسردہ سے روشناس ہو چکا تھا۔

۱۹۴۷ء کو ہندو پاک کی تقسیم عمل میں آئی۔ ملک برطانوی سامراج کے شکنجے سے آزاد ہوا مگر یہ دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ وائس رائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا منصوبہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے منظور کرلیا۔ برصغیر کا جغرافیہ بدل گیا۔ پاکستان وجود میں آگیا اور قائداعظم محمد علی جناح اس کے گورنر جنرل ہو گئے اور ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن ہی رہے۔حکومت پنڈت جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں کانگریس پارٹی کی رہی۔تحریک آزادی کے رہنما مہاتما گاندھی زندہ تھے مگر قوم کو متحد رکھنے کا کام چکنا چور ہو گیا تھا۔

بیسویں صدی کا ایک اہم مسئلہ ہندو مسلم تعلقات کا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی تھی یہ شروع میں انگریز حکمرانوں سے حقوق کا مطالبہ عرضداشتوں کے ذریعے کرتی تھی ،لیکن جب ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کا زمانہ آگیا تو برطانوی حکومت کے خلاف تحریکیں عمل میں آئیں۔ پہلے تو کانگریس کے جلسے کسی بڑے ہال میں یا بڑے کمرے میں ہوتے تھے،اب عام سبھائیں ہونے لگیں۔ پہلے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہی تحریک میں شریک تھے اب عوام اس تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ہڑتالیں ہونے لگیں، ستیہ گرہ کا ہتھیار اپنایا گیا۔لوگ سرکاری نوکریوں سے استعفیٰ دینے لگے۔سرکاری اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو چھوڑنے لگے کسان لگان دینا بند کرنے لگے۔جیل یاترا سیاسی رہنماؤں کا طریقہ ہو گیا۔گاندھی جی اور انکے ساتھیوں نے اسہیوگ یا عدم تعاون کا سبق سکھایا۔قوم پرستی کے جذبات ابھر کر سامنے آنے لگے۔جلیاں والا باغ میں نہتے ہندوستانیوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا اور ہندوستانی عوام کے دل سے انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کے جذبات ابھر آئے۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی۔ برطانوی سامراج کی پالیسی ''پھوٹ کراؤ اور حکومت کرو'' کی تھی اور انگریز حکمرانوں نے مسلم فرقہ پرستی کو بڑھانے میں ہر ممکن کوشش کی ،جداگانہ انتخابات کا طریقہ برطانوی حکومت نے رائج کردیا۔اسکے تحت مسلم ووٹر مسلم نمائندے کو چنتے تھے اور غیر مسلم ووٹر غیر مسلم نمائندے کا

انتخاب کرتے تھے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد مشن کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ تصور پیش کیا کہ ہندوستان کے مغربی صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے الگ ایک ریاست قائم کی جائے تا کہ وہ انڈین فیڈ ریشن میں رہ کر مسلمانوں کے مذہب و کلچر کی حفاظت کا انتظام کر سکے ۱۹۴۰ء میں مسٹر جناح کی قیادت میں مسلم لیگ نے لاہور مشن میں تحریک پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات ہو چکی تھی۔ علامہ اقبال مذہب کو قومیت کی بنیاد مانتے تھے۔ مسلم لیگ نے دوقومی نظریئے کو اپنی تحریک کی بنیاد بنایا۔ مسلم لیگ کی صوبائی حکومتیں تحریک پاکستان کی حمایت میں لگ تھیں۔ گاندھی جناح ملاقات ناکام ہوئی۔ کرپشن مشن اور اس کے بعد کینٹ مشن نے سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کا طویل سلسلہ جاری رکھا۔ انگریزوں نے ۱۹۴۷ء میں اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کر دیا۔ ملک دو حصوں میں بانٹ دیا گیا صرف برصغیر کا بٹوارہ نہیں ہوا، صوبوں کو بھی حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ صوبے ہی نہیں تحصیلیں بھی بانٹ دی گئیں۔ ریڈ کلف ایوارڈ نے جلدی جلدی میں علاقوں کی تقسیم کر ڈالی۔ سارا ملک فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں پہلے ہی جل رہا تھا اب یہ آگ اور تیز ہو گئی۔

انگریزوں کی پالیسی نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں خلیج تو پہلے ہی پیدا کر دی تھی۔ اس سلسلے میں فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ جدو جہد کی چنگاری تیز ہوتی چلی گئی اور مطالبہ کیا جانے لگا مکمل آزادیہ کا۔ آخر کار ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم کے ساتھ ہندوستان آزاد ہو گیا لیکن یہ آزادی اپنے پیچھے خونریزی اور تباہی کا ایک طوفان بھی لائی تھی۔ پہلے مذہب کی بنیاد پر ملک تقسیم ہوا اور خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ پھر زبان کی بنیاد پر ہندوستان و پاکستان کے ٹکڑے ہوئے اور دلوں میں نفرت کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ برسوں کی رواداری اور محبت خاک میں مل گئی۔ جنونیوں نے لوگوں کو چن چن کر مارا۔ ابھی آزادی کا جشن بھی نہیں منا پائے تھے کہ لاکھوں لوگوں پر تباہی و بربادی ٹوٹ پڑی افراتفری کا عالم تھا بہت سے لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے مہاجرین کا ایک ایسا سیلاب جو سرحد کے اس پار سے اس پار اور اس پار سے اس پار آنے کے لئے بیچین تھا۔ جو بے یار و مددگار چل پڑے تھے کچھ پہونچ گئے کچھ راستے میں رہ گئے وطن کی تقسیم اور آزادی اور اس سے پیدا شدہ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل نے ادب کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ موضوعات میں بھی تبدیلی آئی اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنے دور کے حالات کے گرد گھومنے لگے۔ سرسید احمد خاں نے دوقومی نظریئے کو پیش کیا تھا۔ ان کا خیال تھا ''اب یہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کم ہے

آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور تناؤ ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔'' یہ اختلاف فورٹ ولیم کالج کے قیام ۱۸۰۰ء سے شروع ہوا جب انگریزوں نے کچھ فارسی آمیز کتابوں کو آسان اردو میں لکھوایا اور کچھ سنسکرت زبان کی کتابوں کو ہندی میں ترجمہ کرایا یہ انگریزوں کی ایک سوچی سمجھی اور گہری سازش تھی۔ جس کے نتائج بڑے دوررس تھے۔ اس کے بعد ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اسی کے پیش نظر انگریزوں نے مختلف صوبوں اور مقامی بولیوں کے ساتھ فروغ و ترقی میں پوری مدد کی ان کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کو توڑنا تھا۔ یہی زبان کی تعصب آہستہ آہستہ چنگاری بن کر ۱۹۴۷ء تک پہونچا۔ جس دیش کی آزادی کی لڑائی ہندو مسلمان دونوں نے مل کر لڑی تھی آزادی تو مشترکہ طور پر مل جل کر حاصل کر لی مگر انگریزوں کی چالوں سے کیسے بچ سکتے تھے وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ پھوٹ پیدا کر کے چلے گئے۔ گاندھی جی بھی اردو کے ساتھ سیاسی چالیں چلتے رہے۔ اردو زبان مسلمانوں کی زبان کہلائی اب اسکے تحفظ کی ذمہ داری مسلمانوں پر آن پڑی جب مسلمانوں کو گاندھی جی کی سیاسی چالوں کا اندازہ ہوا۔ تو وہ ایک الگ وطن کا مطالبہ کر بیٹھے اردو زبان کے محافظ نے ایک الگ پاکستان بنوا دیا مگر اردو کا ایک عرصے تک پاکستان میں بھی وہ مقام نہ مل سکا جس کی وہ مستحق تھی۔

اس دور میں گاندھی جی اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ عدم وتعاون اور مقابلہ کی تحریک شروع کی گاندھی جی نے تحریک سول نافرمانی اور ستیہ گرہ شروع کیا سودیشی تحریک کے ذریعے انگریزی سامان کا بائیکاٹ کیا ان کے ڈانڈی مارچ نے انگریزوں کی بنیاد کو ہلا دیا۔ لیڈروں کو جیل میں ڈالا گیا۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں جیسے افراد کو جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی مگر یہ تحریک پروان چڑھتی رہی۔ اس تحریک میں مولانا محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، موتی لال نہرو اور گاندھی جی نے اس جدوجہد کو تیز سے تیز تر کیا۔

اس ماحول میں مختلف قسم کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکیں نئی تبدیلیوں سے آشنا کرا رہی تھیں تب ''اودھ پنچ'' ایک نئی ادا کے ساتھ نمودار ہوا۔ اودھ پنچ دراصل اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردعمل تھا۔ ہندو مسلم مشترک مقصد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے تھے۔ آزادی کی جدوجہد ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی مگر پاکستان کے وجود نے دونوں قوموں کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی۔ تقسیم کے بعد حالات خراب ہو گئے چاروں طرف فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو گیا۔ آہ و بقاء ظلم و تشدد کی

آگ بھڑک اٹھی۔ سرحد کے اس پار پاکستان نام کی مملکت وجود میں آئی جہاں کی زبان اردو تھی۔

دوسری طرف ہندوستان کے حالات مختلف تھے اردو کو مٹانے اور ساتھ ہی اردو والوں کو ایک مجرم کی حیثیت سے زندگی گذارنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ تقسیم ملک کی تمام تر ذمہداری انہی بے یارو مددگار لوگوں پر ڈالی جارہی تھی جو زندگی اور موت کے کشمکش سے دوچار تھے۔ اس آزادی نے ایک نئے سیاسی، سماجی منظر نامے کو جنم دیا۔ ادیبوں اور شاعروں کے قلموں کو نئی سمتیں عطا ہوئیں اور موضوعات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ادیبوں اور فنکاروں کی تحریروں سے ان کے حالات و مسائل گریہ وزاری شکوہ و شکایت، احساس مظلومت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

بیسویں صدی کے برصغیر میں صنعتی انقلاب آیا، شہروں اور دیہاتوں کے حالات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ نئے نئے کارخانے کھولے گئے اور مزدوروں کی یونین نے اپنا کام کرنا شروع کیا۔ کسان بھی جاگ اٹھے، زمینداروں اور تعلقہ داروں کے خلاف کسان آندولن ہونے لگے۔ تعلیمی ادارے فروغ پانے لگے۔ ملک میں نئے خیالات اور رجحانات نے جنم لیا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحرک کا آغاز ہوا۔ اس کا پہلا مشن لکھنؤ میں ہوا جس کی صدارت منشی پریم چند نے کیا۔ اردو ادب میں شبلی، حالی، اکبر، اقبال، چکبست کی وجہ سے تبدیلیاں پہلے ہی آ گئی تھیں۔ نظم ونثر میں نئی روح پھونکی جاچکی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے مارکسزم خیالات اور انقلابی نظریوں کے زیر اثر ادب میں نئی حقیقت پسندی کو جنم دیا۔ ادب کا رشتہ عوام سے اور استوار کیا گیا۔ نئے نئے تجربات کئے جانے لگے۔ بیسویں صدی میں صحافت نے زور پکڑا۔ الہلال اور البلاغ نے ہندوستانی قوم کو جھنجھوڑ دیا۔ اودھ پنچ، مخزن، زمانہ، زمیندار، نگار نے ملک کے کونے کونے میں نئی زندگی کا پیغام دیا۔ بیسویں صدی کے ادب پر عظیم شعراء ٹیگور اور اقبال چھائے رہے۔ نثر نگاری میں منشی پریم چند اور مولانا ابوالکلام آزاد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ کی تحریروں سے انگریزی سامراج کی بساط پر لرزہ طاری کر دیا تھا اور سچے محب وطن ہونے کے ناطے ملک کو انگریزوں سے پاک کرنا اپنا بنیادی مقصد سمجھتے تھے۔

سرسید احمد خاں بھی مسلمانوں کے ایک سرگرم کارکن تھے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی، علمی، و ادبی، سماجی اصلاح کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے وہ مسلسل مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کا بگل بجاتے رہے۔

اسی سلسلے میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا جس میں اکثر و بیشتر سر سید احمد خاں کے مضامین ہوتے تھے۔ سر سید احمد خاں کی ایک اور تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' ہے جس میں ہندوستان سے لے کر برٹش پارلیمنٹ تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس تصنیف میں سر سید نے ان حالات کا تجزیہ کیا جو بغاوت کا سبب بنے۔

حالی اپنے اشعار کے ذریعے ہندوستانی قوم کو بیداری کا سبق دے رہے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہو۔

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی — بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں — رستہ کدھر ہے ان کا اور جارہے کہاں ہیں

فضل و کمال ان کے کچھ تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

علامہ شبلی نے سر سید احمد خاں کی یوں تصویر کھینچی ہے:

صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرہ پہ فروغ صبح گاہی

وہ ریش دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورتِ مجسم

شبلی کی سیاسی نظموں میں اس دور کی جھلیاں موجود ہیں۔ مسلم لیگ پر شبلی کی طنزیہ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں — ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے

ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ — نظر لطف رئیسانِ خوش انجام بھی ہے

کوئی ہے جو نہیں اس حلقہ قومی کا اسیر — اس میں زیاد بھی ہیں رندے آشام بھی ہے

فیض اس کا ہے بہ اندازہ طالب یعنی — بادۂ صاف بھی ہے، درد بہ جام بھی ہے

صدمہ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُرآب — دل میں غمخواری ترکان نکو کام بھی ہے

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں — محسن قوم بھی ہے، خادم حکام بھی ہے

اکبر الہ آبادی کہتے ہیں:

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتے

اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

انقلاب آیا، نئی دنیا، نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا، اب ذکر گاندھی نامہ ہے

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

لارڈ ایڈنگ کے گوراشاہی دبدبہ و جبروت کے عین شباب میں ۱۹۲۱ء میں اکبر نے پیش گوئی کی تھی:

اس تمنا کے برآنے میں بہت دیر نہیں
یعنی ہم صیغۂ ماضی میں سنیں حال ان کا

اکبر نے تحریک خلافت اور ترک حوالات پر خوب خوب گل افشانیاں کیں:

اے چرخ ہوائے شوق چلے، اے شاخ عمل گلباری کر
کچھ سعی کریں، کچھ کام کریں، ہر شیخ کو عبدالباری کر

بدھو میاں بھی حضرت گنادھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر الہ آبادی مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالوی کا فرق یوں بیان کرتے ہیں:

گاندھی اور مالوی میں ہے کیا فرق اپ اس بحث میں ہیں ناحق غرق
فرق وہ ہے جو حسن و عشق میں ہے اک کاشی میں، اک دمشق میں ہے

اقبال نے ترانہ ہندی دیا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اپنے ایک نظم میں ہندوستانی قوم کے بیداری کا پیغام دیتے ہیں:

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

چکبست نے حب الوطنی کے نغمے سنائے:

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

۱۹۱۷ء میں چکبستؔ نے وطن کا راگ الاپا:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

گاندھی جی کے بارے میں کہا:

نثار ہے دل شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے ثبت ترا نام اس نگینے پر

مسز اینی بیسنٹ ۱۹۱۷ء میں گرفتار ہوئیں تو چکبستؔ نے لکھا:

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے — جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے — چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے
تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں — شمع فانوس میں ہے، نور ہے محفل بھر میں

مولانا حسرتؔ لکھتے ہیں:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

روح آزاد ہے، خیال آزاد
جسم حسرتؔ کی قید ہے بیکار

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضان بھی حسرتؔ
گرچہ ساماں سحر کا تھا نہ افطار کا

کچھ مرے دل سے مخصوص نہیں لذت غم
خوش اسی حال میں جوہرؔ بھی ہے آزاد بھی ہے

اس شعر میں مولانا حسرتؔ نے مولانا محمد علی جوہرؔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کو یاد کیا ہے:

جوہرؔ، افسوس کہ زنداں میں بھی چکی نہ ملی
قید ہوکر بھی ہوں محتاج پسنہاری کا

جب مولانا محمد علی جوہرؔ کو کراچی کے مقدمے میں سزا دی گئی تو انہوں نے کہا:

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا؟
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قید بے میعاد کا

گول میز کانفرنس میں مولانا جوہرؔ کی ولوہ انگیز تقریر تحریک آزادی کی داستان کا زریں ورق ہے۔اس کے بعد ان کی وفات پر جوہرؔ کا شعر صادق آیا:

ہے رشک ایک خلق کو جوہرؔ کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی نے وطن کو یوں نذرانہ پیش کیا:

پہلے جس چیز کو دیکھا، وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے سکھایا وہ ہوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی
اولیں رقص ہوا مست گھٹائیں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

اے وطن آج سے کیا ہم تیرے شیدائی ہیں آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے تیرے جلوؤں کے تماشائی ہیں ہم تو بچپن سے ترے عاشق وسودائی ہیں

بائی طفلی سے ہر اک آں جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

جوشؔ نے شکستِ زندان کا خواب دیکھا۔

کیا ہند کا فنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھولوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں

تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا

تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعبیریں

کیا انکو خبر تھی، ہونٹوں پر قفل لگایا کرتے تھے

اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقدیریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے

اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

(۱۹۲۱ء)

۱۹۴۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے زمانے میں قید فرنگ میں آئے۔ ''غبار خاطر'' میں رقم طراز ہیں۔ قلعہ احمد نگر میں بتاریخ: ۱۱راگست ۱۹۴۲ء۔

''قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے، پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا۔ جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اسی منزل سے قافلہ باد پیمائے عمر گذر رہا ہے۔

بازمی خواہم زسر گریم رہِ پیمودہ را

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی عمر کے ترپن برس جو گذر چکے ہیں، ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گذرا، تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم ثبت کے لئے بھی تھا۔ یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی۔ سو ہمارے حصہ میں بھی ثبت کا دن آیا، مگر ہماری تعطیلات اس طرح بسر ہوئیں، گویا خواجہ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے۔

نہ گویمد کے ہمہ سال مے پرستی کن

سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے اس پر نہیں کہ سات

برس آٹھ مہینے قید و بند کئے گئے۔ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں گئے۔(۱)

مولانا آزاد نے یہ مکتوب ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا۔ اسکے بعد قید فرنگ میں انہوں نے دو برس گیارہ مہینے اور گذارے۔ اس طور پر مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔

اس دور کی تصویر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی خودنوشت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بعد میں مولانا ازاد نے ''انڈیا وِنس فریڈم میں ہمایو کبیر کے ذریعے انگریزی میں تحریک آزادی کی داستان رقم کی۔ تحریک آزادی کی کہانی نامور مورخوں کی لکھی ہے۔ لیکن گاندھی جی، نہرو جی اور مولانا ازاد کی تحریروں کی بات ہی اور ہے۔ یہ تاریخ کے اس دور کے تماشائی نہ تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی کی رہنمائی کی تھی اور طوفانوں سے خود گذرے تھے۔

مولانا آزاد نے ''غبار خاطر'' میں لکھا تھا:

''ہم جب گذشتہ سال اگست میں یہاں آئے تھے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔ بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں لیکن مٹی نے بہت کم ساتھ دیا۔ اس بے رنگ سے آنکھیں اکتا گئی تھیں۔ خیال ہوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ مشغلہ کا مشغلہ ہوتا ہے اور اصحاب صورت اور اصحاب معنیٰ دونوں کے لئے سامانِ ذوق بہم پہونچاتا ہے۔

بہ بو اصحاب معنیٰ را، بہ رنگ اصحاب صورت را

جواہر لال نہرو جن کا جوہر، مستعدی ہمیشہ ایسی تجویزوں کی راہ تکتا رہتا ہے، فوراً کمر بستہ ہوگئے اور اس خرابے میں رنگ و بو کی تعمیر کا سر و سامانی شروع ہوگیا۔(۲)

مولانا آزاد قومی اتحاد کے ہمیشہ مبلغ رہے۔ انہوں نے اپنی ولولہ انگیز تقریر میں کہا تھا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہوجائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔''(۳)

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مولانا حسرت موہانی نے سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کو مکمل

۱۔ غبار خاطر۔ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ: مالک رام ساہتیہ اکیڈمی دہلی۔ ۲۰۰۱ء ص: ۳۳،۳۴

۲۔ غبار خاطر۔ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ: مالک رام ساہتیہ اکیڈمی دہلی۔ ۲۰۰۱ء ص: ۱۵۴

۳۔ قائد اعظم اور تحریک پاکستان۔ از: ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء ص: ۲۱

آزادی کا تصور پیش کیا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں جب جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر ہوئے تو لاہور مشن میں مکمل آزادی کو نصب العین قرار دیا گیا۔

ایسے انتشاری دور میں ادب کا یہ عاشق، صادق، اردو اُفق پر رونما ہوا جس نے اپنے خون جگر اور مسلسل سعی و کوشش پیہم سے جو کارہائے نمایاں انجام دیا اس کا سلسلہ اج بھی جاری و ساری ہے۔ اس پس منظر میں اس مایۂ ناز ہستی کا تعارف و حالات زندگی اور ان کے شخصیات کے ہشت پہلو نگینوں کی عکاسی کی اشد ضرورت ہے جو درجہ بہ درجہ قائم ہیں۔ میں اپنے احساسات، خیالات اور تحقیقی کاوشوں کو قلم بند کر ان پر روشنی ڈالنے جا رہا ہوں۔

باب دوم

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی حیات کے مختلف گوشے

نام ونسب، شجرۂ نسب وخاندانی حالات، ولادت، تعلیم وتربیت، ازدواجی زندگی، فکری ارتقاء، فرمان کے استاد، ذریعہ معاش، ہندوستان سے ہجرت، رسالوں میں تصانیف کی اشاعت، اولاد، شاگردواحباب، شخصیت، معاصرین سے تعلقات، اخلاق و عادات۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری..........حیات

سید دلدار علی فرمانؔ فتحپوری ۲۶ رجنوری ۱۹۲۶ء کو یو پی کے ضلع فتح پور (ہسوہ) تحصیل کھا گا پرگنہ ہتگام کے ایک چھوٹے سے گاؤں ہیبت پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عاشق علی ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کی والدہ سیدہ عزیز النساء ایک گھریلو اور صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں۔ فرمان صاحب کے بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ تعلیم وتربیت کی ساری ذمہ داری فرمان صاحب کے بڑے بھائی سید شمشاد علی کے کاندھوں پر تھی، جو بسلسلہ ملازمت کانپور میں رہتے تھے۔ فرمان صاحب کی دو بہنیں تھیں۔ سیدہ خاتون، طیبہ خاتون۔ سیدہ خاتون سب سے بڑی تھیں جو بیوہ ہونے کے بعد فرمان صاحب کے ساتھ پاکستان میں آخری وقت تک ساتھ رہیں، چھوٹی بہن طیبہ خاتون تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں ہی اپنے آبائی گاؤں ہیبت پور میں مقیم رہیں اور یہیں انتقال کیا۔ فرمان صاحب کا بچپن ولڑکپن کا زمانہ اسی گاؤں ہیبت پور میں گذرا اس گاؤں سے لگ کر گنگا بہتی ہے اپنے گاؤں کا ذکر ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں کرتے ہیں؟:

''ہر چند کہ میرا آبائی گاؤں دریائے گنگا کے کنارے فتح پور اور الہ آباد کی سرحد پر نئی تہذیبی زندگی کی رو سے بہت دور واقع تھا۔ ڈاک خانہ کے علاوہ مڈل اسکول، تحصیل، دفتر، تھانہ اور ریلوے اسٹیشن گاؤں سے کم از کم چھ میل کے فاصلے پر تھے۔ پھر بھی چونکہ خاندان کے سارے بزرگ عربی، فارسی سے واقف اور پرانی تعلیم سے آراستہ زمیندار تھے، اس لئے فوجداری، مقدمہ بازی، شکار، کشتی اور لکڑی کے فن مہارت کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میرے بڑے بھائی سید شمشاد علی تنہا بسلسلہ ملازمت کانپور میں منشی اکرام اللہ اکرم کے ساتھ رہتے تھے۔ اکرام اللہ صاحب ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان کانپور کی ادبی محفلوں کے سرگرم رکن تھے۔ بہت اچھے خطاط اور شاعر ہونے کے ساتھ ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔ شاگردوں کا بھی ایک حلقہ رکھتے تھے۔ میرے بہنوئی سے ان کی قرابت داری تو دور کی تھی۔ یارانہ بہت گہرا تھا۔ جب بھی کانپور سے گاؤں آتے ادبی رسائل اور اخبارات کا ایک بنڈل اپنے ساتھ لاتے کبھی ہفتوں قیام کرتے اور

ڈاک سے ان کے پرچے آتے رہتے۔ چنانچہ ادبی رسائل مجھے پہلے پہل اپنے گھر اور گاؤں ہی میں اپنے بڑے بھائی اور منشی اکرام اللہ کی بدولت دیکھنے کو ملے اور انہیں کے ذریعہ نیاز فتح پوری کے نام سے کان آشنا ہوئے۔"(۱)

شجرۂ خاندان

فرمان صاحب کے خاندان کا شجرہ مندرجہ ذیل ہے۔

سید شاہ عالم
↓
سید غلام رسول
↓
سید احمد علی
↓
سید اشرف علی

سید حسن علی — سید رجب علی

سید اصغر علی — سید اکبر علی — سید عمر علی

سید عابد علی — سید باسط علی — سید صادق علی — سید عاشق علی

سیدہ خاتون — شمشاد علی — طیبہ خاتون — سید دلدار علی
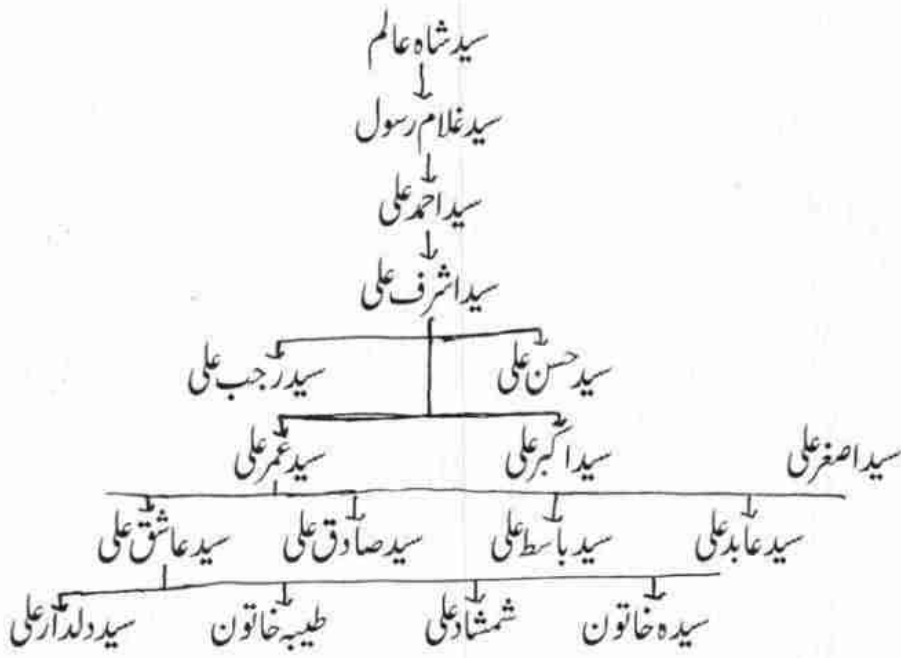
(فرمان فتح پوری)

شجرۂ خاندان کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

"خاندان کے بزرگوں سے جو کچھ میں نے سنا ہے، مختلف خاندانی شجروں اور یادداشتوں کے ذریعے جو کچھ مجھ تک پہونچا ہے، سرکاری و غیر سرکاری دستاویزوں میں مجھے جو کچھ لکھا نظر آیا اور مختلف کتابوں کے مطالعہ سے جو کچھ مجھے مل سکا اس کی روشنی میں میرا شجرۂ نسب کچھ اس طرح مرتب ہوتا ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے حسب و نسب اور خاندان کے متعلق لکھتے ہیں:

"فکر و نظر کے اعتبار سے آج کی دنیا اتنی بدلی ہوئی ہے بلکہ اتنی آگے نکل گئی ہے کہ حسب و نسب یا خاندانی سلسلے کا ذکر چھیڑنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور بہت ممکن ہے بعض کے نزدیک یہ ذکر غیر مستحسن و

۱۔ ماہنامہ نگار پاکستان۔ جون ۱۹۸۵ء ص: ۳۸

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی۔ جلد دو ۱۹۹۴ء۔ ص: ۲۷۲-۲۷۳

لایعنی قرار پائے ،لیکن چونکہ مجہول النسب یا اپنی اصل ونسل سے مفقود الخبر ہونا بھی کوئی مستحسن وممدوح بات نہیں ہے بلکہ مشرق میں ایسا ہونا ابھی تک گالی ودشنام کے برابر ہے،اس لئے اپنی سوانح کے سلسلے میں مختصراً اپنے نسب نامے یا خاندان کا ذکر غیر ضروری ولایعنی نہیں بلکہ ضروری وبامعنی معلوم ہوتا ہے۔''(۱)

فرمان صاحب کا گاؤں ہیبت پور شاہ ہیبت اللہ نے آباد کیا تھا ان کے آباء واجداد عہد مغلیہ میں بخارا سے آ کر دہلی میں قیام کیا،اس کے بعد ہیبت پور کو اپنا مسکن بنایا ان کے قیام کے بعد غلام رسول بھی ہیبت پور پہونچے۔فرمان صاحب کے پردادا سید حسن علی کے تین بیٹے تھے۔سید اکبر علی،سید عمر علی اور اصغر علی تھے فرمان صاحب کے دادا عمر علی کے چار بیٹے تھے۔سید عاشق علی،سید صادق علی،سید باسط علی اور سید عابد علی تھے۔سید صادق علی مستقل طور پر گاؤں میں رہتے تھے اور پورے خاندان کی زمینوں کے نگراں تھے۔ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں:

''دادا جی کی اولاد میں میرے والد سید عاشق علی جنہیں ہم ابا جی کہتے تھے سارے بھائی بہنوں سے بڑے تھے۔چونکہ میرے دادا کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب کہ ان کے بچے بہت کم عمر تھے اس لئے سارے خاندان کی تعلیم وتربیت،معاشی کفالت اور شادی بیاہ کی ذمہ داریاں میرے والد کے کاندھوں پر تھیں۔میرے والد بہت اچھے اردو،فارسی اور ہندی جانتے تھے۔ذوق سخن بھی رکھتے تھے۔اور فارسی نثر ونظم کے بہت سے ٹکڑے انہیں ازبر تھے ملازمت کے دن محکمہ پولیس میں گذارے تھے سب انسپکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔کمایا بھی خوب اور اُڑایا بھی خوب۔بے تحاشہ آمدنی،بے دریغ خرچ،حساب کتاب بہت جلد برابر ہو گیا۔نتیجتاً ان کی اچانک وفات سے کئی برس تک جیسا کٹھن وقت میری والدہ اور ہم پر گذرا خدا کسی اور کو نہ دکھائے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بچپن ولڑکپن کی یادیں:

فرمان صاحب کا بچپن کھیل کود اور گاؤں کے ماحول میں گذرا ہے اور وہ گاؤں کے کھیل کود سے خوب واقف تھے۔ایک دفعہ پیڑ سے گرنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''ایک دفعہ تو میں جامن کے پیڑ سے گرا اور ایک بار آم کے پیڑ سے۔آم کے پیڑ سے گرنے میں یہ

۱۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم:ص:۷۷۳

۲۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اک جہت نما صاحب قلم۔از مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر۔مطبوعہ دہلی ۲۰۰۵ء ص:۲۶،۲۷

ہوا کہ میرا دایاں ہاتھ کاندھے کے پاس سے اکھڑ گیا۔ بدن کے اکثر حصوں میں سخت چوٹ آئی تھی۔ لیکن ہاتھ کا معاملہ بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ درد بہت شدید تھا اور ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتا تھا والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے چچا کو اطلاع کرائی اور میری دیکھ بھال کے لئے بھیجا۔ چچا جان غصے میں بھرے ہوئے آئے نہ میرا حال پوچھا نہ میری حالت دیکھی دو تین ہاتھ رسید کئے اور جس ہاتھ میں چوٹ آئی تھی اسی کو پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور کہنے لگے ''میں نے منع کیا تھا کہ پیڑ پر مت چڑھنا، اب بھگتو۔'' یعنی انہوں نے مجھے تسلی دینے یا میرا حال معلوم کرنے کے بجائے میری مزید مرمت کردی۔ پھر بھی ان کا یہ عمل اتفاق سے میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوا جس ہاتھ کی ہڈی، شانے کے پاس سے اکھڑ گئی تھی یعنی جگہ سے ہاتھ کے ناقابل برداشت درد سے بہت جلد نجات مل گئی۔''(۱)

فرمان صاحب بچپن اور لڑکپن میں کشتی اور لٹھ بازی بھی کرتے تھے یہ شوق فرمان صاحب کو مڈل اسکول میں حساب کے استاد منشی چھب لال سنگھ کو ورزش اور کشتی کرتے دیکھ کر پیدا ہوئی تھی ہم جماعتوں کے ساتھ پنجہ آزمائی بھی کرتے تھے۔ فرمان صاحب ایک دنگل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک دنگل میں میرا مقابلہ انہوں نے ایک کچھڑی ذات کے ہندو جاٹ سے کرا دیا جاٹ سے پنجہ ملانے کے ساتھ ہی میں نے اندازہ کرلیا کہ وہ طاقت میں کسی طرح مجھ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے اس لئے طاقت کے بجائے داؤ پیچ ہی سے کام چل سکتا ہے لیکن داؤں لگانا بھی آسان نہ تھا ہم نے ایک دوسرے ہاتھ میں پوری قوت کے ساتھ دے رکھتے تھے اور پیشانی سے پیشانی ملا رکھی تھی۔ میری کوشش یہ تھی کہ جاٹ ذرا ڈھیلا پڑے تو میں گردن جھکا کر اس کی ٹھوڑی پر سر سے حملہ کردوں لیکن شاید وہ بھی اس تاک میں تھا اس لئے ایسا کرنے کا موقع نہ ملا۔ ہم دونوں پندرہ بیس منٹ تک اتنی قوت اور شدت سے ایک دوسرے کی پیشانی رگڑتے رہے کہ خون بہہ نکلا آخر کار ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ہمارا مقابلہ برابر قرار دیا گیا۔ گویا جان بچی لاکھوں پائے۔''(۲)

فرمان صاحب بچپن اور لڑکپن کے حوالے سے ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں اس وقت ان کی عمر قریب سات سال کی تھی اور ان کے والد حیات تھے فرمان صاحب لکھتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۔۱۹۹۲ء ص:۱۲

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۔۱۹۹۲ء ص:۱۴، ۱۵

''ایک دن پیٹ میں بہت زور کا درد اٹھا اور بڑھتا ہی چلا گیا، میرے ایک چچا، طبیب بھی تھے۔ انہوں نے بدل بدل کر کئی دوائیں دیں لیکن فائدہ نہ ہوا۔ باہر سے طبیب بلائے گئے، ان کی دوائیں بھی کارگر ثابت نہ ہوئیں بے چینی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ میرے بڑے بھائی، بڑی بہن، ابا جی اور امی باری باری سے مجھے گود میں لے کر اپنے سینے سے رات دن لپٹائے رہتے۔ ذرا دیر کو نیند سی آجاتی لیکن آنکھ کھلتے ہی تڑپنے لگتا۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کس چیز کا اور کس قسم کا درد ہے آخر کار طبیبوں نے جواب دے دیا۔ میں روز بروز نڈھال ہوتا گیا اور ہفتے کے اندر میری حالت یہ ہوگئی کہ لوگ میری زندگی سے بالکل مایوس ہوگئے۔

میری مشکل آسان کرنے کے لئے اللہ سے وہ دعائیں مانگی جانے لگی، جو زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا بیمار کے لئے بہت سادہ اور ہلکی پھلکی غذا کبھی کبھی دی جاتی تھی حالانکہ میں مختلف قسم کے کھانے اور پھل وغیرہ رو رو کر مانگا کرتا تھا لیکن اس ڈر سے کہ کہیں درد اور نہ بڑھ جائے مجھے پتلی دال اور دلیا کے سوا کوئی چیز نہ دی جاتی تھی۔

جب میرے جینے کی آس نہ رہی تو آخر میں طبیبوں اور عزیزوں نے اجازت دے دی کہ جو چیز کھانے کے لئے مانگیں دے دی جائے یعنی موت سے پہلے ہر قسم کی خواہش پوری کردی جائے مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا کھاؤ گے۔ میں نے کہا کھیرا۔ کھیرا کا نام یوں لیا کہ کھیرے کی فصل تھی اور جب دوسرے بچے کھیرا کھاتے نظر آتے تو مجھے بڑی لالچ آتی تھی اور اندر سے کھیرا کھانے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہوتی تھی میری آخری خواہش کا لحاظ رکھ کر مجھے ہرے کچن تازہ اور ملائم کھیرے کی چند قاشیں دے دی گئیں۔ میں نے جیسے ہی کھایا مجھے ایک طرح کا سکون محسوس ہوا میں نے مزید کھیرا طلب کیا، میرے سامنے بہت سے کھیرے کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔ خدا کا کرنا دیکھو کہ جیسے جیسے میں کھیرے کھاتا گیا مجھے افاقہ ہوتا گیا، تھوڑی دیر میں میرے پیٹ کا درد غائب ہوگیا اور سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔'' (۱)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر فرمان صاحب ناظرہ قرآن اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مصور نامہ، کریما، گلستاں گھر پر والد صاحب سے پڑھا اور چچی سے ناظرہ قرآن شریف اردو پڑھے اور قرآن پاک کے کچھ پارے بھی حفظ کئے

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی۔ ۱۹۹۲ء ص: ۱۳

تھے اس کے بعد رسمی تعلیم کے لئے والد کی وفات کے بعد ۱۹۳۳ء میں سرکاری ابتدائی مدرسے میں داخل ہوئے۔ ورنا کیولر مڈل کا امتحان فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا اور فتح پور ڈسٹرکٹ بورڈ میں اوّل آئے اور وظیفہ حاصل کیا۔

۱۹۴۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور کی انگریزی شاخ مسلم ہائی اسکول سے ہائی اسکول اول درجے سے الہ آباد بورڈ سے پاس کیا۔ اور دو مضامین میں امتیاز حاصل کر کے یو پی میں ساتویں پوزیشن کے ساتھ سرکاری وظیفہ کے مستحق قرار پائے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر فرمان صاحب حلیم مسلم انٹر کالج کانپور میں داخلہ لیا مگر معاشی پریشانیوں کی وجہ سے چند ماہ بعد کالج چھوڑ دیا اور فتح پور آ کر مسلم ہائی اسکول میں پڑھانے لگے دوران تدریس ۱۹۴۸ء میں الہ آباد بورڈ سے سکنڈ ڈویژن میں ایف اے کیا۔ ۱۹۵۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے سکنڈ ڈویژن میں بی اے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں ایس ایم لاء کالج کراچی سے سکنڈ ڈویژن میں ایل ایل بی کیا۔

۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ کالج کراچی سے سکنڈ ڈویژن میں بی ٹی کیا۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں فرسٹ کلاس اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ ایم اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے ''اردو کی منظوم داستانوں'' پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور یہ مقالہ انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' نامی کتاب پر کراچی یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔ یہ کتاب پہلے ۱۹۷۲ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے چھپی بعد ازاں ۱۹۹۸ء میں انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی۔

فتح پور کے قیام میں مدرسہ اسلامیہ کے مولوی محمد اسحاق اور مولوی سید عبدالوحید سے دو سال نجی طور پر عربی و فارسی پڑھی۔ آبائی گاؤں کے پنڈت مہابیر پرشاد سے ہندی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ تلسی داس کی رام چرت مانس کا خصوصی درس لیا۔

ازدواجی زندگی

فرمان صاحب کی شادی خالہ زاد بہن سلمیٰ بیگم بنت مصاحب علی کے ساتھ ۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی۔ فرمان صاحب کے بچپن کے دوست شباہت علی خاں نے اپنے ایک مضمون میں بارات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ شادی کا دعوت نامہ منظوم و مطبوعہ تھا اور فرمان صاحب کے بڑے بھائی

شمشاد علی تنہا کی طرف سے تقسیم کام کیا گیا تھا۔ بارات ہیبت پور سے ایرایاں کے لئے روانہ ہوئی۔ شباہت علی خاں رقم طراز ہیں:

''سلمٰی (بیگم فرمان) نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ ہمارے ہاں رسم ہے کہ شادی کے موقع پر لوگ لڑکے کی طرف سے مدعوئین سے ہنسی مذاق کرتے ہیں اور ان کو تفریحاً زیر کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ لڑکی والوں کی طرف سے ایک قسم کا مذاق کا آغاز ہوا اور ہمارے چہروں پر پسی ہوئی ہلدی یعنی ایک قسم کا رنگین ابٹن لگانا شروع کیا۔ ہم سب کو یہ بات ناگوار تھی، مگر پھر بھی جب تک یہ مذاق کمسنوں تک محدود رہا ہم لوگ ہنسی مذاق میں ٹالتے رہے لیکن جب ایک صاحب نے ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی داڑھی اور ماتھے کو اپنا نشانہ بنایا تو بات بڑھ گئی۔ گرما گرمی شروع ہوئی اور مار پیٹ کی نوبت آ گئی۔ میں فطری طور سے بیچ بچاؤ میں لگا ہوا تھا کہ ایک صاحب نے میرے سر پر ایک اسٹک جڑ دی میں خون آلود ہو گیا۔ خون دیکھ کر فرمان صاحب کے بھائیوں اور عزیزوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور انہوں نے لڑکی والوں کی بری طرح مرمت کر دی۔ بارات لے کر ہم لوگ دولہن کے ساتھ واپس ہوئے۔

''میری پیشانی پر بائیں طرف ایک چوٹ کا نشان اب بھی موجود ہے اور اس کی تصویر میرے پاس محفوظ ہے میں اپنی بھابھی سلمٰی سے اکثر مذاق میں کہتا ہوں کہ آپ کی شادی میں نے اپنا خون دے کر کرائی تھی۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی تصنیف ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' (مطبوعہ ۱۹۷۲ء لاہور) کا انتساب ڈاکٹر ہلتر ودخاں اور شباہت علی خاں کے نام کیا ہے جو اس وقت جرمنی میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کی شادی ان کی اپنی پسند کی شادی ہے۔ یہ مصروف ہونے کے بعد بھی ایک اچھے خاوند ہیں۔ بیگم فرمان نے خود کہا۔

''فرمان صاحب اگرچہ دن رات، صبح و شام مطالعے میں مصروف رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بچوں کی نگہداشت اور گھریلو معاملات میں بھی خاص دلچسپی لیتے ہیں وہ اپنے بچوں کے لئے صرف ایک باپ ہی نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرمان صاحب سے مجھے وہ سب کچھ ملا ہے جو

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق۔ مطبوعہ کتاب کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول، ص: ۵۲، ۵۳

ایک اچھے شوہر سے توقع کی جاسکتی ہے۔''(۱)

فکری ارتقاء

ڈاکٹر فرمان صاحب بنیادی طور پر ایک روشن خیال مفکر ہیں۔ان کا قلم ہمیشہ ادب میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے یہ ادب کے ان چند دانشوروں میں سے ہیں جو ادب مذہب اور معاشرہ میں روشن خیالی کے حامی ہیں اگر چہ ترقی پسند تحریک سے عملاً تو وابستہ رہے مگر فکری طور پر یقیناً اس سے متاثر ہوتے ہیں وہ ہمیشہ شواہد، معلومات اور کوائف کی روشنی میں بات کرتے ہیں۔

فرمان کے استاد

ڈاکٹر فرمان صاحب کو بچپن کے ابتدائی تعلیم کے لئے کسی مکتب مدرسہ میں نہیں بھیجا گیا بلکہ ان کی غیر رسمی تعلیمی ان کے والد کے ہاتھوں ہوئی اس وقت فرمان صاحب کی عمر قریب ساتھ سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔اب گھر کے حالات درہم برہم ہوگئے تھے۔اب پرائمری اور مڈل اسکول کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پرائمری درجات کے استادوں میں ہیڈ ماسٹر مولوی عبدالرشید حبیب اللہ،مولوی عبدالمجید، شیو منگل سنگھ،مڈل میں منشی دبی دیال اور چھب لال سنگھ تھے۔پنڈت مہابیر پرشاد سے رامائن پڑھی تھی۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد حلیم مسلم انٹر کالج میں ایک سینئر دوست رحمت اللہ کے توسط سے داخلہ لیا وہاں پروفیسر طاہر، اویس احمد ادیب، پروفیسر فضل الرحمٰن جیسے قابل استاد سے تعلیم حاصل کرنے اور ان کے قریب رہنے کا موقع ملا۔مگر وقت کی ستم ظریفیوں اور تنگ دستیوں کے سبب جلد ہی کالج جانا چھوڑ دیا اور فتح پور آ کر مسلم ہائی اسکول میں بطور استاد پڑھانے لگے اور اپنا تعلیم بھی جاری رکھا اور انٹر سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

بی اے میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں داخلہ لیا مگر جلد ہی واپس آگئے معاشی پریشانی انہیں گھیرے رہی۔آخر کار اپنے تعلیمی شوق کو پورا کرنے کے لئے آگرہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی اے کرلیا۔اس کے بعد کراچی چلے گئے اور وہاں اردو کالج کے شعبۂ انگریزی میں داخلہ لیا انگریزی کے استادوں میں جلیل صاحب،

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔مرتبہ خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی۔۱۹۹۱ء ص:۴۳

واسطی صاحب اور افتخار صاحب وغیرہ سے انگریزی پڑھی۔ ایس ایم لاء کالج کراچی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی لاء کے استادوں میں حسن علی، منظور حسین، طفیل علی، عبدالرحمٰن وغیرہ تھے۔

بی ٹی کرتے وقت ان کے استادوں میں پرنسپل جناب بختیاری صاحب وغیرہ ایم اے اردو کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید شاہ علی، قدرت اللہ فاطمی، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر، پروفیسر عبدالسلام وغیرہ تھے۔

ذریعۂ معاش

۱۹۴۶ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے فوراً بعد مدرسہ اسلامیہ (مسلم ہائی اسکول فتح پور) میں چالیس روپے ماہانہ پر انگریزی اور ریاضی کے استاد ہو گئے۔

۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء تک آڈٹ ڈپارٹمنٹ کے تحت ڈویژنل اکاؤنٹنٹ اے جی پی آر سے منسلک رہے۔

۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء تک سررشتہ تعلیم کراچی کے تحت گورنمنٹ ہائی اسکول کوتوال بلڈنگ میں ریاضی اور انگریزی کے معلم رہے۔

اگست ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر وصدر شعبۂ کے منصب تک پہونچے۔

۱۹۸۵ء میں وفاقی حکومت نے اردو ڈکشنری بورڈ کے لئے ان کی خدمات مستعار لیں چنانچہ وہ ایک سال بیک وقت شعبۂ اردو کراچی اور اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ رہے۔

۱۹۸۵ء سے تقریباً دس سال اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے چیف ایڈیٹر اور سکریٹری کی حیثیت سے وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ رہے۔ ''اردو لغت تاریخی اصول'' پر ترقی اردو بورڈ کراچی سے ہزار ہزار صفحات کی اکیس (۲۱) جلدیں ان کے دور میں شائع ہوگئیں۔ بعد ازاں سندھ پبلک سروس کمیشن سے منسلک ہوگئے وہاں سے سبکدوش ہوئے تو اردو ڈکشنری بورڈ کے چیئرمین بنا دیئے گئے۔

سیاحت

امریکہ، کناڈا، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، فرانس، سعودی عرب، چین، یو اے ای اور ہندوستان کی سیاحت کی۔

اعزازات واعترافات

۱۹۸۵ء میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے غیر معمولی علمی وادبی، خدمات کے اعتراف میں ''ستارۂ امتیاز'' ملا۔

پاکستانی جامعات کے پہلے پروفیسر ہیں جو اردو زبان وادب سے متعلق بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں رکھنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے پانچ بار نقد انعامات کی صورت میں تحقیقی کاموں کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

دو بار رائٹرس گلڈ آف پاکستان کی طرف سے داؤد ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ ایک درجن سے زائد ریسرچ اسکالران کی نگرانی میں تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے چکے ہیں۔

مختلف جامعات کے متعدد ریسرچ اسکالر آج بھی ان کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر حکومت پاکستان نے علامہ اقبال پر ایک ایسی مستند اور جامع کتاب لکھنے پر مامور کیا جس میں علامہ کی زندگی اور فکر وفن کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو۔

سات سو صفحات کی یہ کتاب ''اقبال سب کے لئے'' کے نام سے حکومت پاکستان کی جانب سے شائع کی گئی اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۸۱ء میں دوبارہ ۲۰۰۴ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا۔

۱۹۷۶ء میں قائد اعظم کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر بھی حکومت پاکستان نے موضوع دے کر ایک کتاب ''ہندی اردو تنازعہ'' کے عنوان سے انگریزی اور اردو میں لکھوائی جو کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

اردو زبان وادب میں بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد رکھنے کے سبب کراچی یونیورسٹی کے چانسلر اور گورنر سندھ نے طلائی تمغہ دیا۔

معروف فلاحی ادارے ''تنظیم برادران پاکستان'' کی جانب سے ۱۹۸۷ء میں ادبی ایوارڈ ملا۔

۱۹۸۸ء میں کراچی کے شہریوں کی طرف سے وی آئی پی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۱۹۸۹ء میں ''یونی کیرین''یونیورسٹی آف کراچی کی جانب سے نشان فضیلت کی سند دی گئی۔

۱۹۹۰ء میں جشن فیض کی طرف سے فیض احمد فیض ایوارڈ دیا گیا۔

۱۹۹۱ء میں فرسٹ کراچی سٹیزن ایوارڈ عطا کیا گیا۔

۱۹۹۲ء میں نشان سپاس کے عنوان سے ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے خدمات کا اعتراف کیا۔

۱۹۹۳ء میں برصغیر میں نعت گوئی پر پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب کے مصنف ہونے کی حیثیت سے نعت اکیڈمی کی ایوارڈ دیا گیا۔

۱۹۹۴ء میں کنیڈین اکیڈمی آف اردو لٹریچر کی جانب سے ٹورنٹو میں انٹرنیشنل اردو ایوارڈ دینے کا اعلان ہوا اور اسی سال امریکہ و کناڈا میں ''جشن فرمان'' کا اہتمام کیا گیا۔ اس جشن کے اجلاس نیویارک، واشنگٹن، سینٹ لوئس اور لینڈو، شکاگو، نیوجرسی، ٹورنٹو وغیرہ میں منعقد ہوئے اور اس میں امریکہ وہ کناڈا کے علاوہ برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کے متعدد اسکالروں نے شرکت کی اردو کے معتبر اہل قلم نے مقالے لکھے جنہیں چار چار سوصفحات کی تین جلدوں میں امراؤ طارق نے شائع کرایا۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری حیات خدمات'' کو فتح پور ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی نے شائع کرایا۔

۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۱ء تک سندھ پبلک سروس کمیشن کے رکن رہے۔ اس کے بعد اردو ڈکشنری بورڈ کے چیئرمین ہوئے اور اب تک مسلسل ادبی خدمات میں سرگرم ہیں۔

ہندوستان سے ہجرت

ڈاکٹر فرمان صاحب ہندوستان چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے قیام پاکستان کے بعد انہیں قانون کا سہارا لے کر اسکول سے باہر کردیا گیا اس لئے کہ وہ آزادی سے پہلے مسلم لیگ کے فعال کارکن تھے۔ فرمان صاحب نے اپنے خودنوشت میں خود لکھتے ہیں:

''میں نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں بہت فعال کردار ادا کیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے سارے رہنما مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ان کا رویہ میرے ساتھ معاندانہ ہوگیا۔ پہلے مجھے قانون گوئی کے ٹریننگ کالج ہردوئی سے نکلوایا گیا پھر مجھے اسکول سے نکلوانے کی مہم چلائی گئی۔ اسد اللہ کاظمی صاحب کے بعد ایجوکیشنل سرکل انسپکٹر ہوکر فی لال صاحب آگئے تھے۔ وہ میرے بعض

مشاغل کی بنا پر میرے درپے ہو گئے اور اسکول کی انتظامیہ کو مجبور کیا کہ وہ سبکدوش کر دے پھر بھی انتظامیہ کے ارکان مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ مجھے بچانے کے لئے کسی نہ کسی بہانے سے انسپکٹر کے احکامات کو ٹال دیا کرتے تھے۔ آخر کار میں نے خود سوچا کہ اب یہاں میرا رہنا مناسب نہیں ہے اسکول کے بزرگ دوستوں اور منتظمین نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ سوال پیدا ہوا کہاں جاؤں۔''(۱)

آخر کار ڈاکٹر فرمان صاحب مجبوراً پاکستان کا رُخ کئے بڑی تگ و دو کے بعد جون ۱۹۵۰ء کو پاکستان کی سرزمین پر اُترے اور وہاں شروع کے چند سال بڑی مشکل سختیوں میں گذارنے کے بعد آہستہ آہستہ وقت سازگار ہو گیا۔ بچپن ولڑکپن اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں ہندوستان سے ہجرت کر پاکستان چلے گئے۔ اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

افتخار احمد صاحب کراچی، فرمان صاحب کے پاکستان جانے کے متعلق لکھتے ہیں؟:

''تحریک پاکستان میں نمایاں کارکردگی کی بنا پر ان کے حریفوں نے بڑے پیمانہ پر ان کی مخالفت کی یہاں تک کہ آزادی کے فوراً بعد ان کے خلاف حکومت کی طرف سے انتقامی کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ آخر کار وہ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر ملیر کے علاقہ میں قیام کیا اور ایک درسگاہ کی بنیاد ڈالی اور انتہائی سخت اور دشوار حالات میں زندگی کا آغاز کیا لیکن علم و ادب سے وابستگی بہر حال برقرار رہی اور مسلسل معیاری ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔

پاکستان آنے کے بعد ان کے ابتدائی کارناموں میں سے سب سے بڑا کارنامہ ایک عالیشان انڈو پاک مشاعرے کا انعقاد ہے جس کی صدارت حضرت علامہ نیاز فتح پوری نے فرمائی۔ اس بے سروسامانی کے دور میں اتنے بڑے مشاعرہ کا انعقاد یقیناً ناممکن تھا لیکن ناممکن کو ممکن بنانا ہی فرمان صاحب کے مزاج کا حصہ ہے۔''(۲)

خان ظفر افغانی سے ڈاکٹر فرمان صاحب نے ایک انٹرویو میں یہ بتایا:

''ہم نے الہ آباد بورڈ سے ۱۹۴۸ء میں پرائیویٹ سیکنڈ ڈویژن میں انٹر پاس کر لیا اسی زمانے میں میں اور شباہت خلیج فارس چلے گئے۔ برٹش گورنمنٹ کے ملازم ہو کر برٹش قونصل خانے میں انگریزی سے فارسی

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک جہت نما صاحب قلم۔ مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ دہلی ۲۰۰۵ء ص:۷۶،۷۷)

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء ص:۴۴۸،۴۴۹)

اور فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے۔گلف جانے سے پہلے ہم نے نائب تحصیلداری کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ہم گلف میں تھے تو اماں نے خط لکھنے شروع کر دیئے کہ تم یہاں واپس آ جاؤ۔ پھر انہوں نے کہا کہ بہو کی گود بھری جانے والی ہے۔ بچہ ہونے والا ہے اب میری مجبوری دیکھیں کہ میں کیا کروں۔نوکری چھوڑنی پڑے گی۔شباہت علی خان نے مجھے سمجھایا کہ نہ جاؤ لیکن وہ زمانہ ہی اور تھا سوچتا تھا کہ بغیر ماں کے دولت کس کام کی۔ بہرحال ہم نوکری چھوڑ کر واپس آ گئے۔ یہاں آ کر نوکری کی پریشانی تھی۔ہم نائب تحصیل داری کا امتحان پاس کر کے گئے تھے اور اس میں پانچویں پوزیشن لی تھی۔ میں نے تحصیل داری کی ٹریننگ لی۔سی آئی ڈی نے رپورٹ دی کہ یہ پکا مسلم لیگی ہے۔لہٰذا ہمیں ڈس کوالیفائی کر دیا گیا۔اب میں کیا کروں۔ ۱۹۴۸ء میں میرا بیٹا پیدا ہوا۔اماں بہت خوش تھیں۔میں نے فتح پور میں اسی مسلم ہائی اسکول میں ملازمت کر لی اور ٹیچر ہو گیا۔یہاں وہی لالچ تھا کہ ٹیچر ہو کر بی اے کا امتحان دے دوں گا۔سو یہی کیا۔اور کراچی آ گیا۔''(۱)

فرمان صاحب پاکستان جاتے ہی ۱۹۵۰ء میں ایک انجمن ''انجمن تعلیمات ملیہ'' کی بھی بنیاد ڈالی اور جامعہ ملیہ کی پیاری عمارت میں ایک اسکول قائم کیا اور خود بھی اس میں پڑھاتے رہے لیکن یہ اسکول بعد میں سید ہاشم رضا صاحب کی معرفت ڈاکٹر محمود حسین (مرحوم) کے حوالے کر دیا۔

رسالوں میں تصانیف کی اشاعت

۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی دہائی میں ان کی بعض نظمیں اور غزلیں دہلی کے مشہور اخبار ''وحدت'' اور ''الامان'' میں شائع ہوئی تھیں۔

نثر کی طرف وہ پاکستان جانے کے بعد متوجہ ہوئے لیکن ابتدائی کئی برسوں تک وہ شاعری کو ساتھ لے کر چلتے رہے اور مشاعروں سے گہری دلچسپی لیتے رہے، چنانچہ انہوں نے ۸ر مارچ ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ایک بے مثال یادگار مشاعرہ منعقد کرایا۔اس مشاعرے کی صدارت علامہ نیاز فتح پوری نے کی جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، اثر لکھنوی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش جیسے بڑے شاعر اس میں شریک ہوئے۔

تحقیق کے حوالے سے ان کا پہلا قابل قدر مضمون اکتوبر ۱۹۵۱ء کے ''نگار'' (لکھنؤ) میں ''زبان اور

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ص: ۶۹۰، ۶۹۱

رسم الخط" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ''غالب کے کلام میں استفہام نگار'' (لکھنؤ) ہی میں اکتوبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں چھپا، یہ دونوں مضامین ایسے مقبول ہوئے اور بزرگ ادیبوں نے ان کی اتنی داد دی کہ ڈاکٹر صاحب پوری طرح نثر کی طرف متوجہ ہوگئے اور شاعری کو ثانوی حیثیت دے دی بلکہ نظر انداز کر دیا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ان کے بیشتر مقالات ''ادب لطیف'' لاہور ''نگار'' لکھنؤ اور ''صحیفہ'' لاہور میں چھپے۔

اولاد

فرمان صاحب کے چھ بچے ہیں۔ سید ابرار علی سب سے بڑے ہیں۔ شمیم سلطانہ نجمہ فرمان، وسیم فرمان اور عظمیٰ فرمان بیٹیاں ہیں۔ نجمہ سے چھوٹے ان کے بیٹے سید ابصار علی ہیں۔ بیگم فرمان کہتی ہیں:

''فرمان صاحب کا علمی، ادبی اور سماجی کاموں سے جو وقت بچتا ہے وہ اکثر دعوتوں میں گذرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ گھر کے معاملات اور بچوں کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے مجھ سے زیادہ ان سے محبت کرتے ہیں۔

ہمارے بچوں کو تو خیر ان سے محبت کرنا ہی چاہئے حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر بچے کے پسندیدہ شخص ہیں۔ وہ بچوں کو دلچسپ کہانیاں، لطائف اور اشعار خوب سناتے ہیں۔ جب وہ بچوں کے ساتھ بیٹھتے ہوں تو بڑے بے تکلف ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی بچے ہیں۔''(۱)

شاگرد واحباب

ڈاکٹر معین الدین عقیل استاد شعبۂ اردو جامعہ کراچی ڈاکٹر فرمان صاحب کے شاگرد ہیں اور انہیں کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر فرمان کے ساتھ کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ فرمان صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کو بحیثیت منتظم یا بطور صدر شعبہ تقریباً ڈیڑھ سال دیکھا اور ان کے ماتحت کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے دور میں شعبہ انتظامی لحاظ سے بہت با قاعدہ رہا، تمام معاملات شعبہ اردو روز کے روز اور خوش اسلوبی سے انجام پائے۔ ڈاکٹر صاحب شعبہ میں تمام اساتذہ سے پہلے پہونچتے اور بالعموم سب کے

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کتاب نما خصوصی شمارہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۹۲ء ص: ۴۲

بعد واپس گھر جاتے۔ اس طرح سارا وقت شعبہ یا یونیورسٹی میں موجود رہتے۔"(۱)

ڈاکٹر معین الدین عقیل ڈاکٹر صاحب کی معلّمی کے متعلق ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کا طریق تدریس نہایت شگفتہ اور معلومات افزاء تھا۔ خشک سے خشک موضوع جیسے عربی فارسی، قواعد بھی اگر وہ پڑھاتے تو نہایت پر بہار اور شگفتہ انداز میں پڑھاتے تھے کہ ہر بات طالب علموں کے ذہن نشین ہو جاتی تھی درمیان میں پرلطف حکایات اور لطائف بھی درس کا حصہ بنتے رہتے تھے۔ اگر تنقید جیسے موضوع پر اظہار خیال یا لیکچر ہوتا تو بھی یہی انداز گفتگو رہتا۔ کسی شاعر کو موضوع بنایا جاتا تو اسکے اور دیگر شعراء کے اشعار کو بکثرت بطور مثال بیان کرتے رہتے۔ اپنے ہر لیکچر میں ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں کو بھی ساتھ ساتھ لے کر آگے بڑھتے تاکہ ہر طالب علم لیکچر کو ذہن نشین کرتا رہے اور اس کا ذہن موضوع سے خود بخود مطابقت پیدا کرتا رہتا۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنی خودنوشت میں پرائمری درجات کے ساتھیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں بھگوتی پرشاد، مہاویر، ہارون احمد، سید زاہد علی، ضیاء الحق، سید فرمان علی، ہارون احمد جو فرمان صاحب کے اچھے دوستوں میں سے ہیں جو اسلام آباد میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے سے ریٹائرڈ ہیں کالج کے دوستوں میں ذاکر علی، محمد صدیق اور مسعود اختر کا ذکر کیا ہے۔

کراچی میں بی ٹی کرتے وقت دبیر احمد، محمود الحسن سید اعجاز حسین، مقبول حسین کاظمی، سہیل احمد، عبدالحمید، حمیدہ فخر آمنہ، مصطفےٰ شکیلہ یعقوب وغیرہ تھے جن کا ذکر انہوں نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ ایم اے سال اول اور دوئم کے ساتھیوں میں مشفق خواجہ، فرید جاوید اور حسن عابد وغیرہ تھے۔

ایک واقعہ جلیبی کا

امراؤ طارق پاکستان کے افسانہ نگار اور ڈاکٹر فرمان صاحب کے اہم شاگرد اور معاون بھی ہیں ڈاکٹر صاحب کو جلیبی بہت پسند ہے جلیبی سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"ایک دن گھومتے گھومتے اور کھوجتے کھوجتے صدر پہونچ گئے ڈاکٹر صاحب جوہری بازار کے قریب

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلدی اول۔ ص:۲۹۹

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۴۱

کارروک دی ہم دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور ڈاکٹر صاحب فٹ پاتھ پر رُک گئے۔ سامنے ہی گرم گرم جلیبیاں تلی جارہی تھیں ڈاکٹر صاحب نے جلیبیاں خریدیں اور ہم دونوں قریب کے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ امراؤ بھئی اس کی جلیبی کا جواب نہیں۔ جب بھی جلیبی کھانا ہو، اس سے جلیبی خریدنا۔(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جلیبی بہت پسند ہے اور ڈاکٹر صاحب جلیبی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ امراؤ طارق ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اس طرح گولیمار پر گاڑی کھڑی کردی ایک دوکان میں گھس گئے بیٹھنے کی معقول جگہ تھی دیکھتے ہی جلیبیوں کا آرڈر دے دیا اور میری طرف دیکھ کر مجھے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت ہے جب بھی کسی بات پر زور دینا ہوتا ہے تو پہلے امراؤ کر کے مخاطب کرنا کبھی نہیں بھولتے۔''

''امراؤ...... جب بھی جلیبی کھانے کا خیال آئے ادھر چلے آنا اس کی جلیبی عمدہ ہوتی ہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ نے تو جوہری بازار کی جلیبیوں کی تعریف کی تھی۔''

ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب بولے ''گولیمار میں جوہری بازار کی جلیبیاں کیسے ملیں گی اور پھر جلیبیاں تو عموماً اچھی ہی ہوتی ہیں۔ سب سے اہم بات بیٹھنے کی عمدہ جگہ ہونی چاہئے۔ جلیبی تو آرام سے بیٹھ کر کھانے کی چیز ہے۔''(۲)

صدیقہ ارمان جو فرمان صاحب کی شاگردہ ہیں یونیورسٹی کا ایک واقعہ بیان کرتی ہیں:

''ایک مرتبہ کوری ڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہم لوگ گپ شپ میں مشغول تھیں کہ اچانک فرمان صاحب کا شگفتہ سا جملہ سماعت کو محظوظ کر گیا۔ ''آج جمعرات نہیں اس لئے کچھ نہیں ملے گا۔''(۳)

صدیقہ ارمان ایک دوسری جگہ ڈاکٹر فرمان صاحب کی صفت و شخصیت کے متعلق لکھتی ہیں:

''ایک اور صفت بھی ڈاکٹر صاحب کی قابل تحسین ہے کہ کسی کو نقصان نہیں پہونچاتے اگر اس کا اندیشہ ہو تو اصولوں کی قربانی کو ترجیح دیتے ہیں انسان اصولوں کے لئے نہیں، ان کا وطیرہ ہے۔''(۴)

ڈاکٹر احسان الحق اختر فرمان صاحب کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی ہے فرمان صاحب کے متعلق کہتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص:۱۱۳

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص:۱۱۴

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۷۸

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۷۹

''ڈاکٹر صاحب جب کچھ سمجھاتے تو بڑی بے تکلفی سے کام لیتے جس سے ڈر اور خوف کے بجائے محبت اور بے تکلفی بڑھتی وہ میرے سوالوں سے بیحد خوش ہوتے لیکن وہ تنظیم کا خاص خیال رکھتے کیونکہ انہیں ادبی بدتمیزی پسند نہیں ہے۔ آپ بے شک ان کے قریبی دوست کیوں نہ ہو، اگر آپ نے آداب کا خیال نہ رکھا تو وہ آپ کو ڈانٹ دیں گے۔''(۱)

احباب

ڈاکٹر فرمان صاحب کے احباب کی فہرست بہت لمبی ہے چند احباب کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں مرزا ابن حنیف سے فرمان صاحب کی کافی پرانے تعلقات ہیں مرزا ابن حنیف کہتے ہیں:

''میں کسی شخص سے زیادہ تعلقات نہیں بڑھایا کرتا لیکن ڈاکٹر فرمان صاحب آدمی ہی ایسے تھے جس نے مجھ پر پہلی ملاقات میں ہی جادو کر دیا۔ آہستہ آہستہ یہ تعلقات مزید بڑھے اور میں جب بھی ان سے ملا تو اسی خواہش سے کہ ان سے کچھ سیکھوں کیونکہ وہ علم کے جن ہیں۔''(۲)

مرزا ابن حنیف مزید لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی گفتگو چاہے علمی ہو یا ادبی یا ہنسی مذاق کی اس میں ایک عالمانہ شان موجود ہوتی ہے ان کی باتوں میں اتنی شگفتگی ہوتی ہے کہ ان کی گفتگو ایک جاہل، عالم کم پڑھا لکھا طالب علم کسی پر گراں نہیں گذرتی۔ وہ اپنی عام گفتگو میں بھی اشعار محاورات وغیرہ استعمال کرتے رہتے ہیں گویا ان کی علمی اور ادبی مزاحیہ گفتگو میں ایک رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔''(۳)

۲۰۰۶ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے ڈاکٹر شباہت علی خاں کی مرتب کی ہوئی کتاب ''ندائے دوست'' شائع کی ہے۔ یہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مکتوبات بنام شباہت علی خاں کا مجموعہ ہے۔ امراؤ طارق نے اس مجموعہ کے تعارف میں لکھا:

''ان خطوط میں شہر فتح پور اور الہ آباد کانپور کے درمیان بسے ہوئے مواضعات کی ہی

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۴۶
۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی علم کے خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۴۶
۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ کتاب نما خصوصی شمارہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۴۶

نہیں، پوری یوپی تہذیب کے گنگا جمنی رنگ بکھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''(۱)

شباہت علی خاں نے دیباچہ میں لکھا ہے:

''یہ خطوط تمام تر ادبی و علمی نوعیت کے حامل ہیں پھر بھی ان خطوط میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات، پاکستان کے لئے ہجرت، تعلیم و تربیت، زندگی کی تمام تر جدو جہد و علمی و ادبی کاموں کی تفصیل جہاں تہاں بیان کر دی ہیں۔''(۲)

ایک خط میں ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے دیرینہ دوست شباہت خاں کو لکھتے ہیں:

''.........میاں ہم تم نہ ایک باپ کے بیٹے ہیں نہ ایک ماں کے۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ کہ ہم دونوں نے جس طرح ایک دوسرے سے پیار کیا ہے اس کی مثال حقیقی بھائیوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ تمہارے بھی بھائی بہن ہیں، میرے بھی، لیکن ہر غم اور ہر خوشی میں جتنا تم یاد آئے اور جتنا تم شریک رہے، کوئی نہیں رہا۔''(۳)

شباہت خاں کے نام ایک مکتوب میں ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

''تمہاری صحبت نے ایک خاص خول سے نکلنے اور آگے بڑھنے کے لئے راہ ہموار کی اس لئے کم از کم میرے لکھنے پڑھنے کے حد تک تم میرے سب سے بڑے محسن ہو، آج مجھے معاشرے میں جو چھوٹی موٹی عزت حاصل ہے۔ وہ تمہارے اس احسان کی بخشش ہے۔ ورنہ تمہیں پتہ ہے کہ فتح پور کی زندگی تک میں صرف شاعر تھا، کوئی معقول کتاب بھی نہ پڑھی تھی۔ باقاعدہ مطالعہ تمہارے ایران جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان کتابوں کے ذریعے جو تم مجھے برابر بھیجتے رہے گویا میں اردو کا ادیب تمہاری کتابوں کے مطالعہ کے ذریعہ بنا ہوں۔''(۴)

دور حاضر کے ممتاز شاعر سرشار صدیق ڈاکٹر فرمان پر بعنوان ''جنم جنم کا ساتھی'' ایک نظم لکھی ہے جن سے فرمان صاحب اور سرشار صدیق کی آپسی دوستانہ اور بچپن کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ندائے دوست مرتب شباہت علی خاں مطبوعہ کراچی پاکستان ۲۰۰۶ء ص:۳
۲۔ ندائے دوست مرتب شباہت علی خاں مطبوعہ کراچی پاکستان ۲۰۰۶ء دیباچہ ص:۶
۳۔ ندائے دوست مرتب شباہت علی خاں مطبوعہ کراچی پاکستان ۲۰۰۶ء ص:۱۳
۴۔ ندائے دوست مرتب شباہت علی خاں مطبوعہ کراچی پاکستان ۲۰۰۶ء ص:۵۶

اک ٹوٹے پھوٹے مصرعے کہنے والا تھا
اک کچی پکی سطریں لکھنے والا تھا
دونوں عمر کی پگڈنڈی کے
ایسے نازک موڑ پہ تھے
جہاں لڑکپن جاتے جاتے
عمر رواں کا اُجلا دامن
زیست کے سادہ ورق کی صورت
عہد شباب کے
نادیدہ جذبوں کو سونپ کے
خواب کی صورت
خود رخصت ہو جاتا ہے
ماضی میں کھو جاتا ہے

اور اسی نظم کے آخر میں لکھتے ہیں:

یہ احساس
اپنی ہاتھوں کی امانت ہے
اور یہ جذبہ
فرمانو سرشار کی زندہ دولت ہے

تابشؔ دہلوی کراچی جشن فرمان کے موقع پر ایک نظم کہی تھی جن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فطرتاً نیک خو، نکو کردار
طبع سادہ، صفا کی آئینہ دار
ہر قدم راستی کا اک جادہ
منزل حق، نظر کی دلدادہ

نصیر کوٹی نذر فرمان کے عنوان سے ایک نظم کہے تھے جن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فراج اور کرے کیا ادا نیاز پرست
حیات جس کی حیات نگار پر قربان
صد آفریں ہے تجھے خدمت ادب کی لگن
نہ آرزو کی ستائش نہ داد کا ارمان

شمیم جاوید جشن فرمان کی خبر سن کر ایک نظم لکھی ہے جن کے چند اشعار پیش خدمت ہے:

نہ تکبر، نہ تکبّر، نہ تصنع، نہ غرور
منکر، سادہ، خلیق، حلم کی تصویر، غیور
سچے عالم کی وہی شان ہوا کرتی ہے
خلعتِ جاوداں ایسوں کو ملا کرتی ہے

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی کتاب ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار'' کے پیش لفظ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت وفن پر ساقی جاوید کی نظم کی چند سطریں پیش کی ہیں جو ان کی شخصیت کا احاطہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اب لکھوں بھی تو میں کیا لکھوں اس کی تعریف میں
اس کی عظمت کو دیکھو تم اس کی تصانیف میں
آج علم ادب کی ہے میزان وہ
میرے عہد قلم کی ہے پہچان وہ
ہاں مگر اسکو پھر ایک نظر دیکھنا
دل کی آنکھوں سے اس کے وہ بے نور دیوار و در دیکھنا
روشنی کے سمندر ملیں گے تمہیں
حرف دلدار سے حرف فرمان تک

شخصیت

ڈاکٹر طاہر تونسوی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کومل شخصیت اور ادیب بے عدیل پر ناز کرتا ہے اور یہ کوئی منھ دیکھنے کی بات نہیں ہے اس لئے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت وفن کا سحر اور ان کے قلم کا اعجاز ہے کہ سب کہتے ہیں۔ ''ہمارا فرمان'' میرا فرمان اور میرا بھی تو ہے۔ حالانکہ فرمان تو صرف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان بریلوی مسلک کے حامی ہیں لیکن مذہبی نظریات کے معاملے میں تنگ نظری اور انتہا پسندی سے دور ہیں۔ یہ ان کی آزاد خیالی ہے۔ یہ خوبیاں فرمان صاحب میں مولانا نیاز فتح پوری کی نیاز مندی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ سچے معنوں میں لبرل ہیں۔ وہ اپنے مسلک کے پابند ہیں۔ لیکن دوسرے مسلک کا احترام کرتے ہیں۔ یہ ان کی انسان دوستی ہے جو انہیں ہر مکتبہ خیال کے لوگوں میں مقبول بناتی ہے۔ نہ وہ اشتراکی ہیں نہ جماعت اسلامی کے سیاسی نظریات سے اتفاق کرتے ہیں لیکن اس سے وابستہ ادیبوں اور شاگردوں کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کٹر پن سے دور ہیں۔ زندہ دل انسان ہیں۔

مسعود حسن رضوی سے فرمان صاحب کی زندہ دلی کی ایک مثال سنئے:

''مڈل اسکول کی چھٹی جماعت میں تھے کہ ایک دوست سے لڑائی ہوئی۔ کھٹ سے شعر کہہ دیا لیکن نام نہ ظاہر کر کے اس کی دوستی کا بھرم بھی رکھا۔ کہتے ہیں:

ایک لڑکا گاؤں کا عرصے سے بائیکاٹ ہے نام اس کا ''ر'' سے ہے، چغلی میں موٹر کاٹ ہے(۲)

فرمان صاحب ابتدائی دور میں اکثر ظریفانہ اور مزاحیہ شعر کہتے رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب ''اردو کی ظریفانہ شاعری'' تصنیف کی۔ اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''ہنسنا ہنسانا جس کا ادبی نام طنز ومزاح یا شوخی وظرافت ہے، آدمی کا جبلی عمل ہے جس طرح آدمی خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر واہ واہ، سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہے اسی طرح وہ اپنے دوست کو دور سے دیکھ کر خوشی سے دانت نکالنے اور زندگی کے مضحکہ پہلوؤں پر ہنسنے پر مجبور ہے۔ اس کی یہ مجبوری کہیں بے ادبی و گستاخی گردانی جاتی ہے، کہیں لطف انگیز ونشاط آور۔

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال وآثار ترتیب وتدوین ڈاکٹر طاہر تونسوی مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۹۸ء ص:۶

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۴۵۴

باشعور، باذوق افراد کی یہ کوشش ہوتی ہے اور یہی ہونی بھی چاہئے کہ طنز وظرافت کی دودھاری تلوار سے کسی کی دل آزاری کا کام نہ لیا جائے۔ جو مریض کی صحت کا ضامن ہو اور لطف اندوزی کا کامیاب وسیلہ بھی۔''(۱)

ڈاکٹر عقیلہ شاہین اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان صاحب کی شخصیت کے متعلق لکھتی ہیں:

''فرمان صاحب کی طبیعت میں عجب طرح کی جدت پسندی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کا مزاج بیک وقت تحقیق وتنقید اور تخلیق سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ ان کی تنقید وتحقیق کے ہر پہلو میں ایک طرح کی جدت وندرت نظر آتی ہے۔ وہ دوسروں کے افکار وتاثرات کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں بلکہ انتہائی غور وخوض اور مشاہدہ ومطالعہ کے بعد کسی فنکار یا اسکے فن کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں اور پھر اس رائے کو پورے وثوق کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ اپنی ذات اور اپنی رائے کی یہی خود اعتمادی وخود اعتباری ان کی تنقید کا نمایاں وصف ہے۔''(۲)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن طاہر تونسوی کی کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فرمان صاحب کے یہاں دکھاوے کا دخل نہیں ان کا سب سے مخلصانہ ربط ہے، محض قولی نہیں تو ی بھی اور قلبی بھی۔ کوئی شخص نہ محض کمزوریوں کا مرکب ہوتا ہے، نہ سرتاسر خوبیوں کا مرکز۔ فرمان صاحب کی نظر خوبی پر جاتی اور صرف خوبی ہی پر رہتی ہے۔ جبکہ بیشتر آنی فانی زندگیاں مکمل ہم خیالی یا ہم آہنگی کے ہما کی تلاش میں تلخ یا ضائع ہوتی ہے۔''(۳)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''فرمان صاحب کہیں سچائی، بڑائی، سندرتا یا تہذیب نفس دیکھیں تو پگھل جاتے ہیں اور محض طمع، خیالی خولی سلاسہ، دلآزاری یا روے کی بدصورتی کا حوالہ انہیں آتش زیر پا بنا دیتا

۱۔ اردو کی ظریفانہ شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۱۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۴۱۴

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال وآثار، ترتیب وتدوین ڈاکٹر طاہر تونسوی مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۹۸ء ص:۱۲

ہے۔ مگر یہ کیفیت جہاں تہاں تنہائی میں کبھی میں نے نہیں پائی۔ سر بزم یا محفل عام میں انہیں بکھرتے یا بگڑتے کبھی نہ پایا۔''(۱)

رشید حسن خان فرمان صاحب کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فرمان صاحب کی شخصیت میں کئی خوبیاں ایسی ہیں جس پر رشک کیا جاسکتا ہے اور انکے علمی کاموں میں کئی خصوصیات ایسی ہیں جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں، ان کی شخصیت میں دلآویزی کتنی اور کیسی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو بھی ان سے آزردہ نہیں پایا یا یوں کہیئے کہ اظہار رنجیدگی کرتے ہوئے نہیں پایا یا جنکی اس صلاحیت میں کسی کو شک نہیں اور جس کا اظہار بے محابا ہوتا رہتا ہے۔'' (۲)

سید عابد علی جعفری جو ڈاکٹر فرمان صاحب کے خالہ زاد بھائی بعد میں سالا اور بچپن کے دوست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کھلتا ہوا گندمی رنگ، تیکھے نقوش، آنکھوں کی چمک ان کی ذہانت کو عیاں کرتی تھی۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین، ورزش اور کسرت کرنے کے دلدادہ انکا چھریرا بدن ان کی چستی اور پھرتی کی غمازی کرتا تھا۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان کی ظاہری شخصیت کے بارے میں حکیم نثار احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''میانہ قد، جسم دبلا نہ موٹا، لیکن قد کسرتی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ چوڑی ابھری پیشانی، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، بیلدار لکھنوی کرتہ زیب تن اور پاجامہ علی گڑھ کی روایت کا غماز، غالباً دو پلی ٹوپی بھی پہنتے ہوں گے۔ اگرچہ اس وقت سر پر نہ تھی۔ غرض لباس سے اودھ کی چھاپ ظاہر تھی چہرہ پر غور و فکر کے آثار بھی نمایاں تھے۔ فرمان صاحب قہقہہ خوب لگاتے ہین اور ان کی گفتگو

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار، ترتیب و تدوین ڈاکٹر طاہر تونسوی مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۹۸ء ص:۱۱)
۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص:۲۳۱)
۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۵۸۹)

میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر طبقے کے پسندیدہ محبوب ہیں۔"(۱)

پروفیسر عرش صدیقی معروف نقاد اور افسانہ نگار اور فرمان صاحب کے دوستوں میں سے ہیں۔ صدیقی صاحب فرمان صاحب کی شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ ایک حلیم طبع، کشادہ دل، ارو اور کشادہ ذہن معلوم ہوئے اور یہ حقیقت ثابت ہوگئی، ان کی یہی خوبی کہ وہ کشادہ دل اور کشادہ ذہن، مجھے ہمیشہ متاثر کرتی رہی ہے۔ بحیثیت دوست وہ بے حد مہربان آدمی ہیں۔ جن باتوں پر عام لوگ ناراض ہوجاتے ہیں وہ ان باتوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت استاد درس و تدریس کے پیشے میں ہوں یا تحقیق و تنقید کے میدان میں وہ ہر جگہ اپنا سکہ جمائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادبیت کے متعلق ڈاکٹر فہیم اعظمی کراچی لکھتے ہیں:

"ادب اور اخلاق، انسانی رویہ اور سلوک "ادیب" کی شخصیت اور اس کی تحریر و تقریر کے اجزائے سائنٹفک ہیں ان کے بغیر ادیب مکمل نہیں ہوتا۔ میں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری میں ادب اور ادیب کے انہیں اجزاء کی عکاسی دیکھی، انکی زبان یا قلم سے کبھی کسی دوسرے ادیب کی برائی نہیں سنی وہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو نقاد کی حیثیت سے یہ ان کی افتادِ طبع ہے۔ لیکن نکتہ چینی یا تنقید میں انہوں نے کبھی اخلاق کو نظر انداز نہیں کیا اور یہی صفت ان کو صحیح معنوں میں ادیب کا مصداق بناتی ہے۔"(۳)

ڈاکٹر فہیم اعظمی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

۱۔ شب چراغ۔ از حکیم نثار احمد علوی مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۴ء۔ ص: ۴۷

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کتاب نما خصوصی شمارہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۹۲ء ص: ۴۷

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص: ۳۹۶

''فرماں فتح پوری صاحب کا اسلوب ہمیشہ صاف ستھرا رہا، دھیمے الفاظ میں جبر و استبداد، سیاست و سرمایہ داری کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن نئی نسل کو ماضی سے منسلک رہنے کی خواہش بھی ظاہر کرتے ہیں۔''(۱)

شہزاد منظر کراچی سے فرمان صاحب کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمارے دور کے ایک اہم محقق اور ناقد ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محبوب شخصیت بھی ہیں۔ ادیب ناقد اور محقق ہونا تو خیر کوئی غیر معمولی بات نہیں اس لئے کہ ادیب ناقد اور محقق اور بھی ہیں لیکن شخصیت ہر کوئی نہیں ہوتا یہ خوبی کسی کسی میں پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کی یہ خوبی ہے کہ اس قدر مشہور معروف ہونے کے باوجود ان میں ذرہ بھر تکبر نہیں۔ وہ ہر شخص سے خواہ وہ عمر اور مرتبے میں ان سے بڑا ہو یا چھوٹا بہت ہی محبت اور خلوص سے ملتے ہیں اور اپنے مشفقانہ رویئے سے اس کے دل پر گہرا نقش چھوڑتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ادبی حلقے میں خواہ وہ کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو، مقبول اور محبوب ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت اور افتادِ طبع کے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ لکھنے پڑھنے والا شخص بالعموم حساس تو ہوتا ہی ہے، فرمان صاحب زیادہ ہی حساس ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑے صابر اور ضابط بھی ہیں۔ ان جیسا صبر کرنے والا اور ضبط رکھنے والا میں نے کم دیکھا میرا ان کا ایک تہائی صدی سے زیادہ کا ساتھ ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ انکے بعض سینیر ز نے انہیں بڑی آزمائش میں رکھا لیکن میں نے سینئرز کے احترام میں ان کے یہاں کوئی کوتاہی یا کمی نہ پائی، نہ وہ ان سے منحرف ہوئے۔ نہ انہیں منہدم کرنے پر آمادہ کئے جاسکے۔''(۳)

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۴۰۲

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۴۰۴، ۴۰۵

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار، ترتیب و تدوین ڈاکٹر طاہر تونسوی مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۹۸ء ص:۱۱

ڈاکٹر فرمان صاحب خوش نصیب ہیں کہ ان کی شخصیت کا اعتراف انکی زندگی ہی میں ہونے لگا عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کے مرنے کے بعد ان کی شخصیت و عظمت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

معاصرین سے تعلقات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادبی و تحقیقی خدمات پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''فرمان فتح پوری ان لکھنے والوں میں ہیں جن کے یہاں روایت اہمیت اور عظمت کے احساس کے ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی پورا لحاظ پایا جاتا ہے ان کے تنقیدی مقالوں میں ان کے وسیع مطالعہ اور متوازن طبیعت کا بڑا اچھا امتزاج نظر آتا ہے ان کی حیثیت تاریخی بھی ہے اور تحقیقی بھی۔ انداز بیان بھی سرسید اسکول کا سا ہے کہ جو بات کہنا چاہتے ہین اسے صفائی اور سلیقے سے کہہ جاتے ہیں۔ الفاظ کے ہیر پھیر اور تکرار سے جو آج کل نوجوانوں کے اسلوب کا جزو ہیں، ان کی تحریریں پاک ہیں۔''(۱)

مرحوم......رشید حسن خاں صاحب اردو ادب کے ایک مایۂ ناز شخصیت اور ہند و پاک کے ایک بڑے نقاد اور عہد حاضر کے ایک بہترین لکھنے والوں میں سے تھے۔

رشید حسن خاں جیسے ممتاز نقاد نے بھی فرمان صاحب کی صلاحیت و قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فرمان صاحب کی شخصیت میں کئی خوبیاں ایسی ہیں جس پر رشک کیا جا سکتا ہے اور ان کے علمی کاموں میں کئی خصوصیات ایسی ہین جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔
>
> وضعداری ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم لغت میں بھی صحیح طور پر درج کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ہماری زندگی میں تو وہ ''بیگانہ آشنا'' بن کر رہ ہی گیا ہے اس میں حالات کے جبر کو بھی دخل ہے اور کم ظرفی کو بھی، یہ تو ممکن ہے کہ

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص: ۳۹۴

لغت نویسی کی حیثیت سے اس لفظ کی وسعت مفہوم کو وہ لفظوں میں وہ اسیر نہ کر پائیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی شخصیت اس لفظ کی قد آدم آئینہ دار ہے۔"(۱)

رضا ہمدانی پیشاوری ڈاکٹر فرمان صاحب کے تحقیق وتنقید کام کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی تحریروں میں تنوع بھی ہے اور وسعت خیال بھی۔ وہ جس موضوع پر بھی خامہ فرمائی کرتے ہیں بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ادب ثقافت، تمدن، سیاست اور تہذیب کے سلسلے میں کوئی موضوع بھی ان کے نگاہ سے اوجھل نہیں۔ بعض ایسے موضوع بھی ان کی گرفت میں آئے ہیں جو اگر چہ بیش پا افتادہ کہلاتے ہیں۔ لکھاری ان سے بے خبر ہوتا ہے یا نویسندہ ان کو عمداً درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ فرمان صاحب اس روش سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔ وہ گہرائیوں میں اتر کر ایک ماہر غواص کی طرح موتیوں کی تلاش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فرمان صاحب کی ذہنی زرخیزی اور ادراک ان کو اپنے عصر میں امتیازی شکوہ کا مستحق بناتی ہے۔"(۲)

اخلاق وعادات

شباہت علی خاں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اخلاق وعادات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فرمان صاحب شروع ہی سے ایک محنتی، ذہنی اور ہمہ شغل طالب علم رہے، کھیل کود، بیت بازی، مباحثہ، مشاعرہ، کشتی، اکھاڑہ، دنگل، میلہ ٹھیلہ، لڑائی جھگڑا سب میں دلچسپی لیتے تھے اور آگے آگے رہتے تھے اسی کے ساتھ پڑھنے میں سب سے تیز تھے۔ پرائمری اسکول میڈل میں ہائی اسکول میں سب میں اول درجے میں پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوئے اور سرکاری

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کتاب نما خصوصی شمارہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۹۲ء ص:۱۷

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۲ء جلد دوم۔ ص:۳۸۹، ۳۹۰

وظائف حاصل کئے اور کلاس میں ہمیشہ اول آئے اور اسی وجہ سے ہمیشہ کلاس مانیٹر رہے۔اس کی مانیٹری بھی کلاس ٹیچری سے بھی بڑھ کر ہوتی تھی۔کلاس کو باقاعدہ پڑھانا شروع کردیتے تھے اور شرارت کرنے والوں کی مرمت بھی کردیتے تھے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کے بیٹے ڈاکٹر وسیم صلاح الدین اپنے والد کی مہمان نوازی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ابا جی کی ایک اور عادت جس کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی ان کی مہمان نوازی ہے۔ان کو دعوتیں کرنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ صرف موسم کے اچھے ہونے کی بناپر دعوت دے ڈالتے ہیں۔"(۲)

محبوب احمد نقوی لندن سے فرمان صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہم وطنوں کے درمیان ماسٹر صاحب کے اندر کا پوربیا آدمی کھلکھلا کر اُبل پڑتا ہے۔ان آنکھوں میں اس وقت ایک مخصوص چمک آجاتی ہے۔چہرہ دمک اٹھتا ہے۔باتیں بے ساختہ اور قہقہے آزاد ہوجاتے ہیں۔ویسے بھی ماسٹر صاحب کے پاس زیادہ دیر بلا قہقہہ لگائے نہیں رہ سکتا۔موضوع گفتگو کتنی ہی خشک وسنجیدہ کیوں نہ ہو۔ماسٹر صاحب اپنے ذوق ومزاج طبعی شوخی سے کہیں نہ کہیں ہلکا پھلکا مزاح کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں اور اس طرح وہ قہقہوں کے ساز پر زیر گفتگو موضوع پر پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔"(۳)

ڈاکٹر وسیم صلاح الدین اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابا جی حد درجہ جذباتی واقع ہوئے ہیں ان کی آنکھیں جیسے ہر وقت چھلکنے کے لئے بیتاب رہتی ہیں۔بہت زیادہ خوشی میسر آجائے تو بھی رونے

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۵۹

۲۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۷۵

۳۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ص:۶۳۰

لگتے ہیں۔غم کی تو بات ہی اور ہے بہت جلد یکسر نڈھال ہو جاتے ہیں۔اکثر یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ بظاہر بعض ناپسندیدہ شخصیات کی وفات پر بھی وہ تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روتے رہتے ہیں اور ان کے لئے دعاءِ خیر کرتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ اباجی نے اپنے ایک پرانے گھر کو بیچنے کا فیصلہ کیا۔گوکہ یہ فیصلہ کئی مہینوں کی سوچ بچار کے بعد کیا گیا تھا لیکن جب وہ صاحب جن کے ہاتھ مکان بیچنا تھا، بیعانہ کی رقم دے کر گئے اباجی کو بے اختیار رونا آ گیا اور انہوں نے وہ ساری رات بے چینی اور بے خوابی میں گذاری۔صبح اٹھ کر رقم واپس بھجوادی اور کہلوادیا کہ اس گھر کو بیچنا نہیں چاہتے۔''(۱)

انہوں نے مزید لکھا کہ اباجی کی نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ''ہر عمر کے لوگوں میں یکساں مقبول ہیں، وہ ہر کسی کو خوش کرنا جانتے ہیں اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں ان کو کسی سے حسد محسوس نہیں ہوتا'' وعدہ کرنے میں فرمان صاحب بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر وعدہ کرلیں تو اس کے پورا کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ڈاکٹر انوار احمد ملتانی جو کسی زمانے میں ڈاکٹر فرمان صاحب کے گھر بطور مہمان قیام کئے تھے اور انہوں نے جو کچھ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں دیکھا ان کے عادات معلومات کو قلمبند کیا وہ چند سطریں یہ ہیں:

''فرمان صاحب رات کے پچھلے پہر جاگتے اور لکھنے پڑھنے کا کام شروع کردیتے یہی ان کا معمول تھا (ہے) فرمان صاحب کی محبت، کشادہ دلی اور عالی ظرفی کی گہری چھاپ ان کے افراد خانہ پر ہے، جس سے انہیں اس اذیت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا جس سے ہمارے ادیب گذرتے ہیں جب وہ کسی کو اپنے گھر آنے اور کھانے کی دعوت دے بیٹھتے ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر انوار احمد ملتانی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی عادات واطوار کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

''کسی کام کی تلقین پر اکتفا نہیں کرتے، وہ خود کرتے ہیں، دوستوں اور

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۴۷

۲۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۱۹۷

شاگردوں سے اس کی تکمیل کی درجہ بدرجہ رپورٹ مانگتے ہیں، وہ انکسار اور قلندری کے باوجود اونچی کرسی سرکاری خوشنودی اور شہرت سے بے نیاز نہیں کہ ملازم پیشہ ہیں اور سرشت آدم بہر حال رکھتے ہیں۔"(۱)

ا۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۹۸

باب سوم

کارنامے

تصانیف

رسالے

(بطور خاص نیاز فتحپوری کے نگار کے شعبہ ادارت سے خصوصی تعلق)

کارنامے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اردو ادب میں تحقیق وتنقید کے حوالے سے مشہور معروف ادبی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اردو ادب میں بے شمار کارنامے انجام دیئے ہیں مگر ان میں سب سے بڑا کارنامہ نگار کی ادارت ہے جو ان کے ملاحظات کے ساتھ مسلسل شائع ہورہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تصنیفی و تالیفی کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہوچکی ہیں۔

جنوری ۱۹۶۲ء سے نگار کے خصوصی شمارے ان کی ادارت میں چھپ رہے ہیں۔

۱۹۶۶ء سے ہر مہینے ''ملاحظات'' کے عنوان سے ماہنامہ ''نگار'' پاکستان کے اداریے لکھ رہے ہیں۔

کم وبیش چھ سو تحقیقی وتنقیدی مقالات اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اب تک تقریباً سات سو کتابوں پر تبصرہ لکھ چکے ہیں۔ دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تقریباً سو کتابوں پر دیباچے اور مقدمے لکھے ہیں۔

مختلف ادیبوں اور شاعروں سے مراسلات کا سلسلہ تقریباً ۶۵ سال سے قائم ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری آج ہمارے عہد کے بزرگ اور معتبر اہل قلم کی پہلی صف میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا قلم ہمیشہ رواں رہتا ہے ان کا قلم ادب کے مختلف اصناف پر ہمیشہ نت نئے معلومات مشاہدات سے لبریز نظر آتی ہے۔ ادب کے قدیم وجدید نئے پرانے ادبی مسائل اور معاملات ومباحث، فن شعر وشاعری، شعری و نثری اصناف، نثر نگار، تذکرے، تنقید وتحقیق تاویل وتعبیر، تہذیب زبان، املا، رسم الخط و تاریخ تحریک پاکستان، نعت نویسی، صحافت، تدریس غرض اردو زبان وادب کے اکابر شاعر اور ادبیات ہندوسندھ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوگا کہ ان کی توجہ سے محروم رہا ہو۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر تحقیقی وتنقیدی کام

امراؤ طارق نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات کی تین جلدیں شائع کیں۔ امریکہ میں، جشن فرمان کے سلسلے میں ان جلدوں کی اشاعت ہوئی۔ ان جلدوں میں اہل قلم اور صاحبان ذوق نے

اور فرمان صاحب کے دوستوں اور شاگردوں نے ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں اظہار رائے کیا ہے۔ فرمان شناسی کے لئے ان جلدوں کے مضامین کا مطالعہ ضروری ہے۔ حالانکہ افسانہ نگار امراؤ طارق کی تین جلدوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے ہر پہلو پر مضامین ملتے ہیں لیکن ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب میں ان حضرات کے مضامین شامل کئے گئے ہیں جن سے فرمائش کر کے انہوں نے تازہ مضمون لکھوایا جس کی وجہ سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر طاہر صاحب نے شکوہ کیا ہے کہ کراچی کے اہل دانش نے انہیں مایوس کیا اور انہوں نے تعاون نہیں کیا۔ اگر ان مشاہیر کی بھی شرکت ہوجاتی تو کتاب کا معیار اور بلند ہوتا۔ بہرحال امراؤ طارق کی تین جلدوں کے بعد ڈاکٹر طاہر صاحب کی کتاب ہی فرمان شناسی میں سب سے زیادہ مفید ہے، جو تحقیقی وتنقیدی کام اور کیا گیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، شخصیت وادبی خدمات ڈاکٹر خلیق انجم مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۹۲ء

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال وآثار۔ ترتیب وتہذیب ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ الوقار پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۹۸ء

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایک جہت نما صاحب قلم۔ سلیم اختر عاکف بکڈ پو دہلی ۲۰۰۵ء

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت نقاد، محمد نذیر انور علوی، مقالہ برائے ایم اے اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔ ۱۹۸۷ء

۵۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت محقق۔ نورین فردوس۔ مقالہ برائے ایم اے اردو گورنمنٹ کالج، لاہور۔ ۱۹۹۰ء

۶۔ نگار پاکستان کی ادبی خدمات۔ (۱۹۶۲ء تا ۱۹۹۲ء) محمد نذیر انور علوی مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

۷۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور اقبال شناسی۔ سہل سرور مقالہ برائے ایم اے اردو گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۹۹۶ء

مشاہیر فتح پور ہسوہ

اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''مشاہیر فتح پور ہسوہ'' شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے اسے ''ایک عظیم وقدیم تہذیبی گہوارہ (فتح پور ہسوہ) قرار دیا ہے۔ اس کے ناشر بیکن بکس بوسن روڈ ملتان ہیں، ان کا انتساب ''مدرسہ اسلامیہ ومسلم ہائی اسکول فتح پور کے درودیوار طلبہ واساتذہ کے نام جن کی یادیں ان کی زندگی کا نہایت قیمتی اثاثہ ہیں'' کیا گیا ہے۔

فرمان صاحب فتح پور کے ہیں اور انہوں نے اس کا پورا پورا حق بھی ادا کیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان قیام فتح پور کے زمانے میں جو خواب دیکھا تھا یہ کتاب اسی کی تعبیر ہے۔ انہوں نے لکھا کہ میں فتح پور اور اہل فتح پور کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہا اور جو کچھ بن سکا کرتا رہا۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پورے دس سال فرمان صاحب کا قیام فتح پور شہر میں رہا اور یہیں کے مدرسہ اسلامیہ ومسلم ہائی اسکول کے طالب علم ومعلم کی حیثیت سے اپنے یادگار دن گذارے تھے، لکھتے ہیں:

> ''یہی زمانہ تحریک پاکستان اور تقسیم ہند کے سلسلے میں سیاسی شورشوں کا تھا، میں فتح پور کے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مقامی لیڈر کے طور پر ضلع فتح پور کے گاؤں گاؤں پھرا چنانچہ مجھے اپنے ضلع کی آبادیوں کو جتنی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا دوسروں کو کم ملا ہوگا۔ چنانچہ اس زمانے میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ بزرگوں سے سنا ہے، جو کچھ تجربے اور مطالعے میں آیا ہے یا مراسلات کے ذریعے حاصل کیا ہے وہی قلم بند کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوجائے گا کہ میں نے اس میں عموماً فتح پور اور اہل فتح پور کے ماضی یعنی اس فتح پور کو سامنے رکھا ہے جو نصف صدی پہلے مجھ سے چھٹ گیا اور جس کی بے تحاشہ یادوں کے طفیل میں یہ کتاب ظہور میں آئی۔''(۱)

فرمان صاحب خود لکھتے ہیں:

۱۔ مشاہیر فتح پور ہسوہ۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ ملتان، ۲۰۰۲ء ص: ۹

''یہ خیال کرنا کہ اہل فتح پور کے بارے میں یہ تذکرہ ہر طرح مکمل ہے درست نہ ہوگا۔ یقیناً بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے یا نادانستہ محذوف ہوگئے ہوں گے اور بعض کا تذکرہ اختصار کا شکار ہوگیا ہوگا۔ چنانچہ بعض مقامات پر مجھے اس کا شدید احساس بھی ہوا ہے لیکن اب اس تذکرے کی خامیوں کو درست کرنے کا بھی وقت نہیں رہا۔ صحت روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے۔ سفر کے وسیلے بند ہوتے جارہے ہیں۔ سوچا تھا کہ ایک بار اور فتح پور جاؤں گا اور کتاب کی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا مگر یہ ممکن نظر نہیں آتا۔''(۱)

اس کتاب میں پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''فتح پور کا سیاسی وتہذیبی پس منظر'' پیش کیا ہے فتح پور کی وہ نادر شخصیت جن کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے ان میں مولانا سید ظہور الاسلام، مولانا عبدالسلام ہسوی، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا حسن الدین خاموش، منشی گوکل پرشاد، لالہ ایشور سہائے منشی مہر چند کھتری وغیرہ شامل ہیں۔ بڑی تعداد میں شعرائے فتح پور کا ذکر ہے جن میں زیبا کوٹی، بہار کوٹی، شفیق کوٹی، ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، حباب ہاشمی، فاطمہ قیصری، ریحانہ نصیر کوٹی بھی شامل ہیں۔ فتح پور کے ادیبوں اور ادب شناسوں کا بھی تذکرہ ہے جن میں ابومحمد سحر، اکرام فتح پوری الطاف حسین خان شیروانی، امراؤ طارق، ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری، یعقوب یاور، شباہت علی خاں، امتیاز الدین خاں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب میں نامور اطباء، وکلاء اور دیگر ماہرین فن کے بھی تذکرے موجود ہیں۔ ممتاز وکلاء جن کا ذکر کیا گیا ہے ان میں اوماشنکر، اولاد حسن خاں، امیر حسن خاں، بابو ہنس گوپال، بدری پرشاد ککڑ، بیرسٹر احمد کمال، حسن احمد شاہ، شیخ حشمت علی، خان بہادر رکن الدین خان، عبدالرؤف خاں، سید فیاض حسین، گوری پرشاد ککلر، متین الدین عثمانی وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس کتاب میں پاکستان کے نامور ایٹمی سائنسداں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا آبائی وطن فتح پور کا مشہور قصبہ کوٹ ہے۔ ان کی

۱۔ مشاہیر فتح پور ہسوہ۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ ملتان، ۲۰۰۲ء ص:۱۰

جائے پیدائش بھوپال ہے۔ جہاں ان کا خاندان روزگار معاش کے سلسلے میں فتح پور سے بھوپال منتقل ہوگیا تھا۔ فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو اپنے آبائی وطن اور خاندانی تفصیلات سے خاص واقفیت اور دلچسپی ہے اور یہ دلچسپی ہنوز ان کے ذہن میں تازہ و برقرار ہے۔

اس تذکرے میں فرمان صاحب نے عبدالقدیر خاں کا خط مورخہ ۲۳ر دسمبر ۱۹۹۳ء شامل کیا ہے جس میں ڈاکٹر خان نے تحریر کیا ہے کہ انکے دادا منصور خاں فتح پور سے روانہ ہوکر ناگپور کے قریب امراؤتی رہائش پذیر ہوگئے تھے اور انکے والد عبدالغفور خاں نے ناگپور یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حمایت علی خاں صاحب انکے کزن لگتے تھے اور ان کی اولاد نے اپنے پاس رکھ کر پرورش کی تھی اور تعلیم دلوائی تھی حمایت علی خاں بھوپال میں چیف انجینئر تھے وہ کوٹ ضلع فتح پور کے تھے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان دنیا کے ممتاز ترین ایٹمی سائنسدانوں میں ہیں ان کو نشان امتیاز اور ہلال امتیاز کے اعزازات کے علاوہ بین الاقوامی سطح کے درجنوں ایوارڈ اور خطابات مل چکے ہیں۔ وہ سائنس داں ہونے کے علاوہ شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

امراؤ طارق جو مرتب کتاب ہیں انہوں نے صاحب کتاب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جو ضمیمہ نمبر ۳ میں درج ہے۔

ایسی کتاب میں چند فروگذاشتوں کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بیچارے نذیر فتح پوری رسالہ اسباق (پونے) کے ایڈیٹر سے یو پی کے فتح پور سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ دوسرے صوبے کے فتح پور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر مشاہیر فتح پور ہسوہ میں ان کو فتح پور ہسوہ سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ''مشاہیر فتح پور ہسوہ'' میں ان کی بابت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یہ بھی لکھ دیا۔

> ''نذیر فتح پوری شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، ڈرامہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ نذیر فتح پوری ۱۹۶۰ء میں اپنے وطن فتح پور سے ہجرت کر کے شہر پونا آ گئے وہیں مقیم ہیں۔''(۱)

ادیب و شاعر ڈاکٹر طفیل احمد مدنی سابق صدر شعبہ عربی و فاسی الہ آباد یونیورسٹی جو بقید حیات ہیں، ان

ا۔ مشاہیر فتح پور ہسوہ۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ ملتان، ۲۰۰۲ء ص: ۱۷۸

کا کتاب میں یوں ذکر کیا ہے گویا مرحومین میں ہوں۔

تعجب ہے کہ اہل فتح پور کے تذکرے میں نامور مجاہد جنگ آزادی، مشہور صحافی شہید گنیش شنکر ودیارتھی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ہندی دنیا ضلع فتح پور کو گنیش شنکر ودیارتھی کے حوالے سے جانتی ہے۔

اس کتاب کی اہمت اس بات سے ہے کہ اس میں کس کا ذکر ہے، اس سے نہیں کہ کس کا ذکر آنے سے رہ گیا۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے گوکل پرشاد کا ذکر کیا ہے اور ان کے لکھے ہوئے تذکرہ (ارمغان گوکل پرشاد) کو ادبی دنیا کے سامنے پیش کر کے ادب کی زبردست خدمت کی ہے۔

اس کتاب کے نسخے بہت کم تعداد میں چھپے تھے اس لئے کتاب نایاب ہوگئی تھی۔ ''نگار'' پاکستان بابت ۱۹۶۶ء سے پہلے ''ارمغان گوکل پرشاد'' کا قابل ذکر تذکرہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ منشی گوکل پرشاد رسا کے منتخب پچاس شعر بھی فرمان صاحب نے اس کتاب میں شائع کئے ہیں۔ منشی گوکل پرشاد کی اصل اہمیت ''ارمغانِ گوکل پرشاد'' سے ہے ان کی شاعری سے نہیں ہے۔

اردو نثر کا فنی ارتقاء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتب کی ہوئی کتاب ''اردو نثر کا فنی ارتقاء'' ہندوستان میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے پہلی بار ۱۹۹۷ء میں دوسری بار ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو نثر کے ان گوہر پاروں کے مضامین کو یکجا کر دیا ہے جو مختلف جگہوں پر بکھرے تھے ''کتاب سے پہلے'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اردو نثر کو ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کا رُخ عموماً شعر و شاعری کی طرف رہا ہے۔ نتیجتاً اردو نثر کے تاریخی و فنی ارتقاء پر دو چار کتابیں بھی ڈھنگ کی نظر نہیں آتیں، چنانچہ اگر کوئی چاہے کہ اسے اردو نثر کے صنفی یا اسلوبی ترقی پر کوئی حقیقت پسندانہ جائزہ یا قابل استناد مواد، یکجا ہاتھ آجائے تو مایوسی ہوگی۔''(۱)

۱۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی ۔ ۲۰۰۱ء ص:۱۱

اس سلسلے کی یہ کتاب جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو نثر کے باب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

اس میں پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کے افسانوی مضامین شامل ہیں ناول نگاری کے متعلق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی، آل احمد سرور اور پروفیسر عبدالسلام کے مضامین کو چنا ہے داستان کے حوالے سے خود ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شمیم احمد، ابراہیم یوسف کی ڈرامہ نویسی، ڈاکٹر گیان چندر کی تمثیل نگاری، ڈاکٹر سید محمد حسنین اور نظیر صدیقی کے انشائیہ مضامین شامل ہیں۔

نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر عبارت بریلوی اور ٹی ایس ایلیٹ، ترجمہ جمیل جالبی کے تنقیدی مضامین کو جگہ دی ہے۔ یہی نہیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تذکرہ نگاری، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر سید شاہ علی کی سوانح نگاری، ڈاکٹر سید عبداللہ کی آپ بیتی، یحیٰ امجد کی خاکہ نگاری، خورشید الاسلام کی خطوط نگاری اور شمیم احمد کی رپورتاژ پر مضامین شامل ہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''داستان اور داستانیں'' شامل ہیں۔ داستانوں میں قصے کے تمام اقسام شامل ہوتے ہیں۔ قصے اور کہانیاں عام طور پر فرضی اور خیالی ہوتے ہیں۔ داستانوں میں زندگی کی جو عکاسی کی جاتی ہے اس کا کردار واقعات فرضی ہوتے ہیں جس کا حقیقی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''داستان کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ طویل ترین ہونے کے باوجود ذہن و گوش کے لئے بارنجہ بننے پائے اس لئے داستان طراز نت نئے واقعات و مہمات اس طور پر سامنے لاتا ہے کہ سننے والے قصہ سے اکتانے کے بجائے اس کا نہ ختم ہونے کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ مرکزی قصہ کو طول دینے کے جو ضمنی قصے، ان میں لائے جاتے ہیں ان کے موضوعات کچھ ایسے متنوع ہوتے ہیں کہ سننے والے کی دلچسپی کسی مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی۔''(۱)

داستانوں میں عشق و محبت کی بدولت رنگارنگی اور طوالت پائے جاتے ہیں۔ ''عشق و محبت کی رومانی کہانیاں، داستانوں کے دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔

۱۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۱ء ص: ۱۵۰

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے؟:

''کہانیوں میں رومان یا رومانس شاید سب سے اہم اور سب سے زیادہ
وسیع معنوں کا حامل ہے اور اس کے حدود میں عشق و محبت کے واقعات کے
ساتھ ہر قسم کے حادثات و مہمات داخل ہو جاتے ہیں۔''(۱)

عام طور پر داستانوں میں بھوت، پریت، جن و پری کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اردو کی پہلی منظوم داستان کدم راؤ پدم راؤ، سب رس فارسی قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ، باغ و بہار، آرائش محفل، رانی کیتکی کی کہانی، فسانہ عجائب، گل صنوبر، سروش سخن، طلسم حیرت داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال، داستانوں کا مختصر جائزہ لیا ہے۔

انہوں نے اردو ادب کے ممتاز تنقید نگار نیاز فتح پوری کا مضمون ''ادبیات اور اصول نقد'' مجنوں گورکھپوری کا مبادیات تنقید شوکت سبزاوری کا ادبی تنقید اور لسانیات، ڈاکٹر عبارت بریلوی کا ادبی تنقید میں روایت اور تجربے ترجمہ جمیل جالبی کا تنقید کا منصب جیسے اہم تنقید نگاروں کے نگارشات کو یکجا کر دیا ہے۔

خود ڈاکٹر فرمان صاحب کا مضمون ''تذکرہ نگاری کا فن اور اردو شعراء کے تذکرے'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں تذکرہ نگاری کے متعلق مدلل بحث ملتی ہے جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا اک اہم موضوع ہے۔ جس پر ڈاکٹر صاحب کو ڈی لٹ کی ڈگری ملی ہے۔ جس میں اردو زبان و ادب کے تمام تذکرہ نگاروں کے تذکرہ کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں تذکرہ نگاری کی ابتداء ۱۷۵۲ء سے لے کر آب حیات کے تصنیف ۱۸۸۰ء تک کے تذکرے کا ذکر کیا ہے۔

ادبی تنقید میں اول و آخر تک شعرائکے جو حالات واقعات لکھے گئے ہیں وہ سب ان تذکروں کے بدولت ہی نظر آتے ہیں۔ تذکرہ نگاری کی بدولت ان تمام شعراء و ادباء کے کلام و حالات کو جاننے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''ولی کے عہد سے لے کر انیسویں صدی کے اول و آخر تک شعراء کے

۱۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۱ء ص: ۱۴۷

متعلق جو واقعات اور حالات سامنے آئے ہیں، ان سب کا سرچشمہ یہی تذکرہ
ہیں۔ دکنی شعراء سے لے کر شمالی ہند کے ممتاز شعراء، درد، حاتم، سودا، میر،
یقین، قائم مصحفی، انشاء، آتش، ناسخ، جرأت، ممنون، میر حسن، تاباں، نواب
مرزا، غالب، مومن، ذوق، انیس، دبیر اور ظفر کے کلام زندگی کی جتنی تصاویر
آج ہمارے سامنے ہیں وہ انہیں تذکروں کی مدد سے تیار کی گئی ہیں۔"(۱)

فرمان صاحب کے تذکرہ نگاری کا یہ مضمون پڑھنے کے بعد تذکرہ نگاری "نکات الشعراء" سے آب حیات تک تمام تذکرہ کا مفصل معلومات اس ایک مضمون سے مل جاتی ہے۔ جس میں تذکرہ نگاروں کے تذکروں کے ماخوذات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہی نہیں ڈاکٹر عبدالقیوم کا مضمون سوانح نگاری کیا ہے؟ ڈاکٹر سید شاہ علی حالی، اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی آپ بیتی، یحییٰ امجد کی اردو میں خاکہ نگاری، خورشید الاسلام کی خطوط نگاری، شمیم احمد کا رپورتاژ جیسے مضامین کو شامل کر اردو نثر کے ممتاز ناقدوں اور ادیبوں کے مضامین کو یکجا کر ان کو سمجھنے میں ہماری راہ ہموار کر دی ہے۔

اردو افسانہ اور افسانہ نگار

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تنقیدی و تحقیقی مضامین میں نظم و نثر دونوں کو اپنا موضوع بنایا ہے یہ کہنا دشوار ہے کہ انہوں نے زیادہ توجہ شاعری سے متعلق اپنی تحقیق و تنقید میں دکھائی ہے یا نثر کے بارے میں اردو افسانے کے بارے میں فرمان صاحب کی کتاب "اردو افسانہ اور افسانہ نگار" اہمیت رکھتی ہے۔

فرمان صاحب نے سوال اٹھایا ہے کہ کس خاص افسانہ نگار کا پہلا افسانہ کون سا ہے؟ کب لکھا گیا ہے؟ پہلی بار کس پرچے میں اور کب چھپا ہے؟ کس افسانوی مجموعے میں شامل ہے؟ کیسے اور کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے؟ خود لکھتے ہیں:

"کہنے کو یہ بات بہت معمولی اور چھوٹے چھوٹے سوالات ہیں لیکن ان
کے جوابات دینا کتنا مشکل ہے، اس مشکل کا صحیح اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے

۱۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۱ء ص: ۳۱۱

جبکہ کوئی شخص ان سوالوں کے جواب کی کھوج میں فی الواقع نکل پڑے۔"(۱)

اس سلسلے میں فرمان صاحب نے دو مثالیں دیں انہیں تلاش ہوئی کہ ابراہیم جلیس کا پہلا افسانہ کون سا ہے۔ چھان بین سے پتہ نہ چلا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ابراہیم جلیس کا پہلا افسانہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"خود ابراہیم جلیس کے ایک مضمون سے سراغ ملا کہ ان کا پہلا افسانہ "رشتہ" ہے اور یہ فروری ۱۹۴۳ء کے "ساقی" میں چھپا تھا۔"(۲)

جب ڈاکٹر فرمان صاحب نے احمد ندیم قاسمی کے اولین افسانہ کی تلاش شروع کی تو انہیں کامیابی نہ ہوئی فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"قاسمی صاحب سے جب رجوع کیا گیا تو انہوں نے لکھا کہ میرے پہلے افسانے کا عنوان "بدنصیب بت تراش" تھا۔ اختر شیرانی مرحوم کے رسالہ "رومان" میں ۳۸۔۱۹۳۷ء کی کسی اشاعت میں چھپا تھا۔

اب نہ تراشہ محفوظ ہے اور نہ رومان کا پرچہ دستیاب ہے۔ کراچی اور لاہور میں یہ پرچہ نہ مل سکا۔ ہندوستان کے دوستوں کو لکھا۔ آخر کار اردو ریسرچ سینٹر حیدر آباد دکن کے ناظم جناب عبدالصمد خاں صاحب نے مطلوبہ افسانے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھجوائی اور پتہ چلا کہ ان کا اولین افسانہ "رومان" فروری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب کو نیاز صاحب کے اولین افسانہ کی کھوج میں بھی دشواری آئی لکھتے ہیں:

"ذہن کے ایک گوشے میں اتنی بات ضرور تھی کہ انکا افسانہ "ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر" ۱۹۱۰ء میں الہ آباد نمائش کے ایک واقعے سے متاثر ہو کر لکھا گیا

۱۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگار۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص: ۵

۲۔ نگار پاکستان۔ کراچی بابت جون جولائی ۱۹۶۸ء ص: ۳۲

۳۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص: ۵

تھا۔ نگار پاکستان کے نیاز نمبر کو دیکھا تو خیال درست نکلا اور اس سے یہ سراغ لگ گیا کہ جنوری ۱۹۱۳ء کے نقاد میں شائع ہوا ہے نقاد کی فائل خود فرمان صاحب کے پاس تھی اس لئے افسانہ بھی مل گیا۔ جب تصدیق کرنے لگے تو مشکل پیش آئی۔ ''پگڈنڈی'' امرتسر کا سجاد حیدر یلدرم نمبر پر نظر پڑا جس میں پروفیسر احتشام حسین نے نیاز فتح پوری کا طویل انٹرویو شائع کیا تھا۔ نیاز صاحب نے اس انٹرویو میں کہا تھا کہ ''اک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' میرا پہلا افسانہ ہے۔ یہ نگارستان کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھا۔ بعد کے ایڈیشنوں سے نکال دیا گیا۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:

''جن افسانہ نگاروں کی پہلی کہانیاں اگلے صفحات میں دی جارہی ہیں ان میں سے بیشتر کہانیاں درجہ اول کی ہیں اور افسانہ نگار کی ذہنی کیفیات و نفسیات اور کردار و شخصیت کے مطالعہ میں جیسی مدد ان سے ملتی ہے کسی اور ذریعے سے نہیں ملتی۔'' (۲)

اس مجموعہ میں نیاز فتح پوری، حکیم احمد شجاع، پطرس بخاری، مجنوں گورکھپوری، ممتاز مفتی، غلام عباس، احمد علی، سعادت حسن منٹو، حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، شوکت تھانوی، مرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، سید انور، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، ابراہیم جلیس، انتظار حسین، انور عنایت اللہ، بانو قدسیہ، حمید کاشمیری، امراؤ طارق، منیر احمد شیخ اور احمد ہمیش کے اولین افسانے شائع کئے گئے ہیں۔ اور ہر ایک افسانہ نگار کے بارے میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار جنوری ۱۹۸۲ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کی تھی اور ہندوستان میں پہلی بار اگست ۱۹۸۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔

اس مجموعہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو افسانہ سمت و رفتار کی روشنی میں بھی سیر حاصل جائزہ پیش

۱۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص: ۶

۲۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص: ۶

کیا ہے۔

دَورِاوّل	۱۹۰۰ء تا ۱۹۳۰ء
دوردوم	۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء
دورسوم	۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء
دورچہارم	۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء

ڈاکٹرفرمان صاحب نے لکھا:

''کچھ دنوں پہلے تک عام طور پر خیال کیاجاتا تھا کہ اردو میں مختصر افسانے کے بانی منشی پریم چند ہیں اوران کاافسانہ''انمول رتن''(مطبوعہ زمانہ ۱۹۰۷ء) اردو کا پہلا افسانہ ہے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ جدید ادبی تحقیق، افسانہ اورناول دونوں کی روایت کوکئی سال پیچھے لے گئی ہے۔اب بعض کے نزدیک اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیراحمد نہیں،صاحب طبقات الشعراءکریم الدین ہیں۔ (اردو کا پہلا ناول، خط تقدیر مرتبہ ڈاکٹرمحمود الٰہی مطبوعہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۶ء)اور پہلا ناول مراۃ العروس نہیں،خط تقدیر ہے۔ مانا کہ اس بات میں بحث کی گنجائش نکلتی ہے۔لیکن یہ بات تو شک وشبہ سے بالاتر ہوگئی ہے کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار، پریم چند نہیں،سجاد حیدر یلدرم ہیں اور اردو کا پہلا افسانہ پریم چند کا''انمول رتن''نہیں بلکہ یلدرم کا''نشہ کی پہلی ترنگ'' ہے۔ اس لئے کہ خود پریم چند کے بیان کے مطابق ان کا پہلا افسانہ''زمانہ'' ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا ہے لیکن اس سے سات سال پہلے یلدرم کا افسانہ''معارف''علی گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۰۰ء میں موجود ہے۔''(مقدمہ خیالستان مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مطبوعہ تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور ۱۹۷۶ء)(۱)

پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری ایک ہی زمانے سے شروع ہوتی ہے اس میں بھی اختلاف

۱۔اردو کاافسانوی ادب ۔ازڈاکٹرفرمان فتح پوری۔مطبوعہ لاہور۔۱۹۸۸ءص:۱۲۲

ہے کچھ کا کہنا ہے کہ پہلے افسانہ نگار یلدرم ہیں کچھ کا خیال ہے پریم چند کا پہلا افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن ہے اور یہیں سے افسانہ نگاری کی ابتداء ہوئی احتشام حسین لکھتے ہیں:

''پریم چندر کا جو پہلا افسانہ ملا ہے، وہ ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا ملا ہے عنوان ہے''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اور انہوں نے افسانے کو اپنی بعد کی تحریروں میں خود بھی اپنا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔''(۱)

اس اعتبار سے اردو افسانے کی عمر اس وقت پورے اسی سال بنتی ہے اب تو اردو افسانے کی عمر ۱۰۲ سال ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے منشی پریم چند کے بارے میں لکھا:

''پریم چند اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہیں اور ان کا نام اردو افسانہ کی تاریخ میں ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری پریم چندر کے متعلق لکھتے ہیں:

''پریم چند ہمارے ادب کے کتنے اہم فکشن نگار ہیں۔ ان پر گزشتہ دس برسوں میں بطور خاص کام ہوا ہے۔ سیکڑوں مقالات لکھے گئے ہیں۔ اور درجنوں کتابیں وجود میں آئی ہیں۔ گویا پریم چند نے اپنے فکشن کے قارئین کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی کے ادیبوں، ناقدوں اور محققوں کو بھی اپنی جانب پوری طرح متوجہ کیا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار پاکستان کے ذریعے پریم چند سے متعلق کتاب نما کا خصوصی شمارہ جون ۱۹۸۱ء کو نگار میں جگہ دے کر ہندوستان میں چھپنے والے اہم مضامین و مقالات کو نگار پاکستان کے قارئین کی نظر کیا ہے۔

۱۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۱ء ص:۲۶

۲۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۵ء ملاحظات ص:۷

۳۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۵ء ملاحظات ص:۷

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اس کام کے خالق و مرتب اردو ادب کے ممتاز محقق و ادیب جناب عبدالقوی دسنوی ہیں۔ ان کا یہ کام ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی کے خصوصی شمارے کے طور پر پہلی بار جون ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق یہ مختصر سا رسالہ میری نظر میں بہت قیمتی ہے اس میں وہ سب کچھ سمو دیا گیا ہے جو پریم چند کے سلسلے میں پچھلے چند برسوں میں لکھا گیا ہے اور بہت اہم ہیں۔ اتنا اہم کہ اس کو نظر میں رکھے بغیر کوئی شخص پریم چند کو جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔''(۱)

اس خصوصی نمبر کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

ملاحظات، حیات نامہ پریم چند، تصانیف پریم چند، پریم چند پر رسائل کے چار نمبر، پریم چند سے متعلق کتابیں، پریم چند کے مطالعے کے لئے بعض اہم کتابیں، پریم چند پر مقالات، پریم چند پر مقالات (ضمیمہ) پریم چند پر تحقیقی کام، نقد پارے۔ زمانہ کانپور کی چند اہم خبریں۔

ظاہر ہے کہ ۱۹۸۱ء کے بعد جو تحقیقی و تنقیدی کام پریم چند کی بابت اردو اور ہندی میں ہوا ہے اس کا ذکر اس شمارہ میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے نگار پاکستان میں جناب عبدالقوی دسنوی کی مرتب کی ہوئی ''اشاریہ پریم چند دوبارہ شائع کر کے ادب کی زبردست خدمت کی ہے۔

نامور نقاد مظہر امام نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اردو اولین افسانہ نگاروں کی تثلیث سجاد حیدر یلدرم، علی محمود اور پریم چند سے ملتی ہے۔

مظہر امام اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''نئی تحقیق نے سجاد حیدر یلدرم کی تحریر ''نشے کی پہلی ترنگ'' مطبوعہ معارف علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو ان کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ یلدرم کے مجموعے ''خیالستان'' لاہور ایڈیشن (۱۹۷۶ء) کے مرتب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

۱۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۵ء ملاحظات ص: ۸

نے اپنے مقدمے میں یہ دادِ تحقیق دی ہے اور اس کی تائید ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب ''اردو افسانہ اور افسانہ نگاری'' میں کی ہے۔''(۱)

منٹو کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ان کے متعدد افسانوں مثلاً دھواں، کالی شلوار، بو، کھول دو، اوپر نیچے اور ٹھنڈا گوشت پر عریانی اور فحش نگاری کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ طرح طرح سے رسوا کرنے اور ذہنی اذیت پہونچانے کی کوشش کی گئی لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ منٹو کو کسی محاذ پر شکست نہیں ہوئی۔ البتہ ان کے حریفوں اور مخالفوں نے منہ کی کھائی۔ بات یہ ہے کہ منٹو جیسے کھرے، سچے، نڈر، حقیقت نگار اور انقلاب پسند افسانہ نگار تھا آج بھی ہے اور کل بھی اس کی حیثیت میں فرق نہ آئے گا۔''(۲)

منٹو نے اپنی زندگی کا آغاز ترجموں سے کیا تھا اور یہ ترجمے ان کے طبع زاد مجموعوں سے پہلے شائع ہوئے ان کے اولین طبع زاد افسانہ کی بابت ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ جیسا کہ ان کے قریبی دوست ابوسعید قریشی کے بیان اور دوسرے قرائن سے پتہ چلتا ہے ''تماشہ'' ہے تماشہ پہلے پہل امرتسر کے ہفت روزہ ''خلق'' میں ''آدم'' کے فرضی نام سے پھر ''عالمگیر'' میں چھپا تھا بعد کو یہ منٹو کے مجموعے ''آتش پارے میں شامل ہوا عام طور پر لکھا گیا ہے کہ منٹو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منٹو کے افسانے ہیں اور یہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے ہمارے پیش نظر منٹو کے افسانوں کا مجموعہ ''آتش پارے'' ہیں اسے اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے مجتبیٰ پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا ہے اسمیں ناشر کی طرف سے باقاعدہ سن

۱۔ ماہنامہ آجکل فروری ۲۰۰۵ء دہلی ص:۲۱

۲۔ اردو کا افسانوی ادب۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء ص:۱۲۵

اشاعت تو نہیں دیا گیا ہے لیکن منٹو کا بہت مختصر سا دیباچہ تاریخ کے ساتھ ملتا ہے۔"(۱)

امراؤ طارق کی افسانہ نگاری اور افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"انکی کیفیت ان پھولوں کی سی نہیں جو شاخ سے قبل از وقت توڑ کر مصنوعی طریقوں سے ذرا دیر میں پکا لئے جاتے ہیں یا ادھ گدرے ہی فروخت کے لئے بازار میں آجاتے ہیں۔ بلکہ ان افسانوں کی تخلیقی نوعیت، ان خوش رنگ اور رسدار پھولوں جیسی ہے جو اپنی ڈالی ہی میں فطری انداز میں آہستہ آہستہ پکتے رہتے ہیں اور پھر ایک اک کر کے رنگ اور مٹھاس کی جملہ لطافتوں اور لذتوں کے ساتھ اچانک ٹپک پڑتے ہیں۔"(۲)

واقعی امراؤ طارق کے افسانوں میں بے پناہ سچائی اور دلکشی ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری "بیشتر افسانوی کی معنوی سطح ایک طرح کی کشادگی، روشنی اور ترسیلی قوت کا مظہر بن گئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب محمد منشا یاد کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آج محمد منشا یاد کو صف اول کا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اسکے افسانے عام و خاص دونوں حلقوں میں بڑے چاؤ سے پڑھے جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسنے اپنے افسانوں میں ایسا جادو پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پڑھوائے بغیر نہیں رہتے۔ ایسا ہونا امر فطری ہے کہ بقول منشا یاد وہ افسانے اپنے طور پر نہیں لکھتا بلکہ افسانے اپنے آپ کو اس سے زبردستی لکھواتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو افسانے خود کو لکھوانے پر قادر ہیں وہ خود کو بہت آسانی سے پڑھوا بھی سکتے ہیں۔ چنانچہ نئے لکھنے والوں میں محمد منشا یاد ایک ایسا افسانہ نگار ہے جسے اپنے آپ سے سینئر افسانہ نگاروں جیسا

۱۔ اردو کا افسانوی ادب۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء ص:۱۲۵

۲۔ اردو کا افسانوی ادب۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء ص:۱۶۵ و ۱۶۶

قبول عام حاصل ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو افسانہ اور افسانہ نگاری میں پطرس کا مختصر اُسوانحی خاکہ اور پطرس کا مضمون "سویرے جوکل آنکھ میری کھلی" شامل کیا ہے۔ پطرس کے مضامین کے متعلق لکھتے ہیں:

"پطرس کے مضامین" اردو کے خالص مزاحیہ ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ پطرس کو چھوٹے چھوٹے معنی خیز فقروں، روزمرہ کی معاشرتی روایتوں، ہلکی پھلکی عبارتوں اور واقعات کے سی ایک جز کی تفصیل کی مدد سے مزاح پیدا کردینے کا عجیب وغریب ملکہ ہے۔"(۲)

اردو کا افسانوی ادب یعنی فکشن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب اردو کا افسانوی ادب ۱۹۸۸ء میں لاہور سے شائع ہوئی اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان صاحب نے داستان اور داستانیں، رانی کیتکی کی کہانی اور انشاء اللہ خاں، اردو کا ایک اہم ڈرامہ نگار، حافظ محمد عبداللہ اور اردو میں منظوم ڈرامائی افسانوں کا آغاز وارتقاء، ناول کا فن اور امراؤ جان ادا کا پس منظر ومنظر، امراؤ جان ادا کے مکالمے اور کردار شامل ہے۔

افسانے کے متعلق اردو افسانے کا ارتقائی سفر، اردو افسانہ اور اسکی تنقید، اردو افسانہ کے جدید رجحانات، کیا اردو افسانہ روبہ زوال ہے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی اور علامتی افسانہ، بدن کا طواف ایک مطالعہ محمد منشایاد ایک منفرد فنکار، ایک گاؤں کی کہانی، میرین ظر میں رضوان صدیقی کا افسانوی مجموعہ ہے رضوان صدیقی کے افسانے روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ محبوب مہتاب چنا کے افسانے کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہی نہیں مغرب کی شاہکار نظموں میں فسانوی عناصر پر قلم اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب آگے چل کر اسی کتاب میں ناول کا فن اور امراؤ جان ادا کا پس منظر ومنظر اور امراؤ جان ادا کے مکالمے اور کردار پر قلم اٹھایا ہے۔ اس مضمون میں اردو ناول اور مرزا رسوا، ناول کا فن، پلاٹ، مکالمہ، کردار نگاری دائرہ عمل، فلسفہ حیات، اسلاب، رسوا کی شخصیت اور زندگی، مرزا رسوا کا عہد اور ماحول،

۱۔ اردو کا افسانوی ادب۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء ص:۱۷۱، ۱۷۲

۲۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۸۲ء ص:۵۳

مرزا رسوا کی ناول نگاری، ناول کے فن کے بارے میں رسوا کے نقطہ نظر امراؤ جان ادا فرضی کردار ہے یا حقیقی، امراؤ جان ادا کا موضوع، امراؤ جان ادا کا پلاٹ اور اس کی جامعیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ امراؤ جان ادا فرضی کردار ہے یا حقیقی کے متعلق ڈاکٹر فرمان صاحب وثوق سے کوئی بات نہیں کہتے دلائل سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق امراؤ جان ادا کے مکالمے اور کردار میں ازلی رشتہ ہے ہمیشہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اس مضمون میں امراؤ جان ادا کے کرداروں کی نوعیت وخصوصیت، امراؤ جان بحیثیت کردار، خانم جان، بوا حسینی اور بسم اللہ خان، نواب سلطان مرزا، فیض علی فیضی، گوہر مرزا، جزئیات نگاری اور منظر کشی پر تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

امراؤ جان ادا کو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک ممتاز ومنفرد مقام حاصل ہے۔

خودنوشت اور تنقید خودنوشت

اردو شعراء کی خودنوش اور سوانح عمریاں کے متعلق فرمان صاحب کی یہ مرتب کردہ کتاب ''خودنوشت اور تنقید خودنوشت'' ۱۹۹۸ء میں وقار پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور امراؤ طارق ہیں جس کا دیباچہ امراؤ طارق نے لکھا ہے اس کتاب میں اکتیس شعراء کی خودنوشت اور سوانح عمریاں اور چھ ناقدوں کے تنقیدی تبصرے شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب بزم نگار میں لکھتے ہیں:

> ''انتخاب کے ساتھ حالات بھی آپ کو نظر آئیں گے اور یہ بھی سب خود شعراء کے فراہم کئے ہوئے ہیں، خواہ انہوں نے خود اپنی طرف سے انہیں لکھا ہو یا دوسرے کی طرف سے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب بزم نگار میں لکھنؤ اسکول کے ایک بڑے شاعر جلیل مانک پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

ا۔ خودنوشت اور تنقید خودنوشت۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء ص: ۸

''فصاحت جنگ حضرت جلیل مانک پوری آپ امیر مینائی کے شاگرد و جانشین ہیں اور ایسے شاگرد و جانشین کہ اگر آج امیر زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزل گوئی سے دستبردار ہوجاتے۔ جناب جلیل کے یہاں سلاست بیان کا یہ عالم ہے گویا ایک بزم وسبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جارہا ہے، ان کا لکھنوی رنگ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اس قدر دل نشین ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے۔''(۱)

اس کتاب میں خاص طور پر لکھنوی شعراء جن میں، آرزو، ثاقب، اثر ناطق اور جلیل کی سوانح نگاری اور انتخاب کلام کو پیش کیا ہے۔ اسکے علاوہ عبدالباری آسی کی خودنوشت اور انتخاب کلام ہے۔ اثر لکھنوی، مرزا جعفر علی خاں، نام اثر لکھنوی کے خاندانی حالات کا جائزہ اور اثر صاحب کا انتخاب کلام، احسان دانش، علی اختر اکتر، اختر شیرانی، امید امیٹھوی کی خودنوشت اور انتخاب کلام کو پیش کیا ہے۔ دہلوی اسکول کے شاعروں میں بیخود دہلوی، پنڈت امرناتھ، پنڈت دتاتر کیفی، حسرت موہانی، نوح ناروی، آزاد انصاری کی خودنوشت اور سوانح عمریاں اور کلام انتخاب پیش کیا ہے۔ دہلوی لکھنوی شعراء کے بعد وحشت، ناطق گلاؤٹھوی، تاجور نجیب آبادی کی غزلوں کا خوبصورت انتخاب ہے سیماب اکبر آبادی کا شمار دہلوی اسکول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ سیماب کی شاعری کا آغاز غزلوں سے ہوا اور ان کے اشعار کا انتخاب بھی خوب ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب فانؔی کی شاعری کی خصوصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''فانی کی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ ہم اس سے ان کی زندگی کا پورا پورا حال معلوم کر سکتے ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری انتخاب جگر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جگر خالص غزل گو شاعر ہیں اور ان کی یہ خصوصیت مجھے بہت عزیز

۱۔ خودنوشت اور تنقید خودنوشت۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء ص:۱۳

۲۔ خودنوشت اور تنقید خودنوشت۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء ص:۱۶

ہے۔ وہ غزل کے لئے پیدا ہوئے اور انہوں نے بیشتر غزل ہی کہی۔ ان کے یہاں رنگینی، سوز و گداز، جوش ولولہ تغیر وفتادگی بیخودگی، سرشاری سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور اس قدر توازن کے ساتھ کے ہر شعر کانٹے کی تلی ہوئی چیز معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کا انتخاب مجموعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کیا بلکہ جو اشعار بے اختیار انکی زبان پر آتے گئے انہیں کو قلمبند کرلیا اور اسمیں شک نہیں کہ اس سے بہتر انتخاب ان کے کلام کا ہو بھی نہ سکتا تھا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب ان تمام غزل گو شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور ان کی خودنوشت اور انکے انتخاب اشعار کی خصوصیت پر نظر ڈالی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب فراؔق کی شاعری کے متعلق اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''فراؔق ایک نقاد شاعر ہیں اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا، زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیٰحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ فراق کی شاعری پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''(۲)

اس کے علاوہ اور بھی دیگر شعراء جو شروع میں غزل کی طرف مائل تھے بعد میں نظمیں کہنی شروع کی، ان میں حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، انند نرائن ملا، تلوک چند محروم، یگانہ چنگیزی، افسر میرٹھی، احسان دانش دل شاہجہانپوری، روش صدیقی وغیرہ کی غزلوں میں نظموں کی چھاپ نظر آتی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں فراق گورکھپوری کے خودنوشت کا رنگ تغزل پر مضمون پیش کیا ہے جس میں اردو غزل کا آغاز اور ہندوستان میں اسکی داغ بیل پر بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو غزل کا اغاز ایک صدی تک اس کا نشوونما ہماری زندگی کے

۱۔ خودنوشت اور تنقید خودنوشت۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء ص:۱۶

۲۔ خودنوشت اور تنقید خودنوشت۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء ص:۱۶

انحطاطی دور کی یادگار ہے۔ جب ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بابر و اکبر کے زمانے میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کی سی عشقیہ شاعری ممکن نہ تھی، شیکسپیئر اپنی قوم کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کی شہرت کا راز اس کی المیہ تمثیلوں ہی میں پوشیدہ ہے۔''(۱)

انہوں نے ذوقؔ، میرؔ و غالبؔ، مومنؔ کی شاعری کا جائزہ بھی پیش کیا ہے جبکہ لکھنؤ کی شاعری میں انشاءؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، ناسخؔ، یاسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، سیمابؔ، اثرؔ، یگانہؔ، جگرؔ وغیرہ کی غزلوں کا تغزل ان شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے۔

بزم نگار میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے شعرائے متغزلین اور انکی غزلوں پر بحث کی ہے کلیم الدین احمد کا خیال ہے۔''غزل بھی ایک نیم وحشی صنف ادب ہے۔'' جو مشرقی و مغربی ادبوں میں پائی جاتی ہے۔ غزل اور شعر کو نیم وحشی صنف شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور بزم نگار میں اشعار کا انتخاب ہے. جس میں جلیل، جگر اور فراق کے انتخاب کو اچھا قرار دیا ہے۔

احسان دانشؔ، علی اختر اخترؔ، اختر شیرانی، جوشؔ ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، افسر میرٹھی، آنند نرائن ملا، روش صدیقی، سیماب اکبرآبادی کی شاعری پر بحث کی ہے جو اردو غزل میں نئی وسعتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

کیفی، ناطق گلاؤٹھوی، امید امیٹھوی، دل شاہجہانپوری، آسی، تاجور، بیخود، ساحر، سیماب، وحشت، یگانہ کے رنگ تغزل کو ان کے اشعار میں پیش کیا ہے۔ حسرت، فانی اور فراق کی شاعری میں غزل کا عنصر نظر آتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور کا تبصرہ جو نگار کے خاص نمبر جنوری ۱۹۴۱ء میں اس دور میں غزل گو شعراء کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہی نہیں شعراء کی سب سے محبوب صنف غزل پر تفصیلی گفتگو کی ہے ولی سے لے کر غالب تک غزل ایک محبوب صنف بن گئی ہے۔

۱۔ خود نوشت اور تنقید خود نوشت۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء ص: ۲۲۰

پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اپنے خودنوشت غزل اور عصر جدید میں اردو شاعری کے نئے میلانات کا ذکر کیا ہے۔

عصر جدید میں غزل کی نئی وسعتیں اور نئے میلانات کو اردو شاعری میں تغزل کے سانچے میں ڈال کر مدلل بحث کی ہے۔ جس میں شعراء کے انتخاب میں حسرت کے انتخاب کلام کا جائزہ لیا ہے۔

اردو غزل کو نئی سمتوں سے آشنا کرنے میں عزیز، محشر صفی، ثاقب، بیخود، نوح، جلیل، دل شاہجہانپوری، امرناتھ ساحر، داتریا کیفی، وحشت کلکتوی، عبدالباری آسی، مرزا ظفر علی خاں اثر، سیماب اکبرآبادی، فانی، جگر، جوش، علی اختر، افسر میرٹھی، یاس اور فراق کی غزلوں کا جائزہ اور انتخاب پیش کیا ہے اور آخر میں نیاز فتح پوری کا تلخیص وتبصرہ جو جنوری ۱۹۴۲ء کے نگار کا خاص نمبر تبصرہ کے لئے مخصوص کیا تھا جس میں پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر احمد کی آراء، کو یکجا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۱ء کے نگار نمبر میں معاصر شعراء کی خودنوشت سوانح عمریاں اور انتخاب کلام شائع ہو چکا ہے۔ ان چاروں ناقدوں کی آراء کو ایک ساتھ ہر شاعر کے متعلق ان کا تبصرہ پیش کیا ہے۔

میؔر کو سمجھنے کے لئے

ڈاکٹر فرمان صاحب کی کتاب میر کو سمجھنے کے لئے ۱۹۹۹ء میں کراچی سے شائع ہوئی جو تفہیم میؔر اور ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی یہ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

مطالعہ میؔر کے بنیادی ماخوذ، میؔر، بحیثیت تذکرہ نگار، میؔر اپنی مثنویات کی روشنی میں، میؔر کا عشق اور انکی عشقیہ شاعری، میؔر کے مختصر سوانحی کوائف، مقدمہ کلیات میؔر مرتبہ عبدالباری آسی کو شامل کیا ہے۔

اس کتاب سے پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک مضمون نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۹ء میں ''میر کو سمجھنے کے لئے'' لکھے تھے۔

ڈاکٹر صاحب میؔر شناسی کے متعلق لکھتے ہیں:

''میؔر کے بارے میں وثوق سے کچھ جاننے اور ان کے فکر وفن کے بارے میں رائے قائم کرنے کے بنیادی آخذ صرف چند ہیں، ان میں کلیات

میرؔ، نکات الشعراء اور ذکر میر کو اولیت حاصل ہے۔ بعدۂ محمد حسین آزاد کی آب حیات سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک جتنی تحریریں مشمولہ دہلی کالج میگزین میرؔ تقی میر نمبر اور ''نقوش'' لاہور میر تقی میرؔ نمبر سامنے آئے ہیں۔ ان میں اردو شعراء کے قدیم تذکروں کے بعد صرف دو ''مقدمہ کلیات میر'' از عبدالباری آسی بطور نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء اور میر تقی میر، حیات اور شاعری از خواجہ احمد فاروقی انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۵۴ء ایسے مآخذ ہیں جنہیں بنیادی کہا جاسکتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاب کہتے ہیں میرؔ کی سیرت اور شخصیت اور کلام کو سمجھنے کے لئے جہاں انکی غزلیات کا مطالعہ کرنا چاہئے، وہاں انکی مثنویات اور تذکروں یعنی نکات الشعراء اور ذکر میر کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے بلکہ اولاً انہیں پر بھرپور توجہ دینی چاہئے اور ان کے مطالعے کی روشنی میں میر کی عشقیہ شاعری کو بھی جانچنا پرکھنا چاہئے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے میرؔ کی مثنویوں کی ایک بات پر بہت زور دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان کی تین مثنویوں میں یہ تفصیلات اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ تنہا ایک مثنوی نفس معاملہ کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دیتی لیکن ان تینوں کو بیک وقت نظر میں رکھیں تو ان کے معاشقے کے سلسلے اور انکے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔''(۲)

مزید لکھتے ہیں:

''اس امر کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میرؔ کو پہلے پہل نظر ملانے کا موقع کن حالات میں ملا۔ آغاز عشق کا پس منظر کیا تھا لیکن معاملات عشق کے ابتدائی اشعار سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ابتدأ محبوبہ میرؔ سے پردہ کرتی تھی یا کم از کم بے حجابانہ سامنے نہ آتی تھی۔ میر صاحب صرف محبوبہ کی آواز اور اس کے

۱۔ میرؔ کو سمجھنے کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۹۹ء ص:۱۲

۲۔ میرؔ کو سمجھنے کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۹۹ء ص:۱۲

اوصاف سنکر در پردہ اس پر عاشق ہو گئے تھے۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب میر کے معاشقے کے متعلق لکھتے ہیں:

"اگر یہ صحیح ہے تو میر کے معاشقے کا آغاز اکبر آباد میں نہیں بلکہ دہلی میں ہوا ہوگا۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۷۳۹ء میں دہلی گئے تھے اور صمصام الدولہ امیر الامراء کے دربار سے ایک روپیہ روز مقرر کیا گیا۔ یہاں اس وقت ان کے ماموں سراج الدین علی خاں بھی موجود تھے۔ اس وقت میر کا سن پندرہ سال کا تھا اس لئے گمان ہوتا ہے کہ جوانی پہلے پہل دہلی میں دیوانے پن کا شکار ہوگئی اسی سال ۱۷۳۹ء ہی میں دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ نفسی نفسی کی پکار ہونے لگی اور دہلی خالی ہونے لگی۔"(۲)

مندرجہ بالا سطور سے قیاس ہوتا ہے کہ میر خان آرزو کی بیٹی کے دام محبت میں گرفتار تھے۔ مگر اس راز کو فاش نہ کیا۔ میر نے اپنے عشق کا بیان اپنی تین مثنویوں موسوم بہ معاملات عشق، جوش عشق اور خواب وخیال میں کیا ہے۔

میر کی مثنوی جوش عشق کے اشعار سے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

ابتدا میں تو رہی صحبت نام سے انکے تھی مجھے الفت

خوبی ان کی جو سب کہا کرتے گوش میرے ادھر رہا کرتے

ایک صاحب سے جی لگا میرا انکے عشوؤں نے دل ٹھگا میرا

میر کے معاشقے کا اندازہ اس اشعار سے ہوتا ہے کہ میر اپنی محبوبہ کے بہت قریب رہتے تھے مگر بیچ میں ایک پردہ حائل رہتا تھا۔

فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون "میر کو سمجھنے کے لئے" میں لکھا ہے:

"میر کے یہاں البتہ عشق اور صرف عشق کی سحر کاریوں کا ذکر ہے اور اسی

۱۔ میر کو سمجھنے کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۹۹ء ص:۱۳

۲۔ میر کو سمجھنے کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۹۹ء ص:۱۳

مفہوم و زبان میں ہے جس سے عام و خاص پوری طرح آشنا ہیں۔ میرؔ کا عشق
سو فیصد سچا، کھرا اور کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ میرؔ اپنی داستانِ عشق سناتے ہوئے نہ
جھجکتے ہیں نہ جھوٹ بولتے ہیں، نہ تصنع سے کام لیتے ہیں اور نہ شرماتے ہیں۔
محبت اور معاملات محبت کی ایک ایک چال خواہ بانکی ہو یا ٹیڑھی ترچھی میرؔ کو عزیز
ہے اور اسکے اظہار میں اپنی روش خاص کے سبب وہ بھی بحیثیت شاعر ہر دلعزیز
ہیں لیکن یہ جاننے کے لئے کہ میرؔ کے عشق کی اصل نوعیت کیا ہے اور اس میں
غیر معمولی شدت و کشش کے آثار کہاں سے آئے ہیں ان کی غزلوں سے
پہلے ان کی سوانح حیات اور مثنویوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔''(۱)

اس شمارہ میں فرمان صاحب نے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے انتخاب میر کا جائزہ لیا ہے فرمان صاحب نے کہا کہ سائنسداں اور علم کیمیا کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت کچھ ہیں۔ سلیم الزماں صدیقی فی الواقع دل گداختہ کے مالک ہیں شخصیت میں حسن، دراصل دل گداختہ ہی سے جنم لیتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب سلیم الزماں صدیقی کے انتخاب میر کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس انتخاب میں کلام میرؔ کے سارے محاسن اس طرح سمٹ آئے ہیں
کہ قاری کو کلیات میرؔ سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''مثنویوں میں بیاں کردہ میرؔ کی یہ عشقیہ رودادیں ان کی عاشقانہ غزل
کے مطالعے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے میرؔ کا عشق اور ان کی عشقیہ شاعری اور انکے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرؔ کی عشقیہ شاعری کے جن رموز نکات کا ذکر اجمال کے ساتھ کیا گیا،

۱۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۹ء ص:۱۴
۲۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۹ء ص:۵
۳۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۹ء ص:۴۷

وہی میرؔ اور میرؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں اور انہیں کی بدولت انہیں اپنے عہد سے لے کر آج تک غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے۔''(۱)

جس طرح ڈاکٹر صاحب غالبؔ و اقبالؔ اور انیسؔ و حسرتؔ پر اپنی تحریریں اردو ادب کے قارئین تک پہونچایا ہے اسی سلسلے کی فرمان صاحب کی یہ کتاب پڑھنے سے میرؔ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

میر تقی میرؔ پر بہت سی کتابیں مضامین لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ ان کتابوں اور مقالوں کے ہونے کے باوجود فرمان صاحب اپنی ادبی سفر میں ایک لمبے عرصے کے بعد اس طرف نگاہ دوڑائی تو انہیں اس سلسلے میں کھلا نظر آیا اور عمر کے آخری حصے میں میر پر قلم اٹھایا حالانکہ ان کا مطالعہ میرؔ کی وسعت ان کی کتاب اردو کی منظوم داستانیں اور دیگر کتابوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اردو دوہا نگاری پر ایک نظر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت نقاد ہر صنف سخن میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ نگار جون ۱۹۹۰ء کو اردو شاعری میں دوہے کی روایت کے لئے وقف کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو میں دوہا نگاری کی صنف کو عالی کی دوہا نگاری اور دوہا خوانی کے بارے میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو دوہا نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو میں دوہے کا رواج نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ سندھی، پنجابی، برج، کھڑی بولی اور اودھی وغیرہ کی طرح اردو میں بھی دوہے کے نمونے ابتدائی دور ہی سے ملتے ہیں۔ ہر چند کہ قدیم دوہا قدیم دکنی کی طرح عربی و فارسی سے قدرے دور اور پراکرت اور اپ بھرنس کے زیر اثر سنسکرت سے قریب تر نظر آتا ہے لیکن اسے سنسکرت سے ماخوذ یا اس کی شعری روایت کی ایک شاخ سمجھنا غلطی ہوگی۔ سنسکرت میں دوہے کا وجود نہیں ہے۔ دوہا سنسکرت کے زوال اور مسلمانوں کی آمد کے بعد برعظیم کی مختلف زبانوں میں

۱۔ میرؔ کو سمجھنے کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۹۹ء ص: ۱۵۵

نظر آتا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

"دوہا نگاری دنیائے شاعری کی مختصر ترین صنف ہے اور شاید اس لئے عاشقانہ جذبات اور اخلاقی اقدار کی ترجمانی کا نہایت کارگر وسیلہ ہے۔ اس وسیلے کو پندرہویں صدی عیسویں کی اکثر زبانوں یعنی سندھی، پنجابی، اودھی اور برج وغیرہ نے اپنایا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے اولین نمونے حضرت امیر خسرؔو اور بوعلی قلندر شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ گویا اردو کے مسلمان صوفی شاعروں ہی نے سب سے پہلے اسے اپنایا ہے اور دوسری زبانوں میں دوہے کی مقبولیت کا آغاز انہیں کے زیر اثر ہوا ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اردو دوہا دراصل جمیل الدین عالؔی کے دوہوں کے بعد ہماری توجہ کا مرکز بنا ہے۔ عالؔی نے صرف یہی نہیں کہ دوہے کو شعوری طور پر اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا بلکہ انہوں نے دوہا پڑھنے کا اک خاص انداز بھی ایجاد کیا یوں کہنا چاہئے کہ دوہا نگاری اور دوہا خوانی نے دوہا کے سلسلے میں وہی کردار ادا کیا جو جگر مرادآبادی نے اس وقت ادا کیا تھا جب جوش اور اقبال کی نظموں کے سامنے غزل کی مقبولیت خطرے میں پڑ گئی تھی اگر چہ اس وقت بھی حسرت فانی، اصغر، یگانہ اور فراق جیسے قدآور غزل گو شعراء موجود تھے۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"جمیل الدین عالی اردو شاعری کی تاریخ میں پہلے شاعر ہیں جنہوں

۱۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۰ء ص: ۶۳

۲۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۰ء ص: ۶۴

۳۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۰ء ص: ۶۴، ۶۵

نے دوہے کی صنف کو رُتبہ اعتبار بخشا اس کی حیثیت کو مستحکم کیا اور قبول عام کے
درجے تک پہونچایا آخر اپنی شناخت کا نشان بھی بنالیا۔" (۱)

اسی مجلّہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون جمیل الدین عالی اور دوہا نگاری شائع ہوا تھا ملک رام، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر مسعود حسین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے مضامین بھی ہیں اور عالؔی کے کلام کا انتخاب بھی شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ عالؔی نے دوہے کو موضوع، ہیئت اور دائرے اثر تینوں اعتبار سے وسیع تر اور دلکش تر بنایا ہے۔

ڈاکٹر گیان چندر پر ڈاکٹر فرمان کی نظر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری خود بلند پایہ محقق اور نقاد ہیں اور دوسرے محققین اور نقاد کے قدرداں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر گیان چندر کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر گیان چندر ایک محقق و نقاد اور عالم زبان و لسانیات کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اردو زبان و ادب کے صاحبان ذوق موجود ہیں ان کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کم وبیش نصف صدی سے لکھ رہے ہیں اور آج بھی ان کا قلم اسی طرح رواں دواں ہے۔ آئندہ کے لئے ان کے ذہن میں کیا کیا منصوبے ہیں اور وہ اردو کے لئے کچھ کرنا چاہئے ہیں اس کا اندازہ ان کی مرتبہ اس فہرست کتب سے ہو سکے گا جس کے لئے نگار کا زیر نظر شارہ وقف کیا گیا ہے۔" (۲)

آپ نے دیکھا کہ ڈاکٹر فرمان صاحب کس کھلے دل سے ڈاکٹر گیان چندر کی کتاب کا تعارف کرایا۔ یہی فرمان صاحب کا اسلوب ہے اور یہی ان کی کشادہ دلی اور حقیقت بیانی کی مثال ہے۔

۱۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۰ء ص: ۶۵

۲۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۹۱ء ملاحظات ص: ۷

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ملاحظات میں لکھتے ہیں:

''اس ماہ کا شمارہ مانک ٹالا صاحب کے شکریہ کے ساتھ پریم چند کی نظر ہے اسے آپ نظر مانک ٹالا بھی کہہ سکتے ہیں۔'' مانک ٹالا صاحب پریم چند پر عالمانہ ومحققانہ قلم اٹھانے سے پہلے تک ایک اچھے افسانہ نگار یعنی تخلیقی فنکار کی حیثیت سے معروف تھے لیکن تین برس کے اندر انہوں نے پریم چند کو موضوع گفتگو بنا کر اپنے آپ کو جس انداز سے ایک محقق وادیب منوالیا ہے وہ قابل تحسین وقابل رشک بھی ہے اور کسی سے ہوسکے تو قابل تقلید بھی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''مانک ٹالا اردو تحقیق کے حوالے سے دو امتیازی نشانات چھوڑے ہیں ایک یہ کہ علم وادب کی دنیا میں مقام اعتبار، مقدار سے نہیں بلکہ صرف ومعیار سے حاصل ہوتا ہے۔ درجنوں کتابیں اور سیکڑوں مقالات لکھ جائے کوئی حاصل نہیں۔ لیکن فکر ونظر کی پوری توجہ کے ساتھ ایک آدھ چیز بھی سنجیدہ قارئین کو دے سکیں تو امر ہوسکتے ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی یا کسی موضوع کی وسعت بھی رتبہ اعتبار کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ البتہ کسی خاص مصنف یا محدود موضوع پر بھی پوری دیانت کے ساتھ کچھ لکھ دیا جائے تو توقیر وتکریم کا باعث بن سکتا ہے۔''(۲)

مجنوں گورکھپوری ڈاکٹر فرمان کی نظر میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری جناب مجنوں گورکھپوری کے بارے میں ''ملاحظات'' میں لکھتے ہیں:

''مجنوں صاحب کئی حوالوں سے میرے ممدوح ومحبوب رہے ہیں۔ ان

۱۔ نگار پاکستان جولائی ۱۹۸۹ء ملاحظات ص:۳

۲۔ نگار پاکستان جولائی ۱۹۸۹ء ملاحظات ص:۳

کے تنقیدی فکر ونظر اوران کی علمی وادبی شخصیت کواسیر تو ''ہم ہوئے، تم ہوئے
کہ میرؔ ہوئے'' سبھی رہے ہیں لیکن اس سطح سے ہٹ کر ذاتی طور پر بھی نئے نئے
اپنے آپ کومجنوں صاحب سے بہت قریب پایا۔ نیاز اور نگار سے ان کی ذہنی
قلبی شخصی قربت کی داستان کسی تفصیل کے محتاج نہیں کہ اسے خود مجنوں صاحب
بارہا بیان کر چکے ہیں۔ فراق اور نیاز نے بھی اپنی تحریروں میں کئی جگہ اس کا
تذکرہ کیا ہے۔ یہ تذکرہ میں نے ان تینوں بزرگوں کی زبان سے سنا بھی اور
پڑھا بھی ہے۔ جذباتی اور ذاتی طور پر ہمیشہ ان کا یوں ممنون انسان رہا کہ
انہوں نے میری تحقیقی وتنقیدی تحریروں کوآج سے پورے تیس سال پہلے درخور
اعتنا جانا جب میں نے انہیں نہ تو کہیں دیکھا تھا، نہ ان سے ملا تھا اور نہ ان سے
کسی طور کا رابطہ مراسلت رکھتا تھا۔''(۱)

اس شمارہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''مجنوں گورکھپوری اور نیاز ونگار'' بھی شامل ہے انہوں نے لکھا ہے:

''مجنوں گورکھپوری عمر وسال اور علم وفضل پر اعتبار سے عہد حاضر کے
بزرگ ترین ادیب ونقاد ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے زندہ ادیبوں
میں سب سے معتبر اور باوقار قلم ان ہی کا ہے۔ اس اعتبار وغار میں، ان کی
وسعت نظر اور توازن فکر کواساسی حیثیت حاصل ہے۔ ان اوصاف کی بدولت
ہماری ادبی تاریخ میں ان کا نام کئی حوالے سے آتا رہے گا لیکن حوالے ایسے ہیں
جو انہیں ہمیشہ ایک ممتاز مقام پر فائز رکھیں گے اور مستقبل کا ادب کسی نہ کسی طور
پر انہیں اپنا ماخذ بنائے رکھے گا۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری فراق ومجنوں کی نیاز فتح پوری سے نیاز مندی کے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۸ء ص:۳

۲۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۸ء ص:۷

''فراق گورکھپوری کی طرح مجنوں گورکھپوری کو بھی جوہر قابل حیثیت سے سب سے پہلے نیاز فتح پوری ہی نے پہچانا انہیں اپنی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا احساس دلایا۔ جبر و اصرار سے لکھوایا اور نگار کے صفحات میں نمایاں جگہ دے کر ان میں خود اعتمادی و خود شناسی صرف یہی نہیں فراق و مجنوں کی شہرت کا باعث بنیں بلکہ آخر نگار میں اہمیت و مقبولیت ایک وسیلہ بن گئی، ان کی مستقل و مسلسل قلمی معاونت کی بدولت نگار کے صفحات مشرق و مغرب کی ادبیات کے ساتھ ساتھ جدید تر علوم وفنون کی تراوش سے مزین ہونے لگے۔ پھر ان دونوں کے زیر اثر جدید ادب کے سارے ممتاز اہل قلم نیاز کے نیاز مندوں میں شامل ہوگئے اور نگار صرف ایک ادبی پرچہ نہ رہا بلکہ حقیقی معنوں میں ایک ادبی تحریک اور ادارہ بن گیا۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے مجنوں گورکھپوری کا سوانح خاکہ بھی اس شمارے میں شائع کیا جو انکا لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اس مضمون میں ایک جگہ نیاز و مجنوں کی قربت کے متعلق لکھتے ہیں:

''مجنوں گورکھپوری طبعاً اور مزاجاً فراق کی بہ نسبت نیاز سے زیادہ قریب تھے۔ مذہب اور اسلامیات سے قطع نظر کہ نیاز نے انہیں بھی عمر بھر اپنائے رکھا، مجنوں کو نیاز کی طرح عربی، فارسی اور ہندی زبان و ثقافت سے گہری دلچسپی اور واقفیت تھی خصوصاً شاعری اور افسانہ سے مجنوں کا وہی تعلق تھا جو نیاز کا۔'' (۲)

اس خاص شمارے میں مجنوں گورکھپوری پر فرمان صاحب کا ایک اور مضمون مجنوں کا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مجنوں گورکھپوری کی تحریروں میں مشرق و مغرب کی رنگوں کا بہت

۱۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۸ء ص: ۷

۲۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۸ء ص: ۱۰

خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ مشرقی علوم، علمی روایات اور تہذیبی اقدار سے
آگاہی، انہیں اپنے گھر اور خاندان سے ورثے میں ملی تھی۔"(۱)

اس کے علاوہ اس شمارہ میں مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی "زندگی" اور مجنوں کا پہلا افسانہ "گہنہ" مصحفی اور ان کی شاعری اور خلش برنی کا مضمون مجنوں گورکھپوری شامل ہیں۔

فیض احمد فیض ڈاکٹر فرمان کی نظر میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فیض احمد فیض کے بارے میں لکھا ہے:

"انکے کلام میں جو غنائیت و موسیقیت ہے وہ ان کی شخصیت ہی کا رس ہے۔ اردو غزل کی روایت میں فیض کی لے سب سے دھیمی لیکن سب سے زیادہ پراثر، معنوی اور منفرد لے ہے۔ اس لے کی پہچان ان مٹ ہے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا۔ ان کے پہچاننے والوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ان کے کلام کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔ ان کی نظموں کا آہنگ محبوب ٹھہرے گا اور ان کے اسلوب غزل کو عصری غزل کے مزاج کا پیمانہ قرار دیا جائے گا۔ آج بھی ہم عصر غزل گو شعراء پر جتنا اثر فیض کے لب و لہجہ کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔"(۲)

نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں "فیض پر ایک گفتگو" کے عنوان سے فکر انگیز مذاکرہ بھی شامل ہے۔ ایک غیر رسمی نشست ۴ر اپریل ۱۹۸۴ء کو فیض صاحب کی سالگرہ کے حوالے سے ہوئی تھی جس میں پروفیسر منظور حسین شور، مرزا ظفر حسن، پروفیسر انجم اعظمی، پروفیسر عتیق احمد، سرشار صدیقی، مسعود احمد برکاتی اور سحر انصاری نے حصہ لیا۔

مدیر نگار ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے سوالات کے ذریعے بحث کو آگے بڑھانے میں مدد کی۔

۱۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۸ء ص: ۷۷

۲۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ملاحظات ص: ۵

پروفیسر شور نے کہا:

''فیض کے یہاں ایک Cosmic نقطہ نظر ملتا ہے۔ مقامی ہوتے ہوئے بھی ان کی فکریں توسیع ذات نظر آتی ہے۔ لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ ساری بیداری کا کام صرف انہوں نے ہی کیا ہے۔''(۱)

پروفیسر انجم اعظمی نے کہا ہے:

''پہلی بات یہ ہے کہ فیض اچھے شاعر ہیں ہمیں تاریخی اعتبار سے لکھنا پڑے گا۔''(۲)

عتیق احمد نے کہا:

''وہ غالب کے بعد چند شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اپنے عہد کو زبان دی ہے وہ زبان جو ہم بولنا چاہتے ہیں کوئی ایسا اہم موڑ ایسا ظلم جبر اور تبدیلی جس میں ہمارے حقوق حذف کئے جا رہے ہوں ایسا نہیں جس پر فیض نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا ہو، ان کا لہجہ عام عاشقانہ لہجے میں وہ ہمارے دل کے اندر اتر جاتے ہیں۔''(۳)

سرشار صدیقی نے کہا:

''یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ تقریر کر رہے ہیں یا سیاسی مضمون لکھ رہے ہیں۔ ہم نے سیاسی سوچ کو شاعرانہ ترسیل کا انداز فیض سے سیکھا ہے۔''(۴)

مسعود احمد برکاتی نے کہا:

''ان کے کلام سے جذبات کو تحریک ملتی ہے۔ جب یہ نہ معلوم ہو کہ یہ

۱۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص: ۵۷

۲۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص: ۵۸

۳۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص: ۵۸

۴۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص: ۵۹

فیض کا شعر ہے۔ ہم گلشن کے کاروبار سے کچھ اور مفہوم بھی لے سکتے ہیں۔"(۱)

سحر انصاری صاحب نے کہا:

"ان کی شاعری قدیم وجدید کا ایک خوبصورت سنگم بن گئی ہے۔"(۲)

نگار پاکستان کے اکتوبر ۱۹۵۵ء کے اس شمارے میں ڈاکٹر فرمان صاحب کے مضمون "فیض نقش فریادی اور دست صبا کی روشنی میں" شامل ہے۔ یہ مضمون رسالہ "افکار" میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ فیض کے یہاں فکروفن میں عملی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"فیض کے یہاں عام شباب کی عشقیہ شاعری میں بھی جنسی محرکات اور عشقیہ واردات اسی تخیل شائستگی کے ساتھ شعر میں سما گئے ہیں جن کی مثالیں اختر شیرانی کی نظموں، حفیظ کے گیتوں اور فراق کے غزلوں کے علاوہ کہیں اور مشکل سے ملیں گے۔ نقش فریادی کے دوسرے حصے میں فیض دل کی دھڑکنوں کے بجائے سماجی زندگی کیا نقلابی آہٹوں پر کان دھرنے لگے ہیں اب وہ دل کی ذاتی کسک اور چوٹ کو سماج کے بڑھتے ہوئے دکھ درد میں بھولتے نظر آتے ہیں۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فیض کی دست صبا اور نقش فریادی کے نمایاں فرق کے متعلق لکھتے ہیں:

"دست صبا" اور "نقش فریادی" میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ نقش فریادی کے مقابلے میں فیض کا لب ولہجہ "دست صبا" میں زیادہ سبک رفتار ہوگیا ہے۔ فیض کے اسلوب میں پہلے بھی نفرت وتعصب کا شائبانہ نہ تھا

۱۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص:۵۷) (نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص:۵۹)

۲۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص:۵۹

۳۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص:۶۹، ۷۰

لیکن اب انکی باتوں میں سوائے محبت اور پیار کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر چہ
وہ سامراج نما ملکی اشتراکیت سے اس قدر نالاں ہیں جس قدر بیرونی
فسطائیت سے۔''(۱)

مولوی عبدالحق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں

مولوی عبدالحق کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:

''بابائے اردو مولوی عبدالحق نے آپ کے مروجہ طرز کے تنقیدی
مضامین بہت کم لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا تقریباً سارا ذخیرہ مقدمات،
خطبات اور تبصرہ پر مشتمل ہے اور ان میں تحقیق و تنقید سے لے کر لغات و
لسانیات کے وہ سارے اہم موضوعات و مسائل زیر بحث آگئے ہیں۔ جو مولوی
صاحب کو ایک عظیم محقق، بلند پایہ نقاد، معتبر نعت نویس اور قابل احترام زبان
شناس بناتے ہیں۔''(۲)

فرمان صاحب نے مولوی عبدالحق کے دو مختصر مجموعوں، ادبی تبصرے اور تنقیدیات عبدالحق کا ذکر کیا ہے اور ادبی تبصرے کو اس شمارے میں نذر قارئین کیا۔ فرمان صاحب نے لکھا اگر کسی وقت اردو میں تبصرہ نگاری کے فن اور اس کے ضوابط و تاریخی ارتقاء پر کوئی مبسوط کام کیا گیا ہے تو مولوی صاحب کے تبصرے نہ صرف یہ کہ اس فن کے رہنما اصولوں کی نشاندہی کریں گے بلکہ ان کے تبصرے بطور مثال بھی پیش کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''عبدالحق صاحب کے تبصروں میں یہ وصف ہر جگہ نظر آتا ہے وہ جس
کتاب پر اظہار خیال کرتے ہیں پوری واقفیت اور خود اعتمادی کے ساتھ کرتے
ہیں، وہ اس کا لحاظ نہیں رکھتے کہ لکھنے والا کون ہے بلکہ ان کی نظریں میں صرف

(نگار پاکستان دسمبر ۱۹۸۴ء ص: ۷۵)
(نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۵ء ص: ۷)

اس بات پر جمی رہتی ہیں کہ اس نے کیا لکھا ہے۔ شہرت اور منصب ان کی نگاہ میں بے وقعت ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ عام طور پر حق گوئی کا متحمل نہیں ہوتا۔ سچ کہنے کی دعوت تو دیتا ہے لیکن سچ کہہ دو تو جانی دشمن ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب تبصرہ کرتے وقت اس قسم کے خدشوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جو بات تعریف کے قابل ہوتی ہے اس کی دل کھول کر داد دیتے ہیں اور جہاں ٹوکنے کی ضرورت ہوتی ہے سختی سے ٹوکتے ہیں۔"(۱)

جوش ملیح آبادی کے نثر و نظم کے مجموعہ روح ادب پر مولوی عبدالحق کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بات کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تبصرے کے متعلق لکھتے ہیں:

"بابائے اردو مولوی عبدالحق نے آج کے مروجہ طرز کے تنقیدی مضامین بہت کم لکھے ہیں ان کی تحریروں کا تقریباً سارا ذخیرہ مقدمات، خطبات اور تبصروں پر مشتمل ہے اور ان میں تحقیق و تنقید سے لے کر نکات ولسانیات کے وہ سارے اہم موضوعات و مسائل زیر بحث آ گئے ہیں جو مولوی صاحب کو ایک عظیم محقق بلند پایہ نقاد، معتبر لغت نویس اور قابل قدر احترام زبان شناس بتاتے ہیں یہ امر باعث طمانیت ہے کہ مولوی صاحب کے مقدمات و خطبات مرتب ہو کر ضروری توضیحات و اشارات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور ان سے استفادہ کی راہیں قارئین پر کھلی ہوئی ہیں۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"مبصر کی ڈالی ہوئی روشنی نہ اتنی تیز ہونی چاہئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور نہ اتنی مدھم کہ نظریں کتاب کے اصل خدوخال کو

۱۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۵ء ص: ۷

۲۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۵ء ص: ۹

دیکھنے سے محروم رہیں لیکن ہمارے یہاں تبصروں میں اس قسم کی اعتدال پسندی
یا حدود کی پابندی عام طور پر نظر نہیں آتی۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کہتے ہیں کہ مبصر کی نظر میں مصنف نہیں بلکہ کتاب ہونی چاہئے۔یعنی تبصرہ کرتے وقت وہ اس بات کا لحاظ نہ رکھیں کہ اس کا مصنف کون ہے بلکہ صرف اس بات پر توجہ مرکوز کرے کہ کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کس نوعیت کا ہے اور اپنے میدان میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔مبصر دیانتدار اور بیباک ہو، جو کچھ کہتا ہو کسی بڑی شخصیت یا اسکے منصب کا لحاظ کئے بغیر بے جھجک کہہ سکتا ہو۔

رشید حسن خاں ڈاکٹر فرمان کی نظر میں

رشید حسن خاں صاحب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:

"اردو کے نامور محقق جناب رشید حسن خان کی مرتبہ اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی مطبوعہ "فسانۂ عجائب" تحقیق وتنقید کے جن لوازم و جزئیات کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے اسے اردو ادب کی دنیائے تحقیق میں مثال بے مثال حاصل ہے۔آپ اسے تحقیق وتدوین کا شاہکار بھی کہہ سکتے ہیں۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری رشید حسن خاں کے متعلق لکھتے ہیں:

"رشید حسن خاں اردو کے ان بیباک اور بے لاگ محققوں میں تھے جن سے ہمارے بہت سے علمائے علم وفن خوفزدہ رہتے ہیں اور انہیں ادبی دہشت گرد کا نام دیتے ہیں میری ناقص رائے میں اگر اردو کو رشید حسن خاں جیسے دو چار علمی و ادبی دہشت گرد مل جائیں تو ہمارے ادب کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اس میں نتھار، نکھار، ستھراؤ اور خالص پن پیدا کر کے تحقیق و تدوین کی روایت کو اتنا موقر و معزز بنایا جاسکتا ہے کہ مغرب والے بھی عش

ا۔نگار پاکستان مارچ ۱۹۸۵ء ص:۱۲

۲۔نگار پاکستان جولائی ۱۹۹۰ء ملاحظات ص:۵

عش کر اٹھیں۔'' (۱)

اس شمارہ میں ڈاکٹر قمر رئیس کا پیش لفظ اور ڈاکٹر خلیق انجم کا دیباچہ شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر محقق و نقاد کے قدرداں ہیں اور ان کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں پھر بھی اگر ضروری ہوا تو ان کے ادبی کارناموں کی خامیوں کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا دیباچہ بہت اہم ہے اس لئے اسے نگار پاکستان میں شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مقدمہ میں فسانۂ عجائب کے نام کے بارے میں بھی خوب لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمود الٰہی نے فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے نام سے کتاب کی جو روایت شائع کی ہے اسمیں نام سے متعلق اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

''خطی نسخے کے متن میں کتاب کے نام کی صراحت نہیں ہاں جہاں کتاب ختم ہوتی ہے اسکے معاًبعد اور ترقیمے سے پہلے ''تمام شد، کتاب فسانہ عجیب'' ملتا ہے یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ مصنف نے پہلے کتاب کا نام فسانہ عجیب رکھا ہو اور اصلاح کے بعد فسانہ عجائب کر دیا ہو۔'' (۲)

جس روایت کو محمود الٰہی صاحب نے بنیادی متن کے عنوان سے شائع کیا ہے اس روایت کا ایک اور خطی نسخہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے پاس تھا۔ دونوں روایتوں میں بعض اہم اختلافات ہیں۔

ڈاکٹر گیان چندر نے ہاشمی صاحب کے خط کی بنیادی پر اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اس کے ترقیمے میں قصے کا نام ''قصے انجمن آرا'' دیا ہے۔ یوں تین نام ہوئے فسانہ عجائب، فسانہ عجیب، قصہ انجمن آراء۔

جیسا کہ محمود الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ فسانہ عجیب شامل متن نہیں اس روایت کے متن میں وہ جملہ ہی موجود نہیں جس میں دیگر نسخوں میں کتاب کا نام آیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نام کا مصنف سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ بہ ظاہر نا قابل کتاب کا اضافہ ہے اس لئے لازماً قابل قبول نہیں۔

ڈاکٹر کلیم الدین احمد کی بابت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:

۱۔ نگار پاکستان جولائی ۱۹۹۰ء ملاحظات ص:۵

۲۔ نگار پاکستان جولائی ۱۹۹۰ء ملاحظات ص:۳۴

''کلیم الدین احمد اردو ادب کے ان بڑے ناقدوں میں ہیں جو ہزار اختلاف کے باوجود اردو زبان ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کی دو ابتدائی کتابوں ''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور دوسری ''اردو تنقید پر ایک نظر'' نے اردو ادب کے بحرِ منجمد میں وہی تلاطم وطوفان پیدا کیا جو کسی وقت مولانا حالی نے ''مقدمہ شعر وشاعری'' کے ذریعے پیدا کیا تھا۔''(۱)

اس شمارے کے آخر میں پروفیسر کلیم الدین احمد کے کوائف درج کیے ہیں۔

ڈاکٹر کلیم الدین احمد اپنے موقف کی وضاحت اس طور پر کی ہے:

''آمد بر سیر مطلب۔ تو غزل نیم وحشی شاعری ہے۔ اس اجمال کی تفصیل میں نے اردو شاعری کے تیسرے ایڈیشن میں کر دی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ جملہ پڑھ کر لوگ ایسا بدک جاتے ہیں کہ وہ آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اس صورت حال کا الزام بھی بر سر غزل ہے غزل نے افتادِ طبیعت ایسی بنادی ہے کہ ایک شعر ایک مصرعہ ایک فقرے پر ہی توجہ مرکوز ہو جاتی ہے اور آگے نہیں بڑھ پاتی۔ لیکن تنقید غزل نہیں، یہاں توجہ کو آگے بڑھانا ہے۔ یہ سوچنا ہے کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے تو کیوں ہے اور نیم وحشی کا کیا مفہوم ہے۔''(۲)

ڈاکٹر کلیم الدین احمد نے اپنے نظریئے کو موثر ڈھنگ سے اپنی تصنیف ''اردو شاعری'' اور پھر خود نوشت میں پیش کی ہے۔

اردو لغت نویسی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ترقی اردو بورڈ کراچی پاکستان کا قیام، مرکزی وزارت تعلیم کی ایک قرارداد کے ذریعے ۱۹۵۸ء میں

۱۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۹۰ء خصوصی شمارہ ملاحظات ص:۴

۲۔ نگار پاکستان مارچ ۱۹۹۰ء خصوصی شمارہ ملاحظات ص:۵

عمل میں آیا تھا جس میں درج تھا کہ ''یہ ادارہ اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین نیز اردو کی ترقی کے سلسلے میں دوسرے ضروری کام انجام دے گا۔ جو حکومت پاکستان اسے تفویض کرے جس کے پہلے مدیر اعلیٰ اردو لغت نگاری کے جید عالم ڈاکٹر مولوی عبدالحق تھے۔ جو زیادہ عرصہ تک کار انجام نہ دے سکے اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مدیر اعلیٰ اور سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۸۴ء تک کام کیا۔

اس کے بعد ۱۹۸۵ء سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت مدیر اعلیٰ اور سکریٹری مقرر ہوئے ڈاکٹر صاحب کے بورڈ میں آنے سے پہلے ابواللیث کی ادارت میں چھ جلدیں شائع ہوچکی تھی۔ اردو لغت بورڈ میں ڈاکٹر صاحب کے آنے کے بعد کام کی رفتار بھی تیز ہوگیا۔

پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون ''اردو لغت نویسی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری'' میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری منصب لغت پر مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اس وقت نمودار ہوتے ہیں۔ جب اس عظیم لغت کی چھ جلدیں مرتب ہوکر شائع ہوچکی تھیں اس سے قبل وہ اردو کے ادیب اور استاد کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکے تھے۔ لیکن لغت نویسی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ زبان اور علم زبان کے بارے میں ان کی وہ واقفیت نہیں تھی جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو حاصل تھی۔ بڑی جسارت کی بات تھی کہ انہوں نے اس میدان میں بھی قدم رکھ دیا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ وہ اس میں بھی اپنی غیر معمولی محنت اور انہماک کی بدولت کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے کمپیوٹر کمپوزنگ کرائی اور ضروری اعراب و نشانات کے ساتھ کتاب کی جلدوں کو شائع کرایا۔ ۲۰۰۷ء تک اس اردو ڈکشنری کی ۲۱ رجلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس ادبی کارنامے کا باریکی کے ساتھ جائزہ لیا ہے لیکن بے لاگ تنقید سے بھی احتراز نہیں کیا لکھتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۵۹

''ڈاکٹر فرمان نے ان اصول وضوابط کا نہایت احتیاط سے خیال رکھا ہے۔ ابتدائی جلدوں میں استقامت کی جانب سے جو سہل انگاری برتی گئی ہے اور پراکرت، ہندی اور سنسکرت کو گڈ مڈ کر دیا گیا ہے اس کی صحت کی جانب بھی ان کی توجہ رہی ہے۔ حالانکہ انہوں نے بھی سنسکرت اشتقاق کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا ہے اور اکثر جگہ صرف پراکرت کی شکل ''پلیٹس'' سے لے کر دے دی ہے۔ اس لئے انہیں براہ راست سنسکرت کی لغات سے رجوع کرنا چاہئے تھا۔''(۱)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''الفاظ کے معنوں کے تعین میں بھی انہوں نے بعض اوقات اس سہل پسندی کو روا رکھا ہے جو لغت کی ابتدائی جلدوں میں ملتی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنی ''جامع اللغات'' جیسی غیر مستند لغت یا پلیٹس جیسی ہندی اردو دونوں لغت کو محیط لغت سے دے کر چھٹکارا پا لیا گیا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اردو لغت نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''لغت نگاری ایک صبر آزما کام ہے۔ جان لیوا بھی۔ کہا جاتا ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کے کئی مدیروں نے اپنی جاں، جان آفریں کے سپرد کر کے یہ کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ لغت نگاری کے لئے بہت بڑے وسائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو لغت کو یہ وسائل کبھی بھی میسر نہیں رہے۔ لغت نویسی ایک پنچایتی کام ہے۔ اس پنچایت کا ہر فرد، اپنی جگہ پر مشین کے ایک پرزے کی طرح کام کرتا ہے۔ کسی بھی مرحلے میں ذرا سی چوک پوری مشین کو پوری کارگذاری پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسی لغت میں لفظ ''فکیر''

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۶۳

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۶۳

کوفکر کا قدیم املا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ املا کا نہیں تلفظ کا ہے۔''(۱)

یہ تحریر ڈاکٹر مسعود حسین نے اس وقت لکھی جب وہ ترقی اردو بیورو (ہند) کی اردو لغت کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لغت کے جلد ہفتم کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''جلد ہفتم ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے ابتدائی چھ جلدوں سے قدرے مختلف ہے۔ ظاہری تبدیلی یہ ہے کہ اسکے صفحات کا انداز خاصا بدلا ہوا ہے۔ بین السطور فاصلہ کم سے کم ہے اور غیر ضروری طور پر کہیں کوئی جگہ خالی نظر نہیں آتی۔ پھر بھی حروف و طباعت پہلے کی بہ نسبت زیادہ نمایاں اور روشن ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ زیر نظر جلد کے دو صفحوں میں پچھلی جلدوں کے تین صفحوں کا مواد سما گیا ہے۔''(۲)

غزل اردو کی شعری روایت

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''غزل اردو کی شعری روایت'' ۱۹۹۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اردو کے ممتاز غزل گو شعراء کے کلام کا بخوبی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس انتخاب میں علامہ اقبال کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو غزل کے سوا کسی دوسری صنف سخن میں کوئی ممتاز حیثیت رکھتا ہو، ولیؔ، دردؔ، میرؔ، غالبؔ، حسرتؔ، جگرؔ، فراقؔ اور مجروحؔ وغیرہ کی شہرت و مقبولیت غزل کے بدولت ہوئی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

''غزل ہر موسم کے خوشگوار اثرات کو اپنے دامن میں لئے آگے بڑھتی رہی ہے اور کچھ ایسی دلفریبی و معنی آفرینی کے ساتھ کسی دور میں بھی اس کی

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۶۵

۲۔ اردو لغت جلد ہفتم مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی پاکستان ۱۹۸۶ء دیباچہ ص: ۴

مقبولیت ومعنویت میں فرق نہیں آیا۔"(۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"غزل ہی ہماری شاعری کا سب سے جاندار اور سب سے قیمتی سرمایہ ہے اس کی بدولت اردو، شاعری میں سچی عظمت و وقعت کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور اسی کی بدولت اردو شاعری اسکے اہل ہوسکتی ہے کہ وہ عالمی سطح پر دوسری زبانوں کے شعری ادب سے آنکھ ملا سکے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب ولی کی غزل گوئی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ولی کے توسط سے دہلی کے فارسی شعراء پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس وقت دہلی میں فارسی شاعروں کا چرچا تھا، اردو کو کم رُتبہ یا حقیر خیال کیا جاتا تھا۔ دہلی کے کلامنے اہل دہلی کے اس نقطہ نگاہ میں تبدیلی پیدا کی اور ولی کے اثر سے شمالی ہند اور دکن دونوں جگہ اردو شاعری میں خصوصاً غزل کا رواج ہوگیا۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے مضمون علامہ اقبال اور اردو غزل میں فکر تازہ کی نمود کے متعلق اقبال کی غزلوں میں بدلتی ہوئی لب ولہجہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"اقبال کی غزلوں میں مختلف مقامات پر شاعر کی حیثیت اس کے خیال اور جذبے کو ایک نئی شکل دیتی ہے اور ہر مقام پر ایک شکل دوسری سے مختلف اور ایک لہجہ دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے۔ غزلوں میں اقبال کے لہجے کی یہ بدلتی ہوئی کیفیت پڑھنے والوں کو کبھی چونکا دیتی ہے اور کبھی حیرت میں ڈال دیتی ہے اور چونک جانے اور حیرت زدہ ہوجانے کی یہ کیفیت کبھی محض الجھن بن کر

۳۔غزل اردو کی شعری روایت از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص:۵

۲۔غزل اردو کی شعری روایت از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص:۵

۱۔غزل اردو کی شعری روایت از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص:۸

رہ جاتی ہے اور کبھی آہستہ آہستہ سرور انبساط کی لہریں بن کر قلب وذہن پر چھا جاتی ہیں۔لیکن لہجے کی جدت اور غرابت کے باوجود پڑھنے والوں کو اس سے مانوس کر لینا اور حد تک مانوس کر لینا کہ وہ پوری طرح اس سے ہم آہنگ ہو کر اس میں ایک فنی انبساط محسوس کریں۔اقبال کے جدید طرز غزل کا سب سے بڑا وصف ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی اس کتاب میں ''فراق کی غزل ایک نیا رنگ و آہنگ'' کے مضمون میں فراق کے کلام کی خصوصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''فراق کے کلام کی بڑی خصوصیت انکے تخیل کی رنگارنگی،تنوع پسندی اور جذبات ومحسوسات کی فراوانی ہے۔فراق کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ خیال بھی یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ غزل کی قلم رو تنگ نہیں،بہت وسیع ہے اور اس میں شعور و لاشعور اور داخلیت و خارجیت کے سارے مسائل و معاملات اور جملہ انسانی افکار اب آسانی سے جگہ پا سکتے ہیں۔''(۲)

اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان صاحب فراق کی غزلوں کا بخوبی جائزہ پیش کیا ہے۔جگہ جگہ انکے اشعار درج کر مثالوں کے ذریعہ ان کی شاعرانہ عظمت کو بڑی وصف سے بیان کیا ہے اور ان کی شاعری کو جدید غزل کا بالکل نیا لہجہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کا یہ مضمون ''مجروح سلطان پوری کی غزل پر ایک نظر'' میں ڈاکٹر صاحب مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے ایک مشاعرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جہاں جگر صاحب اس مدرسہ کے ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ اس مدرسہ کے سالانہ مشاعروں میں جہاں فرمان صاحب جگر صاحب کے ذریعہ پہلی بار مجروح سلطانپوری سے متعارف ہوئے تھے۔مگر اس وقت فرمان صاحب مجروح کی شاعری سے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔مگر مجروح سلطانپوری ان شاعروں میں سے نہیں تھے جو آگے چل کر

۱۔غزل اردو کی شعری روایت از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص:۱۶۲

۲۔غزل اردو کی شعری روایت از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص:۲۱۶

دم توڑ دیتے۔ مجروح صاحب آگے چل کر اردو شاعری کو غزل کے سانچے میں نئے نئے رجحانات کو پرو دینے کا تجربہ کیا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب مجروح سلطانپوری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مجروح کو بعض نئے شعراء کی طرح نہ تو غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ ہے اور نہ اس کی رمزیت واختصار پسندی کا رونا۔ اس نے نئے سے نئے رجحانات کو غزل میں ڈھال دینے کا تجربہ کیا ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس کی غزلیں ہیئت اور ٹیکنک کے اعتبار سے روایتی ہے۔ ''روح عصر'' کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے ان کا روایات سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے۔ مجروح غزل کے ان چند شعراء میں ہیں جو ایک طرف اپنی فنی روایات کی اہمیت اور اپنے قدیم شعری ورثہ کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔''(۱)

ارمغان گوکل پرشاد

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتب کردہ کتاب ''ارمغان گوکل پرشاد ۱۹۷۸ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں۔ ارمغان گوکل پرشاد اردو شعراء کا ایک اہم اور نادر و نایاب قدیم تذکرہ ہے۔'' ارمغان گوکل پرشاد کی تذکرہ نگاری پاکستان بابت جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنی کتاب اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ۱۹۷۲ء میں اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

ارمغان گوکل پرشاد کے مصنف کا نام گوکل پرشاد تھا۔ رساؔ تخلص کرتے تھے فتح پور ہسوہ کے رہنے والے تھے۔ اور ہندو کائستھوں کے ایک ممتاز علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ کا نام گوری دیال اور دادا کا نام شیو پرشاد تھا۔ ''ارمغان'' میں شیو پرشاد کا ترجمہ بھی بحیثیت شاعر موجود ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

۱۔ غزل اردو کی شعری روایت از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص:۲۳۲

''گوکل پرشاد رسا نے اپنے تذکرے کی ترتیب وتکمیل میں اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ ''ارمغان'' میں منشی چند ذکا، مرزا قادر، بخش صابری، مصطفیٰ خاں، شیفتہ، غلام محی الدین مبتلا میرٹھی، غلام ہمدانی مصحفی، عبدالغفور نساخ، سعادت خاں، ناصر میر قطب الدین باطن، عنایت حسین خاں مہجور اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کے تذکروں کا حوالہ کئی جگہ آیا ہے۔''(۱)

ارمغان گوکل پرشاد کا دوسرا وہ انتخاب اشعار پر مبنی ہے اور حصہ اول تراجم کے ساتھ ہی منسلک ہے اور اسی کے ساتھ چھپا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''سراپا سخن کے مؤلف کی طرح اگر چہ گوکل پرشاد رسا نے بھی شعراء کے تراجم میں اختصار سے کام لیا ہے پھر بھی رسا کے تراجم محسن کے تراجم سے بہتر ہیں۔ رسا نے شعراء کے سوانح کے سلسلے کی بعض بنیادی باتوں یعنی ولدیت، سکونت، توطن تلمذ اور سنین وفات وغیرہ کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ بعض ایسے شاعروں کا ذکر بھی ارمغان میں مل جاتا ہے جس کا تذکرہ اردو شعراء کے کسی اور تذکرے میں نہیں آیا۔''(۲)

خطبات محمود

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی مرتب کردہ کتاب ''خطبات محمود'' نامور مورخ و دانشور ڈاکٹر محمود حسین کے خطبات وتقاریر کا مجموعہ ہے۔ جو یونیورسل بکس لاہور سے پہلی بار ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے نگار کے محمود حسین نمبر بابت جون ۱۹۷۵ء میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے سلسلے میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۔ ارمغان گوکل پرشاد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی پاکستان ۱۹۷۸ء ص:۵

۲۔ ارمغان گوکل پرشاد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی پاکستان ۱۹۷۸ء ص:۶

اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ڈاکٹر محمود حسین سوانح شخصیت اور یادگار کے موضوع پر ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب محمود حسین کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی طرح ان کی علمی و ادبی ذوق بھی ہمہ گیر تھا۔ اپنے مخصوص مضامین یعنی تعلیم، تاریخ اور سیاست کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ خصوصاً شعر و ادب پر بھی وہ اچھی نظر رکھتے تھے۔ فارسی اور اس کی شعری و ادبی روایات سے آگاہی کے سبب اردو شاعری کے رموز نکات کو خوب سمجھتے تھے اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ادبی اجتماعات میں ان کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی تھی جس موضوع پر بولتے تھے۔ بعض بہت خوبصورت اور انفرادی نکتے پیدا کر لیتے تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھتے اور بولتے تھے، یہی سبب تھا کہ اجتماعات میں انہیں بلایا جاتا تھا۔ اور ان کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کے اس مضمون میں محمود حسین کی سوانح زندگی اور ان کی تصانیف اور ان کے حالات زندگی پر تفصیلی جائزہ ملتا ہے۔

نیاز فتح پوری شخصیت اور فکر و فن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتب کردہ کتاب ''نیاز فتح پوری شخصیت اور فکر و فن'' ہے۔ جو اردو اکیڈمی سند کراچی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی، جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک مضمون ''نیاز فتح پوری ایک نظر میں'' جو ان کی سوانحی علمی و ادبی زندگی کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اس میں ادب کے ممتاز قلمکاروں کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔ جس میں خود علامہ نیاز فتح پوری جوش، فراق، ملا وجہی، مولانا ابوالخیر مودودی، رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر سبزواری، پروفیسر آل احمد سرور، احتشام حسین، مالک رام، نورالحسن ہاشمی،

۱۔ خطبات محمود از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء ص: ۲۳

ل احمد، مجنوں گورکھپوری، ابواللیث صدیقی، محمد حسن، سید عبداللہ وقار عظیم خواجہ احمد فاروقی، یوسف سرمست خورشید عالم فرمان فتح پوری وغیرہ کے مضامین علامہ نیاز فتح پوری کے فکر وفن اور سوانحی شخصیت وادبیت پر لکھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب علامہ نیاز فتح پوری کی شخصیت وجامعیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''نیاز فتح پوری بیسویں صدی کے ان گنے چنے ادیبوں میں ہیں جن کی جامعیت وہمہ گیری ہمیں سرسید، آزاد نذیر احمد، حالؔی اور شبلؔی کی یاد دلاتی ہے، ان کی شخصیت یک پہلو نہیں صد پہلو ہیں اور کوئی پہلو ایسا نہیں جس نے اردو زبان اور ادب کے قاری کو متاثر نہ کیا ہو۔(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''نیاز کی خالص ادبی تحریروں کا تعلق ہے انہوں نے کم وبیش ہر صنف اور ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس انداز خاص سے کہ ہم ان کی کسی تحریر کو بھی حرف مکرر نہیں کہہ سکتے۔''(۲)

تاویل وتعبیر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''تاویل وتعبیر'' طبع اول ۱۹۶۸ء نذر سنز لاہور سے طبع دوم کراچی و لاہور ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۴ء میں اور طبع سوم ساعقہ بک ڈپو دہلی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا جس میں مختلف مضامین شامل ہیں۔ تہذیبی اسائے سرسید احمد خاں اور راجہ رام موہن رائے، تحریک پاکستان کا ثقافتی پس منظر، اردو اور علاقائی زبانیں، خودی اور اسلامی تصوف، پاکستانی ثقافت کا خط اول، زاویے اور جائزے، کلاسکی ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ، نظیر اکبرآبادی اور انکے ناقدین، فن داستان اور داستانیں، احمد ندیم قاسمی اور علامتی افسانہ، شعر وشاعری، بدن کا طواف اور اس کے افسانے، ولی اردو شاعری کا معمار اول، ناسخ شخصیت

۱۔ نیاز فتح پوری شخصیت اور فکر وفن از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۶ء ص: ۱۲

۲۔ نیاز فتح پوری شخصیت اور فکر وفن از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۶ء ص: ۱۶

اور فن کے آئینے میں، جگر کے شاعرانہ مرتبے کا تعین، مولانا احمد رضا کی نعتیہ شاعری، سیماب اکبرآبادی ایک مطالعہ شامل ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب تاویل و تعبیر کے دیباچے میں اس کتاب کے مقالات کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے مقالات کا مجموعی رُخ ادب کے تاویل و تعبیر ہی کی طرف ہے۔ ایسی تاویل و تعبیر جو کسی خاص عہد کے ادب کو محض اسی عہد کی چیز نہیں سمجھتی بلکہ جدید تقاضوں اور عصری آگہی کے تناظر میں اسے ایسی قدر سے منسلک کردیتی ہے۔ جو اسے عہد میں زندہ رکھتی ہے۔ یہی اس کتاب کی اشاعت اور دوبارہ اشاعت کا جواز ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کلاسیکی ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے عربی فارسی کی طرح سنسکرت میں بھی کمال حاصل کرلیا تھا اور سنسکرت کی ساری قدیم و اہم کتابوں کو عربی و فارسی میں ترجمہ کرچکے تھے۔ اردو پر تو خیر اب یہ الزام ہے کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے لیکن خود ہندی جسے ہندو اپنی زبان کہتے ہیں اس کو بھی ترقی دینے میں مسلمانوں نے کوتاہی نہیں کی۔''(۲)

اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب مسلمان شعراء کا ہندی شاعری کا جائزہ لیا ہے جس میں خاص کر ملک محمد جائسی کا مختصر حالات زندگی اور شاعری پر گفتگو کی ہے۔ اس میں چار مسلمان شعراء رس لین جن کا اصل نام سید غلام نبی تھا، عبدالرحمٰن خان خاناں، کبیر جیسے مسلمان شاعروں نے ہندی شاعری میں شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ فرمان صاحب کے خیال سے ہندی کلاسیکی شاعری میں اردو کی طرح ہندو اور مسلمان دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔

تاویل و تعبیر ڈاکٹر فرمان صاحب کا ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے اس سے پہلے مضامین کا ایک مجموعہ

۱۔ تاویل و تعبیر از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۴ء ص:۴

۲۔ تاویل و تعبیر از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۴ء ص:۵۶

''تحقیق وتنقید'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے یہ مضامین تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے ہیں۔

ادبیات وشخصیات

ڈاکٹر فرمان صاحب کی کتاب ''ادبیات وشخصیات'' ۱۹۹۳ء لاہور سے شائع ہوئی جس میں عظیم شخصیات کے سوانح علمی وادبی خدمات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ جس میں کتاب سے پہلے میں ڈاکٹر فرمان صاحب ان ادیبوں اور ناقدوں کے متعلق مضامین شامل کئے ہیں جن میں مولوی عبدالحق، اردو زبان کے جاں باز سپاہی اور کلاسیکی ادب کے بلند پایہ مدون ومحقق کے رشتے سے، مولانا حسرت موہانی اپنی سیرت و کردار کی پختگی اور اردو غزل کے حوالے سے، علامہ نیاز فتح پوری، حامد حسن قادری، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سائنس اور سائنسی ایجادات میں مشرق کا نام اونچا کرنے کے حوالے سے، پروفیسر حمید الزماں خاں تعلیم و ادب کے رشتے سے، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر محمود حسین یہ تمام ادیب وناقد اپنے اپنے میدانوں میں نہایت ممتاز ومنفرد مقام کے مالک ہیں۔ اس کتاب کے مضامین تحققی وتنقیدی نوعیت کے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ان محققین ونقادوں، شاعروں، مورخوں اور ماہر تعلیم کے اہم مضامین کو یکجا کر دیا ہے تاکہ ادب کے قارئین کو بیک وقت پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

ادا جعفری شخصیت اور فن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتب کردہ کتاب ادا جعفری شخصیت اور فن طبع اول ۱۹۹۸ء میں کراچی پاکستان سے شائع ہوئی ڈاکٹر فرمان صاحب ادا جعفری کو اردو شاعری کی خاتون اول قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''نیاز فتح پوری کی مشہور کتاب ''عورت اور فنون لطیفہ'' نظر سے گذری نیز جب ترقی میں اردو کے پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''نگار بنت عثمان اور نیاز فتح پوری'' نظر سے گذرا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ گئی کہ ماہنامہ نگار کی اصل محرک ترکی زبان کی نامور شاعرہ نگار بنت عثمان ہیں۔ اور

علامہ نیاز فتح پوری نے اپنے ماہنامہ کا دراصل نگار بنت عثمان کی یادو احترام کی نسبت سے رکھا تھا تو ضروری ہوگیا کہ نگار کا ایک سال نامہ کسی خاتون شاعر کے لئے وقف کیا جائے۔

اس لئے میری نگاہ ادا جعفری کے فکروفن اور شخصیت وسیرت پر جم گئی اور اسی کوشش کا حاصل نگار کا ادا جعفری نمبر ہے اس نمبر کا نشان کتابی صورت میں ادا جعفری شخصیت اور فن ہے۔''(۱)

اس کتاب میں ادا جعفری کے متعلق مختلف ادیبوں اور شاعروں کے مضامین شامل ہیں جس میں فیض احمد فیضؔ کا مضمون شہر درد، قاضی عبدالغفار کا ''میں ساز ڈھونڈتی رہی، احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، نورالحسن نقوی، انور سدید، یوسف ناظم، سحر انصاری، امراء طارق وغیرہ کے مضامین شامل ہیں اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان صاحب کا مضمون ادا جعفری، آج کی شاعری کا ایک معتبر نام کے عنوان سے ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''ادا جعفری عہد حاضر کی ان شاعروں میں سے ہیں جن کا شمار بہ اعتبار طویل مشق سخن اور ریاضت فن، صف اول کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔''(۲)

ادا جعفری ایک خاتون شاعر ہیں انہوں نے نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر اور ذات کے حصار سے باہر نکل کر انسانی فضائے حیات اور مسائل کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، یہی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔

نیا اور پرانا ادب

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''نیا اور پرانا ادب'' کراچی سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا یہ مضامین کا مجموعہ ہے جو نگار کے مختلف نمبروں و دیگر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ ادا جعفری شخصیت اور فن مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۸ء ص:۱۶

۲۔ ادا جعفری شخصیت اور فن مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۸ء ص:۶۸

جو مندرجہ ذیل مضامین ہیں:

سر سید اور اکبر الہ آبادی	مطبوعہ نگار پاکستان	نومبر دسمبر ۹۶۹ء
مغرب کی شاہکار نظموں میں افسانوی عناصر	نگار پاکستان	اپریل تا جون ۹۶۴ء
اقبال اور اردو کی عشقیہ شاعری	نگار پاکستان	مارچ ۱۹۶۸ء
غالب نو دریافت بیاض کی روشنی میں	نقوش کے غالب نمبر حصہ سوم	
گلزار نسیم اور اس کے ماخوذ	صحیفہ، لاہور	جولائی ۹۶۸ء
نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	اوراق، لاہور	فروری ۹۶۸ء
فیض احمد فیض، نقش فریاد اور دست صبا کی روشنی میں	افکار	اکتوبر ۱۹۵۵ء
سید عابد علی عابد اور ان کے انتقادی خیالات	صحیفہ، لاہور عابد نمبر	جولائی ۱۹۷۱ء
مجروح سلطانپوری کی غزل پر ایک نظر	انشاء، کراچی	ستمبر ۱۹۵۹ء
لہو کے چراغ اک مطالعہ	نگار، پاکستان	دسمبر ۱۹۶۲ء
عبدالعزیز خالد کے دو شعری مجموعے	سیارہ، عبدالعزیز خالد نمبر	
پتھر کی لکیر کا شاعر	نگار، پاکستان	جنوری ۶۶ء
قابل اجمیری اور دیدۂ بیدار	نیرنگ خیال	دسمبر ۱۹۶۸ء
سجاد باقر رضوی اور ان کی تازہ تصنیف	نگار، پاکستان	اکتوبر ۱۹۶۷ء
بیاض میری نظر میں	نگار، پاکستان	جولائی ۱۹۶۷ء
اردو نظم عہد بہ عہد ایک ریڈیائی تقریر	ریڈیو سے اشاعت، کراچی	ستمبر ۱۹۷۱ء
ادب میں اختلاف رائے کی اہمیت	نقوش، لاہور	دسمبر ۱۹۷۰ء
ادب میں نئی اور پرانی قدریں	نگار، پاکستان	دسمبر ۱۹۶۸ء
انجم اعظمی کا شعری مجموعہ لہو کے چراغ	نگار، پاکستان	جنوری ۹۹۱ء

ڈاکٹر فرمان صاحب مغرب کے شاہکار نظموں میں افسانوی عناصر کے مضمون میں ڈانٹے کے متعلق قلمطراز ہیں:

”ڈانٹے فلسفیانہ نگاہ رکھنے کے باوجود ماورائی قوتوں کا سہارا لئے بغیر آگے نہ بڑھ سکا۔ ڈانٹے کی طربیہ زبانی دنیا کی بہترین نظم خیال کی جاتی ہے، لیکن پلاٹ، کردار، فضا اور زماں و مکاں کی لاقیدی کے اعتبار سے اس کی فضا داستان کی فضا سے بہت دور نہیں ہے بلکہ اگر اس کی مقصدیت کو ذرا دیر کے لئے نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہ ایک منظوم افسانہ ہی رہ جاتا ہے۔“(۱)

تصانیف

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں۔

نمبر شمار	تصانیف	مطبوعہ	سن
۱	اردو رُباعی کا فنی تاریخی ارتقاء	کراچی، لاہور	۱۹۶۲ء
۲	تحقیق و تنقید	کراچی، دہلی	۱۹۶۲ء
۳	تدریس اردو	کراچی، اسلام آباد	۱۹۶۲ء
۴	غالب شاعر امروز فردا	لاہور	۱۹۷۰ء
۵	اردو کی منظوم داستانیں (مقالہ پی ایچ ڈی)	کراچی	۱۹۷۰ء
۶	نواب مرزا شوق کی مثنویاں	لاہور	۱۹۷۱ء
۷	دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ	لاہور	۱۹۷۲ء
۸	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (ڈی لٹ)	لاہور، کراچی	۱۹۷۲ء
۹	زبان اور اردو زبان	کراچی، لاہور	۱۹۷۴ء
۱۰	اردو کی نعتیہ شاعری	لاہور، کراچی	۱۹۷۴ء
۱۱	نیا اور پرانا ادب	کراچی	۱۹۷۴ء
۱۲	قمر زمانی بیگم	لاہور، کراچی	۱۹۷۲ء

۱۔ نیا اور پرانا ادب از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۴ء ص: ۳۰

۱۳	ارمغان گوکل پرشاد	کراچی	۹۷۵
۱۴	میر انیس حیات اور شاعری	کراچی	۱۹۷۶
۱۵	ہندی اور اردو تنازعہ	کراچی، اسلام آباد	۱۹۷۶
۱۶	اردو املا، اور رسم الخط	کراچی، لاہور	۹۷۷
۱۷	اقبال سب کے لئے	کراچی، دہلی	۹۷۷
۱۸	اردو افسانہ اور افسانہ نگار	کراچی، دہلی	۱۹۸۲
۱۹	دیدہ باز دیدہ (سفرنامہ)	ملتان	۹۸۳
۲۰	فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت	کراچی، لاہور	۹۸۴
۲۱	تاویل وتعبیر	لاہور	۹۸۴
۲۲	نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	کراچی	۹۸۶
۲۳	اردو کی ظریفانہ شاعری	لاہور، دہلی	۹۸۷
۲۴	اردو کا افسانوی ادب	ملتان، لاہور	۹۸۸
۲۵	نیاز فتح پوری دیدہ وشنیدہ	لاہور	۹۸۹
۲۶	اردو املا اور قواعد	اسلام آباد	۱۹۹۰
۲۷	اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ	کراچی	۱۹۹۰
۲۸	اردو کی بہترین مثنویاں	لاہور	۹۹۳
۲۹	ادبیات اور شخصیات	لاہور	۹۹۳
۳۰	قائداعظم اور تحریک پاکستان	لاہور	۹۷۶
۳۱	خطبات محمود	لاہور	۱۸۳
۳۲	اردو نثر کا فنی ارتقاء	کراچی، دہلی، لاہور	۱۹۹۰
۳۳	مولانا محمد علی جوہر، حیات اور کارنامے	کراچی، لاہور	۱۹۶۹
۳۴	مولانا حسرت موہانی شخصیت اور فن	لاہور	۹۷۰

۳۵	قومی یکجہتی اور پاکستان	کراچی	۱۹۹۲ء
۳۶	سری پرکاش اور پاکستان	لاہور	۱۹۹۳ء
۳۷	ڈاکٹر محمود حسن شخصیت اور کارنامے	لاہور	۱۹۷۶ء
۳۸	غزل، اردو کی شعری روایت	کراچی	۱۹۹۵ء
۳۹	ادب اور ادب کی افادیت	کراچی	۱۹۹۶ء
۴۰	ادا جعفری، شخصیت اور فن	کراچی	۱۹۹۸ء
۴۱	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب	کراچی	۱۹۹۸ء
۴۲	میر کو سمجھنے کے لئے	کراچی	۱۹۹۹ء
۴۳	سرسید احمد خان آن دا پریزیڈنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس	لاہور	۱۹۸۲ء
۴۴	پاکستان موومنٹ اینڈ ہندی۔اردو کانفلکٹ	لاہور	۱۹۸۶ء
۴۵	ادب اور ادبیات	لاہور	۲۰۰۱ء
۴۶	عملی تنقیدیں	لاہور	۲۰۰۱ء
۴۷	تعبیرات غالب	کراچی	۲۰۰۲ء
۴۸	شرح ومتن غزلیات غالب	ملتان	۲۰۰۰ء
۴۹	ایک عظیم وقدیم تہذیبی گہوارہ (مشاہیر فتح پور ہسوہ)	ملتان	۲۰۰۱ء
۵۰	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	دہلی، لاہور، کراچی	۱۹۶۹ء
۵۱	نیاز شناسی	کراچی	۱۹۷۰ء
۵۲	قومی زبان اور دیگر پاکستان زبانیں	اسلام آباد	۱۹۸۶ء
۵۳	اردو کی ظریفانہ شاعری اور اسکے نمائندے	دہلی	۲۰۰۴ء
۵۴	خودنوشت اور تنقید خودنوشت	لاہور	۱۹۹۸ء
۵۵	شخصیت وتنقید وتمثیل نگاری	لاہور	۱۹۷۲ء

۵۶	علامہ نیاز یادگاری خطبات	لاہور	۱۹۹۸
۵۷	انتخاب مقالات علامہ نیاز فتح پوری	لاہور	۱۹۹۸

رسالے

(بطورخاص۔ نیاز فتح پوری کے نگار کے شعبۂ ادارت سے خصوصی تعلق)

نگار کا اجراء مولانا نیاز فتح پوری کا عظیم کارنامہ ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلچسپی اور لگن سے نکالتے رہے ہیں وقت کی تنگی ومصروفیت ہونے کے باوجود اپنا خون جگر صرف کرتے رہے اور نگار کے نکلنے میں کوئی بھی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دیا ستمبر ۱۹۸۴ء کے نگار کے ملاحظات میں نیاز و نگار کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اشاعت کی راہ میں ہزار مشکلات کے باوجود میں نے نگار کو بند نہیں ہونے دیا۔ علامہ مرحوم نیاز فتح پوری جو امانت مجھے سونپ گئے تھے اس کی ممکن حد تک حفاظت کی ہے انکے وصیت نامے کو اپنی بساط بھی نبھایا ہے اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ان ذمہ داریوں کو بہتر طور پر پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ مشکل یہ ہے کہ میں سر دست ملازمت اور نجی زندگی کے دوسرے فرائض کی بنا پر نگار کو سارا وقت نہیں دے سکتا پھر بھی زیادہ سے زیادہ وقت نگار کے لئے نکالتا ہوں یہی وجہ ہے کہ اپنے جملہ خوبیوں اور روایتوں کے ساتھ نہ سہی نگار برابر شائع ہو رہا ہے پھر بھی یہ ہے کہ نگار کو عام ادبی ماہنامہ نہیں بننے دیا گیا اس کی نہج اب بھی کم وبیش وہی ہے جو پہلے تھی اس کا مزاج دوسرے پرچوں سے یوں الگ ہے کہ اس کا زیادہ حصہ آج بھی بلند پایہ تحقیقی تنقیدی مقالات ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری مرحوم نے نگار کے سالناموں اور خصوصی شماروں کی جو طرح ڈالی تھی اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اگر اسے تعلی نہ سمجھا جائے تو کہہ سکتا ہوں نگار کی اس روایت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔(۱)

۱۔ نگار پاکستان ۱۹۸۴ء ملاحظات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص:۳

ڈاکٹر صاحب معلّمی کے پیشے سے منسلک رہے وقت کی ستم ظریفی اور تنگی کے باوجود اس کے معیار میں کسی طرح کی کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیا ہمیشہ تحقیقی مواد سے مالا مال کرتے رہے اپنی عمیق وسعت نظر سے کسی نہ کسی خاص موضوع کو چھان بین کر کسی خصوصی شمارہ کی شکل میں تو کبھی سالنامے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتے رہے۔

پروفیسر عتیق احمد ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور نگار کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری چونکہ پیشہ معلّمی سے منسلک رہے ہیں اس لئے انہوں نے اپنی ادارت میں ایسے ادبی مسائل اور پہلوؤں کے ساتھ ایسی ادبی شخصیت اور شعراء کو بالخصوص سالناموں کا موضوع بنایا جو دور حاضر کے طلبہ جامعات کی خصوصی بنیادی ضروریات پوری کریں اور ان کے تحقیقی کاموں میں اتنی ابتدائی اور بنیادی معلومات یکجا ہو جائیں کہ متعلقہ موضوع پر آگے کام کرنے میں ان کا ذہن مستعد ہو جائے اور وہ خود سوچ وچار کر سکیں یہ کام چاہے فرمان صاحب نے بھی بالمقصد نہ کیا ہو لیکن نگار کے سالناموں اور خصوصی اشاعتوں سے یہ کام براہ راست بہرحال انجام پاتا رہا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''نگار پاکستان کی جڑیں اگر ماضی میں نیاز فتحپوری سے ملتی ہیں تو حال میں اس کا رشتہ فرمان فتح پوری سے استوار ہے۔ نگار پاکستان کو نہ ہم ماضی سے الگ کر سکتے ہیں نہ حال سے جدا۔ ماضی کے ''نگار'' کا تصور جس طرح نیاز فتح پوری کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح حال کے ''نگار پاکستان'' کے بارے میں فرمان فتح پوری کے بغیر سوچنا امر محال ہے۔ ایک طرف ماضی ہے تو دوسری طرف حال، ایک طرف نیاز ہیں تو دوسری طرف فرمان ہیں ''نگار پاکستان'' کو قدیم وجدید ماضی وحال اور نیاز وفرمان کے درمیان کی ایک کڑی تصور کرتا

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۶۱۴

ہوں، اس لئے میں نیاز و نگار کی مثنویت کا نہیں بلکہ ''نیاز و فرمان و نگار'' کی تثلیث کا قائل ہوں۔''

تابش دہلوی نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے جشن کے موقع پر ٹھیک ہی کہا تھا:

''فطرتاً نیک خو، نکو کردار طبع سادہ صفا کی آئینہ دار
ہر قدم راستی کا اک جادہ منزل حق، نظر کی دلدادہ
متوازن تمام قول عمل معتبر زندگی کا ایک اک پل
بزم دانشوری کے صد نشیں حلقۂ آگہی کے رکن رکین
حسن افزائے محفل اظہار جلوہ افروز مجلس افکار
اک اک بات دلکشا تقریر ایک اک سطر نور کی تحریر
ایک اک لفظ اک گل تازہ خلد معنی سخن کا شیرازہ
تہی دامان علم کو مخزن خوشہ چینوں کے واسطے خرمن
منزل فن کی رہنما قندیل رہ گذارِ ہنر میں سنگ میل''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون ''نیاز صاحب سے میری نیاز مندی'' میں تفصیل سے حالات بیان کئے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ بچپن میں ان کے بڑے بھائی منشی اکرام اللہ کانپور سے آبائی گاؤں آتے تو اپنے ساتھ رسائل لایا کرتے تھے اور انہیں کے ذریعے نیاز فتح پوری کے نام سے کان آشنا ہوئے انہوں نے لکھا کہ نیاز صاحب مدرسہ اسلامیہ فتح پوری کے طالب علم رہ چکے تھے اور استاد بھی ۱۹۳۸ء میں فتح پور کے ایک مشاعرے میں وہ چند گھنٹوں کے لئے گئے تھے ورنہ طویل مدت تک ان کا سلسلہ فتح پور سے ٹوٹ چکا تھ مدرسے کے ریڈنگ روم میں رسالہ نگار آتا تھا اور ان کی یاد تازہ کر جاتا تھا۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۸ء میں مدرسہ اسلامیہ کے سالانہ مشاعرہ کی صدارت کا دعوت نامہ لے کر لکھنؤ گیا نواب

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۵۸۲، ۵۸۳
۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۷۱۲، ۷۱۳

صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی بڑی حوصلہ افزاء ثابت ہوئی اس طرح سے جیسے میں برسوں سے ان کا شناسا ہوں مشاعرے میں حسب وعدہ تشریف لائے اور دوسرے دن خندہ پیشانی کے ساتھ واپس گئے۔ اس طرح مراسلت کی صورت نکل آئی۔ میں کسی نہ کسی بہانے انہیں خط لکھتا اور وہ کبھی چند لفظی اور کبھی چند سطری جواب سے مجھے یاد کر لیتے۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں پاکستان چلا آیا تو کچھ دنوں بعد خط لکھا۔ جواب آیا:

> ''گرامی عزیز ۲۲/ کا کرم نامہ پہونچا میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ فتح پور میں ہی ہیں اور وہ جو ایک تعلق آپ سے پیدا ہو گیا تھا، بار بار وطن کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔ شکر ہے کہ آپ کو وہاں ملازمت مل گئی مگر مجھے مسرت ہو گی اگر آپ گاہ بگاہ اپنے حالات سے آگاہ فرماتے رہیں گے۔''(۱)

اس طرح فرمان فتح پوری کا نیاز فتح پوری سے خط و کتابت کے ذریعے مزید تسلسل اور استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ فرمان صاحب نے انہیں ۵/ مارچ ۱۹۵۲ء میں ایک بین المملکتی مشاعرے کی صدارت کی غرض سے کراچی بلایا جس میں فراقؔ، جوشؔ، اثر لکھنوی، جگر اور شعریؔ بھوپالی کے علاوہ پاکستان کے سب ہی بڑے شاعروں نے شرکت کی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''کراچی کے قیام میں مجھے ان سے بار بار ملنے کا موقع ملا اس کے بعد میرے ان کے تعلقات روز بروز استوار ہوتے گئے۔ مجھے ہندوستان سے جس کتاب، جس رسالے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی، میں انہیں لکھتا اور بے تکلف میری ضرورت پوری کر دیتے۔ نجی زندگی کے بعض مسائل میں بھی مشورہ چاہتا تو وہ مسئلے کے حسن و قبح پر پوری روشنی ڈالتے لیکن اس پر عمل کرنے نہ کرنے کا حق میرے لئے محفوظ کر دیتے۔''(۲)

فرمان صاحب کو وکالت کا پیشہ نہ اختیار کرنے کے لئے نیاز صاحب نے مشورہ دیا تھا۔ فرمان صاحب

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۸ء ص: ۱۸

۲۔ دیدہ بادیدہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ۱۹۸۳ء ص: ۱۴، ۱۵)

نے لکھا ہے:

''۱۹۵۲ء میں کراچی کی ملاقات کے بعد نیاز صاحب کو میرے مذاق طبعی کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے میرے مضامین نگار میں چھپنے لگے تھے اور اس میں نیاز صاحب کا بڑا ہاتھ تھا وہ کبھی موضوع دے کر اور کبھی یوں ہی مجھ سے مضمون لکھواتے اور دیر، سویر میرا مضمون نگار میں شائع کر دیتے تھے۔ نگار میں چھپنے کے بعد دوسرے ادبی رسائل میں بھی مجھے جگہ ملنے لگی تھی۔ خصوصاً ''ادب لطیف'' کے مدیر مرزا ادیب صاحب نے اپنا لطف وکرم میرے حق میں نیاز صاحب ہی کی طرح ارزاں کر دیا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد میں پاکستان آ گیا تھا اور نیاز صاحب کو خبر تھی کہ میں دفتری ملازمت میں رہ کر سارا کام کر رہا ہوں اس لئے وہ میرے مستقبل کے بارے میں متفوق تھے اور چاہتے تھے کہ میں کسی ایسے شعبہ میں منسلک ہو جاؤں جس میں ادبی کاموں کے لئے کچھ وقت نکل سکے۔ میں فتح پور میں معلم رہ چکا تھا اور خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح محکمہ تعلیم میں چلا جاؤں چنانچہ میں نے نیاز صاحب کے مطابق بی ٹی اور ایم اے کے امتحانات پاس کئے۔ پہلے سررشتۂ تعلیم کراچی سے منسلک ہوا۔ تین سال بعد ۱۹۵۵ء میں مجھے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جگہ مل گئی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتب کردہ کتاب ''نیاز شناسی'' حلقہ نیاز و نگار کراچی سے شائع ہوئی جس میں ادب کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور ناقدوں کے مضامین شامل ہیں اور اس میں ڈاکٹر فرمان صاحب ایک مضمون ''نیاز فتح پوری ''مستقلاً پاکستان کیوں آئے؟'' کے عنوان سے لکھا ہے اس کا پیش لفظ بھی فرمان صاحب نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''نیاز صاحب صرف ایک آزاد خیال، سیاسی مبصر تھے، وہ عملاً یا مسلکاً

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۸۸ء ص: ۱۲

کوئی ایسی شخصیت نہ تھے کہ پاکستان آنے یا نہ آنے کا عوامی سطح پر کسی کا
رد عمل ہوتا۔‘‘(۱)

نیاز صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کے چند روز قبل ہندوستان سے ’’پدم بھوشن‘‘ کا اعجاز بھی ملا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ ۱۹۶۲ء کے نیاز نمبر میں نیاز صاحب اپنے متعلق جو مضمون لکھے تھے اس میں ہجرت کے متعلق کنایۃً ذکر کئے تھے جس میں ۱۹۴۷ء کے واقعات اور اپنی بیوی کے غم کا اظہار کئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نیاز فتح پوری کا ہندوستان سے ہجرت کے متعلق لکھتے ہیں:

’’ہندوستان سے نیاز صاحب کی ہجرت کا سبب دراصل خود نیاز صاحب کے داماد مجدد نیازی اور مجدد کی دوسری بیگم ہوئیں مجدد نیازیں کون ہیں؟ اس کی بہت مختصر سی وضاحت اس جگہ ضروری ہے ڈیرہ اسماعیل خاں صوبہ سرحد میں نیاز صاحب کے ایک دوست تھے جناب اخوند فیض محمد فاروقی صاحب جو بڑی خوبی کے مالک تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جس وقت فاروقی صاحب کی پہلی بیوی (والدہ مجدد) کا انتقال ہوا تو مجدد کی عمر دس گیارہ سال کی رہی ہوگی نیاز صاحب نے مشورہ دیا تھا فاروقی صاحب کو شادی کرنے کا۔ اور فاروقی صاحب رضا مند ہوگئے، مگر بچوں کے ساتھ سوتیلی ماں کے سلوک سے ڈرتے تھے۔ ان بچوں کو نیاز صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا اور انہیں اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۱ء میں فاروقی صاحب کے مشورہ پر نیاز صاحب ۱۹۴۱ء میں اپنی بیٹی شوکت سے مجدد کی شادی کردی تھی اس کے بعد اپنی ساری جائداد مجدد کے نام کردی تھی مجدد کے دو بیٹے جاوید، جواد اور ایک بیٹی ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں اچانک شوکت کا انتقال ہوگیا۔ شوکت کے انتقال کے بعد ان بچوں کی پرورش بھی نیاز صاحب کے ذمے ہوگئی۔ اب نیاز صاحب ان دونوں بیٹوں سرفراز نیازی اور ریاض نیازی کے مستقبل کے بارے میں بھی متفکر رہا کرتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۶۰ء میں نیاز صاحب نے لکھنؤ ہی میں انڈین سول سروس کے ایک افسر کی بیٹی سے مجدد کی شادی کردی۔ شادی کے چند ماہ گذرنے کے بعد

ا۔ نیاز شناسی از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء ص: ۲۰۹

جب ایک دن مجد داور بیگم مجد د کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں پڑی۔''کہ آپ کا اس گھر میں کیا ہے، آپ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ یہ گھر آپ کا نہیں ہمارا ہے۔'' تو نیاز صاحب پر بجلی گر پڑی، سکتے میں آ گئے۔ ان کے لئے زمین تنگ اور آسمان سخت ہو گیا نہ جائے رفتن نہ پائے خاندن اسی کو کہتے ہیں۔ دل کا دورہ پڑا کئی مہینے صاحب فراش رہے۔''(۱)

یہی اسباب تھے کہ نیاز صاحب مستقل طور پر پاکستان چلے گئے اور اب نگار کراچی سے نکلنے گا۔ نیاز فتح پوری نے فرمان صاحب کا نام نومبر ۱۹۶۲ء سے نگار کے ادارے میں شامل کر دیا فرمان صاحب کے اصرار پر نیاز صاحب نگار کے ''نیاز نمبر'' نکالنے پر راضی ہوئے۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''غالباً نیاز صاحب کو یہ بات مناسب نہیں معلوم ہو رہی تھی کہ جس پرچے کے وہ مدیر ہوں وہی ان کا نمبر شائع کرے، لیکن میرے نقطہ نظر سے نگار کے سوا کسی اور پرچے کو اس کا استحقاق نہ تھا۔ نیاز و نگار الگ الگ چیزیں نہیں ایک ہی تحریک اور ایک ہی مکتبہ فکر کے دو نام ہیں نگار جسم ہے تو نیاز اس کی روح تھے۔ نیاز جوہر تھے نگار اس کا عرض ہے۔ نگار ایک روایت ہے تو نیاز اس روایت کے بانی تھے۔ نیاز نے نگار کو جنم دیا، نگار نے نیاز کو حیات جاوداں بخشی، یہ ممکن نہیں نگار کے ذکر میں نیاز کا اور نیاز کے تذکرے میں نگار کا نام نہ آئے۔ ان دونوں میں رعایت لفظی نہیں نیاز کے کمالات و خدمات کا اندازہ کرنا ہو تو نگار کو ذہن میں ابھارنا پڑے گا اور نگار کے جمال و جلال کو سمجھنا ہو تو نیاز کی تحریروں پر نظر ڈالنی ہوگی۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری علامہ نیاز فتح پوری کے بارے مین نگار پاکستان مئی ۱۹۹۰ء میں لکھتے ہیں:

''نیاز فتح پوری بیسویں صدی کے ان گنے چنے ادیبوں میں ہیں جن کی

۱۔ نیاز شناسی از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء ص: ۲۱۵

۲۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۸۸ء ص: ۱۳

جامعیت و ہمہ گیری ہمیں، سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کی یاد دلاتی ہے۔
ان کی شخصیت یک پہلو نہیں صد پہلو ہے اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس نے
اردو زبان و ادب کے قاری کو متاثر نہ کیا ہو۔" (۱)

اسی مضمون میں فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ نیاز فتح پوری "عقل و مذہب کے بارے میں جو کچھ سوچ رہے تھے، اس کا زیادہ حصہ انہیں سرسید کے افکار و خیالات میں مل گیا۔ گویا سرسید نے ان کے مذہبی خیالات کی خارجی تائید کر دی۔ نتیجتاً مذہب کے مطالعے اور اس پر غور و فکر کرنے کے سلسلے میں ان کا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا۔ لیکن آگے چل کر وہ صرف سرسید کے مقلد یا غالب کے طرفدار نہ رہے بلکہ مسلسل مطالعہ اور ذاتی غور و فکر کی مدد سے انہوں نے سخن فہم بننے کی پوری کوشش کی ہے۔

نیاز فتح پوری کے مذہبی افکار کے بارے میں فرمان صاحب نے لکھا:

"انہوں نے اعمال اور اخلاق بنیاد بنا کر جب کسی شخص یا طبقے کو سرا
ہے۔ تو بے عمل اور تنگ نظر مذہبی گروہ کی جانب سے ان پر کبھی معتذلہ، کبھی
زندقہ، کبھی شیعہ، کبھی وہابی، کبھی اسماعیلیہ، کبھی احمدیہ اور کبھی بے دین اور دہریہ
ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے ایک جگہ نہیں متعدد جگہ اس امر کا
اظہار کیا ہے کہ میں ایک مسلمان کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں۔" (۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"انہوں نے اپنی ساٹھ سالہ علمی و ادبی زندگی میں جو کچھ لکھا ہے کافی
غور و فکر اور تحقیق و تنقید کے بعد لکھا ہے، جو کچھ سمجھا ہے وہی لکھا ہے جس طرح
محسوس کیا ہے اسی طرح لکھا ہے۔ خطائے بزرگاں گرفتن کے قول کو نظر انداز
کر کے لکھا ہے۔ شخصیتوں، طبقوں، گروہوں، فرقوں اور رنگ و نسل کے
تعصبات سے بلند تر ہو کر لکھا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ لکھا ہے دلکش

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۰ء ص: ۸
۲۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۰ء ص: ۹

اور منفرد اسلوب میں لکھا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو دبستان نگار و نیاز کا نمائندہ نقاد ماننے والوں سے صاف طور پر کہہ دیا:

"مولانا نیاز فتح پوری سے ان کی نیازمندی اور رسالہ نگار سے ان کی دیرینہ وابستگی ان کی سماجی زندگی کے زاویئے ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں کے اثرات ان کے ادب پر بھی پڑتے ہیں لیکن ان کے مجموعی کام کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرمان فتح پوری نے تنقید میں اپنی راہ الگ تراشی ہے اور اس عمل میں انہوں نے اپنی ذاتی مطالعے کو اساسی حیثیت دی ہے۔ چنانچہ انہیں نیاز و نگار کا مقلد شمار کرنا مناسب نہیں۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اقبال شناسی، غالب شناسی اپنی جگہ پر مسلم ہے، لیکن اس میدان میں دوسرے بھی ہیں جو اپنا دعویٰ مضبوطی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن نیاز شناسی کے میدان میں کوئی بھی ادیب و نقاد ڈاکٹر فرمان کی برابری نہیں کر سکتا۔ فرمان صاحب بار بار اپنی تحریروں میں نابغہ روزگار حضرت نیاز فتح پوری سے اپنی نیازمندی کا اظہار کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مضمون "فرمان فتح پوری ایک متوازن ادبی شخصیت" میں لکھا ہے:

"مولانا نیاز فتح پوری سے ان کی نیازمندی پیدا ہوئی تو یہ نیازمندی بروز ایام کے توسیع پذیر ہوتی چلی گئی اور ان کے وفات کے بعد انہوں نے نہ صرف رسالہ نگار کو زندہ رکھا بلکہ نیاز کے افکار و نظریات پر ہر سال بڑے پیمانے پر مذاکرے منعقد کرانے کا سلسلہ شروع کیا اور اسے ایسا علمی اور ادبی سلیقہ عطا کیا کہ اب نیاز فتح پوری ہمارے عہد میں زندہ اور ہمارے ساتھ شریک گفتگو نظر آتے ہیں۔ آپ انہیں اس دور کے ممتاز ترین ادیبوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ ان

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۰ء ص:۹

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی، ۱۹۹۴ء جلد اول ص۔ ۱۸۰،۱۸۱

کا تذکرہ علمی وقار اور ادبی وجاہت سے ہوتا ہے اور ان لوگوں سے زیادہ ہوتا
ہے جن کی انا اشتہاری شہرت سے پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو بالعموم دبستان نگار کا نمائندہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ نیاز فتح پوری سے ان کی دوامی نیاز مندی اور رسالہ نگار سے ان کی مستحکم وابستگی فقط ان کی سماجی زندگی کے زاویے ہیں۔ اس متذلل مزاج اور مفاد پرست دور میں یہ ان کی شخصیت کے بے حد روشن پہلو ہیں اور اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی ذاتی تشخص سے نیاز اور نگار کو منہا نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں کے اثرات ان کے ادب پر پڑے ہیں۔ لیکن ان کے مجموعی کام کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرمان فتح پوری نے تنقید میں اپنی راہ الگ تراشی ہے۔ اس عمل میں انہوں نے اپنے مطالعہ کو اساسی اہمیت دی اور ایسے علوم اور ان کتب تک رسائی حاصل کی جن میں سے بیشتر مولانا نیاز کی وفات کے بعد شائع ہوئیں اور مغرب اور مشرق میں علوم کی نشاۃ الثانیہ کا باعث بن چکی ہیں، بہ الفاظ دیگر انہوں نے نیاز اور نگار کے روشن زاویوں کی توسیع کو قبول کیا اور ان کی اندھی تقلید کے بجائے وہ راستہ اختیار کیا جسے مزید روشنی کی ضرورت تھی۔ یہ روشنی تذکرہ نئے دور کے اندھے راستوں کو فرمان فتح پوری کے قلم نے عطا کی۔

ڈاکٹر انور سدید فرمان فتح پوری کے متعلق لکھتے ہیں:

"فرمان فتح پوری نے جو ادبی فیصلے دیئے ہیں ان سے تعصب کی بو نہیں آتی اور ان کے معاصرین ان فیصلوں کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتے، ان کی تنقید نیاز فتح پوری کی تنقید کی طرح جوئے تیز رو یا ہوائے طفیان غیر نہیں۔ انہوں نے نیاز کے انداز میں بت شکنی کا طریق بھی اختیار نہیں کیا۔ نیاز کا فیض فراواں قبول کرنے کے باوجود وہ ہوائے خوش وخرام ہیں۔ ان کی تنقید کی آہستہ رو ندی کے کناروں کو گزند پہونچائے بغیر اپنی زرخیزیاں تقسیم کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ندی بلبلے ابھارنے کے بجائے نودمیدہ پھولوں کی

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص۔ ۱۸۲،۱۸۱

افزائش کا باعث بنتی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری سخن فہم ہیں صرف غالب کے طرفدار نہیں ہیں۔ وہ نیاز کی عظمت کے معترف ہیں مگر ان کے افکار و خیالت پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ کسی اور کی عینک سے نہیں دیکھتے۔ نیاز سے نیاز مندی رکھنے کے باوجود وہ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں، نیاز سے اختلاف اگر رکھتے ہیں تو اس کا اظہار واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان نے نیاز سے آزاد خیالی اور کشادہ نظری سیکھی ہے مگر اسی وجہ سے وہ آنکھ موند کر نیاز صاحب کے نظریات یار جحانات کو قبول نہیں کرتے۔

فرمان صاحب نے آزادیٔ فکر نیاز فتح پوری سے سیکھی ہے مگر جہاں موقعہ ملتا ہے وہ نیاز کی بھی تنقید کرتے ہیں۔ تفہیم نیاز کے لئے فرمان کی تحریروں کو پڑھنا ضروری ہے۔

مولانا نیاز فتح پوری کی تصنیف مالہ وماعلیہ

مولانا نیاز فتح پوری کا کالم "مالہ و ماعلیہ" نگار لکھنؤ میں چھپتا رہا اور ایک زمانے میں بہت مقبول تھا۔ اسی عنوان سے کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ نگار پاکستان نومبر ۱۹۸۸ء میں اسکے اجزاء بطور خصوصی شمارہ شامل ہیں۔ ان میں جگر، جوش، سیماب، علی سردار جعفری، ماہر القادری، اثر لکھنوی، محوی لکھنوی اور نخشب جارچوی کے بعض اشعار سے متعلق نیاز کے شذرات یکجا کیے گئے ہیں۔

پیش لفظ میں نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

> "کوئی شاعر خواہ وہ کتنا ہی جلیل القدر فاصل ہو، یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس سے غلطی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کوئی شاعر ایسا کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسی کے کلام میں غلطیاں پائے جانے کا زیادہ احتمال ہے۔ انھوں نے واضح کیا "مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں کہ جن شاعروں کے کلام میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، انکو میں شاعر تسلیم نہیں کرتا میں انہیں شاعر تو سمجھتا ہوں لیکن ایک حد تک غیر محتاط اور انکے اس نقص یا فرد گذاشت کو پیش کرنا میرا مقصود ہے۔"(۲)

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۱۸۳

۲۔ نگار پاکستان نومبر ۱۹۸۸ء خصوصی شمارہ پیش لفظ ص: ۴

نیاز صاحب نظم معرا اور آزاد شاعری کے قائل نہیں تھے۔ لکھتے ہیں:

''نظم معرا تو خیر وزن کے لحاظ سے کسی نہ کسی حد تک اصول کی پابند ہیں
لیکن یہ آزاد شاعری کیا چیز ہے۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی اور
اگر خود ان آزاد شاعروں سے پوچھا جائے کہ ان کی شاعری کے کیا اصول ہیں؟
تو غالباً وہ بھی اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے گا۔'' (۱)

مولانا حسرتؔ کی حسن پرستی

مولانا حسرتؔ موہانی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے محبوب شاعر ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حسرتؔ موہانی کی عشقیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا حسرتؔ کی شاعری بنیادی طور پر حسن و جمال اور عشق و محبت کی شاعری ہے۔ اس شاعری کا آغاز لڑکپن کی اس معصوم اور بھولی بھالی عمر سے ہوتا ہے جس کے متعلق خود حسرت نے کہہ دیا ہے۔

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے   اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

مولانا حسرتؔ نے ''ناواقفیت'' کے یہ مزے بارہ چودہ سال کی عمر سے
اٹھائے ہیں، ان کی ابتدائی غزلیں بتاتی ہیں کہ مڈل اور ہائی اسکول کے زمانہ
طالب علمی ہی سے انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے کے اشعار
میں حسن پرستی اور محبت کے جن ہلکے پھلکے تجربات و جذبات کا اظہار ملتا ہے وہ
موہان اور فتح پور ہسوہ کی اس طالب علمانہ فضائے حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔
جو انہیں اپنے حلقہ احباب اور اسکول کے حدود میں حاصل تھی۔'' (۲)

مولانا حسرت کی ایک قریبی عزیزہ رابعہ بیگم لکھتی ہیں:

''ابھی موہان کے مقامی اسکول میں پڑھتے تھے شعر و شاعری سے نہ

۱۔ نگار پاکستان نومبر ۱۹۸۸ء خصوصی شمارہ پیش لفظ ص: ۴

۲۔ ادبیات و شخصیات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۴۳

صرف یہ کہ دلچسپی پیدا ہوگئی بلکہ اشعار کہنے لگے۔ زیادہ تر عشق اور عاشقی کے رنگین قصے ہوتے تھے۔ یہ قصے انکی زندگی کے ابتدائی تجربات تھے۔ ہوائی باتیں نہ تھیں، ان کے اس زمانے کے متعلق گفتگو کرتے وقت زیرلب مسکراتے ہیں۔ کبھی اڑتا اڑتا کوئی نام بھی سنائی دیتا ہے۔ کبھی ان خوبصورت پہونچوں کا ذکر ہوتا ہے جو خربوزے کے بیجوں کو پیلا اور سرخ رنگ کر بنائی گئی تھی اور ہدیہ شوق کے طور پر پیش ہوتی تھی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موہان کے مقابلے میں گوڑا جہان آباد (فتح پور ہسوہ) کا ماحول رومانی زندگی کے لئے کچھ زیادہ ہی پُرکشش اور دل نشیں تھا، شاید اسی لئے انہوں نے ایک شعر میں کہا ہے۔

وہ جو اک لپکا کبھی خاکِ جہان آباد سے — اب تلک موجود ہے کچھ کچھ لگا لائے تھے ہم

محبت کی یہی گھریلو فضا جس کی ہلکی سی جھلک ان کی ابتدائی شاعری میں موجود ہے، عالم شباب کو پہونچتے پہونچتے کچھ سے کچھ ہوگئی اور آخر آخر اس میں ایسا رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا کہ وہ اردو کی عشقیہ شاعری میں مولانا حسرت کا امتیازی شان بن گئی ہے۔'' (۱)

فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت و عزت فی الواقع ان کی عاشقانہ غزلوں کی وجہ سے ہے۔ ایسی عاشقانہ غزلیں جو اردو غزل کی روایت سے ہم آہنگ رہ کر بھی قدما کی غزلوں سے بہت مختلف ہیں۔'' (۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''مولانا حسرت کا عقیدہ ہے کہ بے لوث پاکیزہ محبت کا مقدر ذلت و

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۲ء ص: ۷۴

۲۔ ادبیات و شخصیات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۴۵، ۴۶

رسوائی نہیں، کامرانی وشادمانی ہے، ان کے اندر حسن ومحبت کی بارگاہ میں شیفتگی و
سرمستی کے باوجود ایسی خود اعتمادی وخودسری نظر آتی ہے کہ وہ خاندانی اور گھریلو
زندگی کی اس رومانی فضا کو جس کا ذکر کرنا اگلے وقتوں کے لوگ عیب جانتے
تھے، بے تکلف اور برملا بیان کر دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔"(۱)

فرمان صاحب نے حسرت کی عشقیہ شاعری کے بارے میں صاف گوئی سے یہ بات بھی لکھی ہے:

"مولانا حسرت کی عشقیہ شاعری میں وہ شدت اور گہرائی نہیں ہے جو
میر تقی میر کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے
یہاں جو کچھ ہے وہ قلبی وارداتوں اور سچائیوں سے خالی نہیں ہے۔ میر تقی میر کی
طرح ان کی شاعری میں ہر قسم کی لفظی صناعی اور مبالغہ آرائی سے پاک ہے جو
کچھ دل پر گذری ہے اور جس طرح گذری ہے اسے حد درجہ سادگی کے ساتھ
بیان کر دیا ہے۔"(۲)

حسرت کے بعض معاصر غزل گو شعراء مثلاً اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی اور جگر مراد آبادی سب کے یہاں تراکیب والفاظ کے استعمال میں ایک طرح کا اہتمام نظر آتا ہے لیکن حسرت کے یہاں اس طرح کا کوئی اہتمام نہیں ہے ان کی شاعری میر تقی میر کی طرح خیال کی پیچیدگیوں اور ابہام سے پاک، جذباتی، صداقتوں کی شاعری ہے اس صداقتوں کو سمجھنے، ان کا اثر قبول کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی شرح یا لغت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ براہ راست اپنے قاری یا سامع پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری حسرت کی غزل کے واقعی پرستار ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"ان کی شاعری میں محبت اور دنیائے محبت کے کچھ ایسے تجربے اور ایسی
باتیں نظر آتی ہین جو ان سے پہلے تک اردو شاعری کے قاری کے لئے ناشنیدہ و
ناچشیدہ تھیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے (خاص طور پر مولانا حالی اور ان

۱۔ ادبیات وشخصیات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۵۰
۲۔ ادبیات وشخصیات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۴۶

کے ہم خیال ناقدین یہ سمجھتے تھے) کہ حسن محبت کے باب میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ سب کچھ ولی سے لے کر داغ تک کہا جا چکا ہے اب لکیر پیٹنے کے سوا، کسی تازہ تجربے یا نئے احساس اور طرز احساس کو غزل میں جگہ دینے کی گنجائش نہیں۔ مولانا حسرت کی غزل گوئی نے اس خیال کو باطل ٹھہرا کر یہ باور کرایا کہ عشق و محبت اور حسن و جمال کی دنیا انسانی زندگی سب سے بڑی اور سب سے رنگا رنگ دنیا ہے۔"(۱)

جیسے مرزا غالب کے پرستار عبدالرحمٰن بجنوری تھے مولانا حسرت کی غزل گوئی کے پرستار فرمان صاحب بھی ہیں فرق یہ ہے کہ بجنوری کی طرح فرمان صاحب مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے یہیں محتاط طرز تنقید ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی پہچان ہے۔

مولانا حسرت و نیاز سے ڈاکٹر فرمان کی عقیدت مندی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون "حسرت کی زندگی، شخصیت اور فن و مشاہدات زنداں" رسالہ نگار مئی ۱۹۸۴ء میں بھی شائع ہوا۔ یہ دونوں مضامین مئی ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے ملاحظات کے ساتھ شائع کیا۔

مولانا حسرت موہانی، شخصیت اور فن، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ہے، فرمان صاحب نے پہلی بار، نیاز فتح پوری کو ۱۹۴۸ء میں دکھا تھا لیکن وہ مولانا حسرت کو بہت پہلے دیکھ چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا حسرت موہانی مسلم لیگ، ٹکٹ پر ضلع فتح پور سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑے تھے اور فرمان صاحب نے ان کے جلسوں میں انکے روبرو تقریریں کی تھیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار کے حسرت نمبر ۱۹۷۶ء میں لکھا تھا:

"مولانا حسرت موہانی کی شخصیت دو خاص سبب سے میرے لئے پرکشش رہی ہے۔ پہلا سبب تو وہی حسرت کے کردار کی انفرادیت ہے جس

۱۔ ادبیات وشخصیات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۴۶

نے دوست دشمن، سب کو ان کا گرویدہ بنالیا ہے دوسرے اس سبب سے کہ اس عہد کی بزرگ شخصیتوں میں صرف مولانا حسرتؔ تھے۔ جنہیں قدرے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میں نے اپنی زندگی میں کن کن باتوں پر ایک طرح کی خوشی اور فخر محسوس کیا تو اس کے جواب میں یہ ضرور کہوں گا کہ مولانا حسرت کو میں نے دیکھا ہے، ان سے کئی بار ملا ہوں، ان سے باتیں کی ہیں، تحریک پاکستان کے سلسلے میں ان کے ساتھ کچھ دنوں گھما پھرا ہوں، انکے روبرو الٹی سیدھی تقریریں کی ہیں اور اسی مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے اساتذہ کی جوتیاں اٹھائی ہیں۔ جس سے مولانا حسرت نے فیض اٹھایا تھا۔''(۱)

آگے چل کر اسی مضمون میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے بعد جیسے جیسے شعور بڑھا ان کی شاعری، ان کی زندگی اور ان کی شخصیت کے بے شمار ایسے پہلو سامنے آئے جن کے سبب میں خود کو ذہنی طور پر حسرت سے بہت قریب محسوس کرنے لگا، پھر میری کمزوری یہ بھی ہے فکروفن کی عظمت کو شخصیت اور کردار کی عظمتوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا اس لئے جس کی شخصیت میرے دل میں گھر کر لیتی ہے اس کی ہر چیز میری نظر میں دل آویز ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر کا جو نتیجہ ہونا تھا ہوا، یعنی مولانا حسرت میرے لئے زندگی کی عظمت کا نشان بن گئے۔ چنانچہ میں نے ان کے بارے میں جہاں جو کچھ ملا اسے پڑھا اور جس نے جو کچھ کہا اسے سننے کی کوشش کی اور جیسا کچھ لکھ سکتا تھا ان کے بارے میں لکھا بھی۔''(۲)

نگار کا حسرتؔ نمبر ادبی دستاویز ہے اور اس سے بہتر حسرتؔ کے بارے میں کوئی نمبر شائع نہیں ہوا اس

۱۔ نگار پاکستان مئی حسرت نمبر ۱۹۷۶ء ص: ۵

۲۔ نگار پاکستان مئی حسرت نمبر ۱۹۷۶ء ص: ۶

میں مولانا حسرت کی خودنوشت ''مشاہدات زنداں'' بھی پورے طور سے شائع ہے۔ یہ کتاب مدت سے نایاب تھی۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نگار مئی ۱۹۸۳ء کے ''ملاحظات'' میں رقمطراز ہوئے:

''مئی کا مہینہ کئی واسطوں سے میرے یادوں کا ہجوم لے کر آتا ہے۔ مولانا حسرت ۱۳ر تاریخ کو اور علامہ نیاز فتح پوری ۲۴ر تاریخ کو اسی مہینے میں رخصت ہوئے دونوں کو قدرے قریب سے دیکھنے اور تھوڑا سا وقت ان کے ساتھ گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی اول الذکر سے مجھے عقیدت رہی کہ قلب و روح کی طمانیت کا سامان فراہم کیا اور آخر الذکر سے موانست کہ ذہن وفکر کے سارے دریچوں کو کھلے رکھنے پر ہمیشہ آمادہ رکھا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے نگار مئی ۱۹۸۵ء میں ''ملاحظات'' کے کالم میں دو ہم عمر و ہم مکتب نابغہ ادب کے عنوان سے حسرت اور نیاز کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

''مولانا حسرت موہانی اور نیاز فتح پوری دونوں کی یادیں اور باتیں میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ دونوں کے کردار واطوار اور نگارشات واشعار سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ پہلے عام معاشرتی زندگی پر نظر ڈالتا تھا۔ تو یوں لگتا تھا کہ حریت قلم وحیرت فکر اور بے باکی وحق گوئی کے الفاظ بے معنیٰ ہیں لیکن مولانا حسرت اور علامہ نیاز کو دیکھنے، ان سے ملنے اور ان کو پڑھنے کے بعد میرا یہ خیال باطل ٹھہرا۔''(۲)

نگار (مئی ۱۹۸۷ء) میں فرمان صاحب نے ''ملاحظات'' میں یوں اظہار عقیدت مندی کیا:

''مئی کا مہینہ اردو زبان وادب کے دو بڑے ادیبوں کے سفر آخرت کا مہینہ ہے میری مراد مولانا حسرت اور علامہ نیاز سے ہے مجھے دونوں سے قرب

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۸۳ء ملاحظات از فرمان ص:۴

۲۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۸۵ء ملاحظات از فرمان ص:۷

ونیازمندی کاشرف حاصل رہاہے۔چنانچہ حسرت ہی کے الفاظ میں ۔

نہیں آتی جویادان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یادآتے ہیں تواکثر یادآتے ہیں

خاص طور پر مئی میں ان کی یادبری طرح ستاتی ہے۔''(۱)

نگار پاکستان مئی ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں:

''مولانا حسرت موہانی، زبان کے پارکھ اور عظیم غزل گو ہیں۔ دونوں حیثیتوں سے مجھے بہت عزیز ہیں لیکن مولانا سے کچھ اور نسبتیں بھی ہیں۔ وہ علامہ نیاز فتح پوری کے ممدوح اور ہم سبق و ہم دمدرسہ ہیں۔ میرا وطن قدیم فتح پور، ہسوہ ان کی ننہال ہے اور میٹرک تک ان کی تعلیم فتح پور میں ہوئی۔ مولانا اسی مدرسے کے طالب علم رہے ہیں جس کے اساتذہ کی جوتیاں بعد میں میں نے بھی اٹھائی ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر صاحب جون ۱۹۸۸ء کا اشاعت خاص مولانا حسرت موہانی کے نام کیا ہے۔ ملاحظات میں ڈاکٹر صاحب مولانا حسرت کے قیام فتح پور ہسوہ کا زمانہ یاد کیا ہے اس شمارے میں مولانا حسرت موہانی کا مشاہدات زنداں اور علامہ نیاز فتح پوری کا انتخاب کلیات حسرت کو شامل کیا ہے مولانا حسرت موہانی کا مشاہدات زنداں اس سے پہلے نیاز فتح پوری نے جون ۱۹۵۲ء کے نگار میں شائع کیا تھا۔ مشاہدات زنداں میں مولانا حسرت موہانی نے زمانہ قید کے واقعات اور مشاہدات اور جو مصائب دیکھا اور جھیلا اور گورے کالے کے فرق کو محسوس کیا اسے مشاہدات زنداں میں جیل کے حالات کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے نگار (مئی ۱۹۹۱ء) میں لکھا ہے:

''عجیب اتفاق ہے کہ حسرت و نیاز دونوں کا میرے آبائی وطن فتح پور سے گہرا تعلق تھا۔ نیاز صاحب کا تو خیر وہ گھر تھا مگر حسرت کے لئے بھی گھر جیسا تھا کہ دادیہال کی طرف سے انہیں فتح پور کے مشہور قصبہ کوڑا جہان آباد

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۸۷ء ملاحظات ص: ۷

۲۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۸۸ء ص: ۶

میں پورے تین گاؤں ورثے میں ملے ہوئے تھے۔ دونوں کی علمی وادبی زندگی کا آغاز بھی فتح پور کی سرزمین سے ہوا اور دونوں نے عمر بھر اس کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔"(۱)

نگار مئی ۱۹۹۲ء میں بھی لکھا ہے:

"مئی کا مہینہ میرے لئے یادوں کا ایک طویل سلسلہ لے کر آتا ہے یہ سلسلہ کبھی خوشگوار موسم لئے ہوتا ہے اور کبھی آنسوؤں کی جھڑی لگا دیتا ہے بے سبب نہیں اس کا سبب ہے۔ اردو زبان وادب اور صحافت کی دو عظیم شخصیات مولانا حسرتؔ موہانی اور علامہ نیازؔ فتح پوری نے اسی مہینے میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مجھے ہمیشہ کے لئے سوگوار کر گئے۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

"دونوں مجھے مئی کے مہینے میں بے تحاشہ یاد آتے ہیں اور رلاتے ہیں۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے یہ کرتا ہوں کہ مئی کے نگار کو ہر سال ان کے لئے وقف کر دیتا ہوں۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں مولانا حسرت کے سال وفات ۱۹۵۱ء کے بعد سے برابر جاری ہے۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مئی ۱۹۸۴ء کے نگار پاکستان میں "حسرت موہانی کی زندگی اور فن" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون لکھا جس کے اقتباس سے حسرت کی تحریر اور انکے زور قلم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اپنی صحافتی اور سیاسی زندگی میں مولانا حسرت کا مسلک یہ تھا کہ انہوں نے ہمیشہ وہی لکھا، وہی کہا جسے سچ جانا اور جو کچھ محسوس کیا جس طرح محسوس کیا

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۱ء ص: ۱۲

۲۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۲ء ملاحظات ص: ۸

۳۔ نگار پاکستان ۱۹۹۲ء ملاحظات ص: ۸

بڑی بے تکلفی اور بیبا کی سے۔ اسی طرح اپنے اشعار میں بیان کردیا۔ سچائی کے اظہار میں اس بے تکلفی اور بیبا کی کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ ان کی شاعری بلحاظ معنی کئی خانوں مثلاً عاشقانہ، نافعانہ، عارفانہ، فاسقانہ اور ناصحانہ وغیرہ میں بٹ گئی لیکن اظہار صداقت کے باب میں آپ اسے ان کی مجبوری کہہ لیجئے۔ ان کی زندگی کا خمیر کچھ ایسے عناصر سے تیار ہوا تھا کہ وہ پھانسی کے تختے پر لٹک سکتے تھے، زہر کا پیالہ پی سکتے تھے لیکن ایک چیز کو جس طرح وہ دیکھتے تھے جس طرح محسوس کرتے تھے اور جس طرح سمجھتے تھے اس کا اظہار من وعن اسی طرح کرنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب مئی ۱۹۹۲ء کا خصوصی شمارہ حسرت موہانی و نیاز فتح پوری کے نام کیا ہے۔ فرمان صاحب کی ان دونوں شخصیتوں سے عقیدت مندی کا ثبوت ان کے ملاحظات سے ہوتا ہے۔ اس شمارے میں علامہ نیاز فتح پوری کی (خودنوشت) والدمرحوم، میں اور نگار، امراؤ طارق کا مقالہ مولانا حسرت موہانی کی سوانح حیات اور رابعہ بیگم کا مقالہ حسرت کی خانگی زندگی کو جگہ دی ہے۔ اردو ادب سے محبت کرنے والے نہ حسرت و نیاز کو کبھی بھول پائیں گے اور نہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو بھول پائیں گے۔ نیاز صاحب کے نگار کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اسکے خاص نمبر اور سالنامے پابندی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں مومن نمبر شائع کیا۔

۱۹۴۸ء میں پاکستان نمبر، ۱۹۵۴ء میں فرمارو ایان اسلام نمبر، ۱۹۵۵ء میں علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر، ۱۹۵۸ء میں معلومات نمبر اور ۱۹۶۱ء میں غالب نمبر خود علامہ نیاز فتح پوری کی تحریریں ہیں، ان کے علاوہ نگار میں خاص نمبر شائع ہوئے جن میں اردو شاعری، ہندی شاعری، اصحاف کہف، خودنوشت، جدید شاعری، قرآن، انتقاد، افسانہ، مستقبل کی تلاش، اصناف سخن، انشائے لطیف بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نگار نے مومن بہادر، شاہ ظفر، مصحفی، نظیر اکبر آبادی، ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، داغ، غالب، جگر مراد آبادی اور اقبال جیسے شعراء پر خصوصی نمبر شائع کئے۔

(نگار پاکستان مئی ۱۹۸۴ء ص:۲۷)

نیاز صاحب کی وفات ۱۹۶۶ء کے بعد سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نگار پاکستان کے مدیر ہیں۔فرمان صاحب نے نومبر ۱۹۶۲ء سے ہی نگار پاکستان کی ترتیب کا کام سنبھال لیا تھا۔

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء تک فرمان صاحب نگار، پاکستان کو ایڈیٹ کرتے رہے اور یہ کام نیاز صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں ہوا۔

مئی ۱۹۶۶ء میں نیاز صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ اس وقت سے آج تک فرمان صاحب نگار پاکستان کے مدیر اعلیٰ ہیں اور یہ ادبی رسالہ اپنی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا چلا آ رہا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز صاحب کی تصنیفی و تالیفی سرمایہ (مطبوعہ کتابیں) کی تفصیل بیان کی ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''نگار'' کا اجراء ہے۔

آگرہ	فروری ۱۹۲۲ء سے	دسمبر ۱۹۲۲ء تک
بھوپال	جنوری ۱۹۲۳ء سے	جون ۱۹۲۷ء تک
لکھنؤ	جولائی ۱۹۲۷ء سے	جولائی ۱۹۶۲ء تک
کراچی	اگست ۱۹۶۲ء سے اب تک جاری ہے۔	

ان کی کتابوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ایک شاعر کا انجام

۲۔جذبات بھاشا ۳۔صحابیات

۴۔تاریخ الدولتین

۵۔المسلمۃ الشرقیہ (عربی سے ترجمہ)

۶۔عرض نغمہ (ترجمہ گیتانجلی)

۷۔فلاسفہ قدیم کی روحوں کا اجتماع

۸۔فراست الید

۹۔مکتوبات نیاز جلد اول

۱۰۔مکتوبات نیاز جلد دوم

۱۱۔مکتوبات نیاز جلد سوم

۱۲۔مذاکرات نیاز

۱۳۔نگارستان

۱۴۔جمالستان

۱۵۔ترغیبات جنسی

۱۶۔شہاب کی سرگزشت

۱۷۔مجموعہ استفسارات و جوابات حصہ اول

۱۸۔مجموعہ استفسارات و جوابات حصہ دوم

۱۹۔مجموعہ استفسارات و جوابات حصہ سوم

۲۰۔من ویزاں

۲۱۔نقاب اٹھ جانے کے بعد

۲۲۔گہوارۂ تمدن

۲۳۔انتقادیات جلد اول

۲۴۔انتقادیات جلد دوم

۲۵۔مذہب

۲۶۔حسن کی عیاریاں

۲۷۔مالہ وماعلیہ

۲۸۔نقش ہائے رنگ

۲۹۔مشکلات غالب

۳۰۔محمد بن قاسم سے بابر تک

۳۱۔مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

۳۲۔ تاریخ کے گمشدہ اوراق

۳۳۔ شبنم ستان کا قطرۂ گوہر

۳۴۔ من ویزاں حصہ دوم

نگار پاکستان کے خاص نمبروں میں مندرجہ ذیل کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

۱	نیاز فتح پوری نمبر حصہ اول	۱۹۶۳ء
۲	نیاز فتح پوری نمبر حصہ دوم	۱۹۶۳ء
۳	تذکروں کا تذکرہ نمبر	۱۹۶۴ء
۴	جدید شاعر نمبر	۱۹۶۵ء
۵	اصناف ادب نمبر	۱۹۶۶ء
۶	اصناف شاعری نمبر	۱۹۶۷ء
۷	مسائل ادب نمبر	۱۹۶۸ء
۸	غالب صدی نمبر	۱۹۶۹ء
۹	سر سید نمبر حصہ اول، دوم	۱۹۷۰ء
۱۰	میر انیس نمبر	۱۹۷۲ء
۱۱	مولانا حسرت موہانی نمبر حصہ اول	۱۹۷۳ء
۱۲	مولانا حسرت موہانی نمبر ۲	۱۹۷۴ء
۱۳	ڈاکٹر محمود حسین نمبر	۱۹۷۵ء
۱۴	قائداعظم نمبر	۱۹۷۶ء
۱۵	علامہ اقبال نمبر	۱۹۷۷ء
۱۶	مولانا محمد علی جوہر نمبر	۱۹۷۸ء
۱۷	قمر زمانی نمبر	۱۹۷۹ء
۱۸	مسائل زبان نمبر	۱۹۸۰ء

١٩	افسانہ اور افسانہ نگار نمبر	١٩٨١ء
٢٠	فن تاریخ گوئی نمبر	١٩٨٢ء
٢١	خطبات محمود نمبر	١٩٨٢ء
٢٢	جشن طلائی نمبر	١٩٨٣ء
٢٣	نیاز صدی نمبر	١٩٨٤ء
٢٤	فن عروض نمبر	١٩٨٥ء
٢٥	مکتوبات نیاز نمبر	١٩٨٥ء
٢٦	تنقید غزل نمبر	١٩٨٦ء
٢٧	غالب بنگاہ نیاز نمبر	١٩٨٧ء
٢٨	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	١٩٨٩ء
٢٩	اردو نثر کا فنی ارتقاء	١٩٨٩ء
٣٠	اقبال بنگاہ نیاز نمبر	١٩٩٠ء
٣١	نقد شعر نمبر	١٩٩١ء
٣٢	عورت فنون لطیفہ نمبر	١٩٩٢ء
٣٣	خدا نمبر	١٩٩٣ء

اس کے علاوہ دیگر خصوصی شمارے جو نگار پاکستان میں شائع ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

١۔	اردو ناول میں طنز و مزاح	١٩٨٨ء
٢۔	بہادر شاہ ظفر	١٩٨٨ء
٣۔	کلیم الدین احمد کی خود نوشت	١٩٩٠ء
٤۔	میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری	١٩٩٠ء
٥۔	اویس احمد کی تصنیف ولی دکنی	١٩٩١ء
٦۔	غالب کی فارسی غزل	١٩٩١ء

۷۔ خیام کی رباعیات کا اولین ترجمہ ۱۹۹۱ء

۸۔ جامع اردو ادیب، جشن زریں نمبر ۱۹۹۱ء

۹۔ ڈاکٹر گیان چندر ۱۹۹۱ء

۱۰۔ کتابیات تحقیق ۱۹۹۱ء

۱۱۔ مشاطہ سخن از صفدر مرزا پوری ۱۹۹۲ء

۱۲۔ مولوی عبدالحق ۱۹۹۲ء

۱۳۔ باغ و بہار مرتبہ سید رشید حسن خاں ۱۹۹۲ء

۱۴۔ بی امان اور بیگم حسرت موہانی ۱۹۹۲ء

۱۵۔ ن۔م۔راشد حیات اللہ انصاری ۱۹۸۵ء

۱۶۔ افادی ادب۔اختر انصاری ۱۹۸۵ء

۱۷۔ میر حسن کی غزل ڈاکٹر مظفر حنفی ۱۹۹۳ء

۱۸۔ اقبال کی نظری و عملی شعریات ڈاکٹر مسعود حسین ۱۹۸۷ء

۱۹۔ دوہا نگاری اور اس کا فن ۱۹۹۰ء

۲۰۔ بیاد مجنوں گورکھپوری ۱۹۸۸ء

۲۱۔ پریم چند، کچھ نہیں مباحث، مانک ٹالا ۱۹۸۹ء

☆☆☆

باب چهارم

نثری خدمات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

بحیثیت

نقاد و محقق

مقدمہ نگار

تذکرہ نگار

ایڈیٹر

بحیثیت محقق ونقاد

تحقیق وتنقید دراصل سکے کے دو پہلو ہیں یعنی کہ ان کے مابین گوشت وناخون کا رشتہ ہے اوراس رشتے کو اگر لازم وملزوم کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی وتنقیدی صلاحیت بھی لازم وملزوم کی طرح ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کی جھلکیاں بھی نمود پذیر ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کا رویہ کلاسیکی ہے، وہ ادبی زاویئے سے کسی بات کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے نظریات وخیالات کے ذریعہ ادب کی چاشنی میں ڈھال کر بات کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ کسی ادیب کے تخلیق پر اسکے ادبی اثاثے کی انفرادیت دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں فرمان صاحب نے وسیع الخیال نظریہ اپنایا ہے۔

حکیم نثار احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''نگار جیسے عہد ساز جریدے کی ادارت پر فرمان صاحب کا نام دیکھ کر مجھے احساس ہوگیا کہ وہ یقیناً علم وادب کے تناور اور تحقیق کے مرد میدان ہوں گے۔ پھر میں ان کے مضامین کا برابر مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ تنقید و تحقیق کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یہ وصف بہت سے ادیبوں کو میسر نہیں ہوتا ہے وہ روایت کے پرستار ہیں اوراس زمانے میں قدیم اقدار کی بقاء کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان میں ادبی لگن کے ساتھ ذہنی توازن بھی ہے جس سے تعمیری ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔ گہرے سمندروں سے موتی نکالنا اور اسے دنیائے ادب میں پیش کردینا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔''(۱)

تحقیق کی طرح تنقید کے لئے بھی سچی معلومات ضروری ہے۔ تحقیق میں ڈاکٹر صاحب کا رویہ سائنسی اور منطقی رہتا ہے۔ تحقیقی نوعیت کی کتابوں میں ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، اردو کی منظوم داستانیں، اردو رباعی، فنی وتاریخی ارتقاء، تحقیق وتنقید، اقبال سب کے لئے، غالب شاعر امروز فردا، نواب

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۵۸۳

مرزا شوق کی تین مثنویاں، دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ، اردو ہندی تنازعہ، اردو املا و قواعد میر انیس حیات و شاعری یہ کتابیں ڈاکٹر صاحب کی اہم تصانیف میں سے ہیں جس کا مفصل جائزہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق و تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر صاحب بات بغیر حوالے کے نہیں کہتے ٹھوس تحقیق کے بعد ہی اپنی تحریر کا جز بناتے ہیں، ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشکل سے مشکل موضوع کو اپنے مطالعہ تحسین سے اردو ادب کو سرفراز کیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''تحقیق و تنقید'' میں تحقیق کے متعلق اپنے خیال کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

> ''ادب کو تحقیق و تنقید کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ جب تک وثوق سے یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی ادب پارہ کس کی تحقیق ہے، کب اور کن حالات میں وجود میں آیا ہے اور جس زبان سے اس کا تعلق ہے اس میں زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کے کیا اصول ہیں اس وقت تک تنقید کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اسے قدم آگے بڑھانا ہے تو تحقیق کا سہارا لینا ہوگا۔ یہی حال تحقیق کا ہے تنقیدی شعور سے بے نیاز رہ کر وہ اپنی ادبی اہمیت نہیں منوا سکتی اگر اسے ادب کا مستقل جز بننا ہے تو غیر ضروری مسائل کو نظر انداز کر کے صرف اہم اور افادی امور کو ادبی تحقیق کا موضوع بنانا ہوگا۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب اپنی تحقیقی تصنیف میں مختلف ادیبوں و نقادوں کی آراء سے اختلاف بھی کیا اور مستند دلائل و حوالوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنے زور قلم سے سچی بات کہنے سے نہیں چوکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے متعلق آج کی تنقید اس سے بہت آگے بڑھ کر اپنے نقاد سے گہرے سماجی شعور اور وسیع مطالعہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ سماجی شعور اور مطالعہ جتنا ہمہ گیر اور پختہ اور دنیا کی مختلف زبانوں سے جتنا ہم رشتہ ہوگا اسی نسبت سے تنقید کی سطح پر فکر انگیزی اور سخن شناسی کی رنگا رنگ تہیں نمودار ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب ادب کے مختلف اصناف پر عمیق نگاہ رکھنے کے باوجود کسی تحقیق کو حرف آخر نہیں سمجھتے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۹ء ص:۲

''میں کسی رائے کو حرف آخر سمجھنے کی ہمت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ سائنس ہو یا ادب آج سے نہیں ہمیشہ سے تحقیق خود تحقیق کی دشمن ثابت ہوئی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب تحقیق میں افادیت پر زور دیتے ہیں اپنی کتاب ''تحقیق و تنقید'' میں محقق قاضی عبدالودود کے تحقیقی کام کا جائزہ پیش کیا ہے:

''غیر معروف شعراء اور بے جان اشعار کی تحقیق میں لگے رہنا یکسر غیر افادی کاوش ہے کاش قاضی صاحب جیسے معتبر محقق کی محنت و صلاحیت اس طرح ضائع نہ ہوتی اور وہ اپنی توجہ ادب کے اہم اور افادی پہلوؤں کی طرف مرکوز رکھتے۔''(۲)

ڈاکٹر صاحب کا نظریہ بڑا منصفانہ ہوتا ہے ان کی تحقیق حقائق کی روشنی میں دلائل وشواہد کے ساتھ ملتے ہیں۔ انکی تحریریں تحقیق کی بھٹی میں پک کر نکلے ہوتے ہیں جو ان کی محنت و مطالعہ کا ثبوت دیتے ہیں یہی ان کی تحریروں میں نمایاں خوبی نظر آتی ہے۔ جو لوگوں میں قبول عام بخشتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بلند پایہ محقق ہیں اور ان کی تصنیفات ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ مقبول ہیں۔

سرور انبالوی نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب اردو رباعی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں فرمان صاحب کی کتاب سے پہلے فن رباعی پر کوئی کتاب نہ تھی۔ اس کمی کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بطریق احسن پورا کیا۔ ان کی کتاب ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی اور بعد ازاں رباعی کے موضوع پر جتنی بھی کتابیں یا مقالے شائع ہوئے ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے استفادہ کیا گیا۔''(۳)

۱۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۱۴

۲۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۹ء ص:۶۶

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص:۲۲۷

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء'' پہلی بار ۱۹۶۲ء میں ماڈرن پبلشر کراچی سے دوسری بار مکتبہ عالیہ لاہور سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی جس میں رباعی کے متعلق تمام اصناف کے ماہرانہ عبور پر نظر ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے ''اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کی ترتیب میں میں نے اردو فارسی کی قدیم فنی اور تاریخی کتابوں سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ اردو فارسی کتابوں میں جو حوالے دیئے ہوئے ہیں ان پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ اصل ماخذات کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً فارسی کے جس قدیم و جدید تذکروں اور کتابوں کا ذکر کتاب میں آیا ہے وہ سب میرے ذاتی کتب خانوں سے تعلق رکھتی ہے اور میں نے ان کی چھان بین کے بعد اخذ نتائج کیا ہے۔ بعض معاملات میں مراسلت کے ذریعے مولانا نیاز فتح پوری، مولانا حامد حسن قادری، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر مصطفےٰ خان سے مدد لی ہے اور بعض امور میں ماہر القادری اور دوسرے بزرگوں سے مل کر تبادلہ خیال کے ذریعے فائدہ اٹھایا ہے۔''(۱)

اس سے اندزہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان صاحب نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں کہاں کہاں سے مواد حاصل کیا اور کتنی محنت کی ہے۔

فرمان صاحب نے صرف قدیم رباعی گو شعراء کے کلام کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ وہ عظیم رباعی شناس ماہر شمار کیے جاتے ہیں۔ صادقین کی رباعیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''صادقین کی رباعیاں انہیں ایک باکمال اور مشاق رباعی نگار ثابت کرتی ہیں، انکی بعض رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی نگاری سے ان کا تعلق بہت پرانا ہے اور زیر نظر مجموعہ سے بہت پہلے ۱۷۔۱۸ سال کی عمر تک وہ بہت سی

۱۔ اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم لاہور ۱۹۸۲ء ص: ۱۸

رباعیاں کہہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال چکے تھے۔ رباعی نگاری میں انہوں نے شاعری نہیں، واقعی ساحری کر دکھائی ہے اور زندگی کے جن پہلوؤں کی تصویر رنگوں کے ذریعے ممکن نہ تھی۔ الفاظ کی مدد سے بنا کر رکھ دی ہیں۔"(۱)

علامہ نیاز فتح پوری نے فرمان صاحب کی رباعی شناسی کی یوں داد دی ہے:

"فرمان فتح پوری یوں تو ادب کے قریب قریب تمام اصناف پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں لیکن صنف رباعی جو میرے نزدیک سب سے زیادہ مشکل صنف ہے اس کا مطالعہ انہوں نے خصوصیات کے ساتھ بڑے شوق اور محنت سے کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صنف رباعی کا کوئی تاریخی یا فنی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انہوں نے کامل غور نہ کیا ہو یا اسکی پوری تحقیق نہ کی ہو۔ اور اس غور و تحقیق کا نتیجہ یہ کتاب ہے جسے بعد میں ہر لحاظ سے قدر اول کی تصنیف خیال کرتا ہوں۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے:

"دوسری اصناف شعر کی طرح رباعی ایک قدیم اور اہم صنف ہے جو فارسی شاعری کے عین آغاز سے وجود میں آئی ہے۔ فارسی میں اس نے عمر خیام، ابوسعید، ابوالخیر اور سرمد کے ناموں کو دنیائے ادب میں آفتاب بنا کر چمکایا ہے اور اردو میں حالی، اکبر، انیس، امجد، جوش اور فراق کی شاعرانہ عظمت و شہرت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ تاریخ ادب شاہد ہے کہ رباعی میں رکاکت، ابتذال، فحاشی، بیہودہ گوئی، مبالغہ اور ہجو سے اپنے دامن کو کبھی آسودہ نہیں کیا۔"(۳)

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۳ء صادقین کی رباعی کا جائزہ ص:۹

۲۔ اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء فلیپ

۳۔ اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص:۱۴

سید حامد حسن قادری صاحب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء کے متعلق لکھتے ہیں:

"فرمان فتح پوری صاحب نے فارسی رباعی کے آغاز و ارتقاء سے شروع کر کے اردو رباعی کے متعلق تمام معلومات نہایت مبصرانہ و امورخانہ انداز و اسلوب کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں۔ رباعی کی ایجاد، رباعی کے نام، رباعی کے شعراء اور ان شعراء کے کلام سے مثالیں یہ سب کچھ ایسی مہارت اور کمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ بے اختیار دل سے داد نکلتی ہے اور دعا بھی کہ توقیع قبول روز لیش باد۔"(۱)

مجنوں گورکھپوری فرمان فتح پوری کے مضمون رباعی کے متعلق لکھتے ہیں:

"فرمان فتح پوری کے دو مضامین میری نظر سے گذرے ایک تو وہ جو انہوں نے صحیفہ لاہور کے کسی شمارے میں لکھا ہے۔ یہ مضمون مجھے خلیل الرحمٰن اعظمی کے ذریعے ملا۔ دوسرا مضمون وہ تھا جو فرمان صاحب نے نگار بابت ۱۹۶۰ء میں رباعی کے بارے میں لکھا ہے۔ اگر یہ دونوں مضامین میری نظر سے گذر چکے ہوتے تو شاید میں اس مبحث پر لکھنے کی زحمت گوارہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ اس لئے کہ فرمان صاحب نے بڑے ٹھنڈے اور سنجیدہ لہجے میں کم و بیش وہی سب باتیں کہی ہیں جو میں نے کہی ہیں۔"(۲)

رباعی کے فکر و فن اور تاریخ و تنقید اور رفتار و ارتقاء پر اب تک کوئی مستقل تصنیف منظر عام پر نہیں آئی۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کی کتاب "اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقاء" ایک تحقیقی کام ہے جس میں رباعی کے تمام موضوعات کو یکجا کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا ہے۔

۱۔ اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء فلیپ

۲۔ ہماری زبان علی گڑھ، مجنوں گورکھپوری، ۸؍ جون ۱۹۶۰ء ص: ۱۳

''رباعی پر مستقل اور مبسوط کام ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقاء'' کراچی ۱۹۶۲ء یہاں اس موضوع پر واحد اور محققانہ و ناقدانہ مقالہ ہے۔ اس میں عہد قدیم سے عہد جدید تک اس صنف سخن کی ارتقائی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔''(۱)

رباعی کے بارے میں فرمان صاحب نگار لکھنؤ کے اصناف سخن نمبر میں بعنوان ''اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء'' جنوری ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مشکل موضوعات پر بھی لکھنے کی لگن ابتداء سے ہی فرمان صاحب میں موجود تھی۔ کہنے کو فن رباعی پر یہ چند صفحے کا مضمون ہے لیکن فن رباعی کے بارے میں اتنا کچھ مواد اکٹھا کر لیا ہے کہ اس کو پڑھ کر اس فن کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتا ہے۔

اس مضمون میں صنف رباعی کے ابتدائی نام اس کے وزن بحر اور اس کے اوزان کو دائرہ بنا کر پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری رباعی کا پہلا شاعر کے متعلق لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نے شعر العجم میں رودکی کو رباعی کا موجد اور پہلا شاعر مانا ہے جس کی تردید حافظ محمود شیرانی نے بھی کی ہے۔ اور بھی دیگر قدیم رباعی نگار ملتے ہیں مگر کسی کو اس سے اتفاق رائے نہیں البتہ فارسی میں عمر خیام اور سرمد کا ذکر سرفہرست ملتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے قلی قطب شاہ کو اردو رباعی کا پہلا شاعر کہا ہے، لکھتے ہیں:

''اردو کے پہلے با دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ء کے کلیات میں متعدد رباعیاں موجود ہیں اور چونکہ قلی قطب شاہ سے پہلے کسی شاعر کا ایسا کلام دستیاب نہیں ہوا جو قلی قطب شاہ سے اولیت کا سہرا چھین سکے اس

۱۔ اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۸ء جلد دوم ص: ۳۷۲، ۳۷۳

۲۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۹۸ء ۳۱۳، ۳۱۴

لئے اردو شاعری کے اسی بابا آدم کو اردو رباعی کا پہلا شاعر سمجھنا چاہئے۔"(۱)

دکنی شعراء میں محمد قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی اور ولی دکنی وغیرہ نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ دہلوی شعراء میں دردؔ، سوداؔ، میرؔ شیخ چاند، میر حسن، عبدالحیٔ تاباں اور احسن اللہ خاں وغیرہ شاعروں کے یہاں رباعیاں ملتی ہیں۔ غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، شیفتہؔ کے دور میں خاص طور پر مومن نے رباعی کی طرف توجہ کی اور بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔

لکھنوی شعرا نے رباعی نگاری کو آگے بڑھایا جن میں ناسخؔ، آتشؔ، انشاؔء، جرأتؔ، نظیر اکبرآبادی اور انیسؔ و دبیرؔ نے اپنے مذہبی خیالات و واقعات کربلا کو اپنے اشعار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ حالیؔ، اکبرؔ اور امجدؔ حیدرآبادی بھی رباعی کے میدان میں پیچھے نہیں رہے ڈاکٹر صاحب غالبؔ اور امجد حیدرآبادی کی رباعی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "رباعی کے وزن میں غالبؔ جیسا شخص دھوکا کھاتا ہے۔ لیکن امجد ہیں
> کہ نظمیں بھی رباعی کے وزن میں کہتے ہیں۔ ان کے مجموعے کلام میں کئی
> نظمیں رباعی کے بحر میں ہیں۔"(۱)

حالیؔ، اکبرؔ و امجدؔ کے بعد فانیؔ، سیمابؔ، محرومؔ، رواںؔ، یگانہؔ اور فراقؔ کی رباعیوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا ہے۔ بعد ازاں اسی موضوع پر ۱۹۶۲ء میں دوسری بار ۱۹۸۲ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئی جس میں فن رباعی پر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا انتساب محقق و نقاد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور افسانہ نگار امراؤ طارق کے نام کیا ہے۔ کتاب سے پہلے دیباچے میں نیاز فتح پوری، حامد حسن قادری اور مجنوں گورکھپوری کی آراء کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب سے پہلے طبع اول کے دیباچے میں خود فرمان صاحب کے خیالات رباعی کے متعلق درج ہیں جس میں رباعی کے فنی لوازم و خصوصیات، رباعی کی ایجاد وزن کے مباحث، فارسی رباعی کا آغاز و ارتقاء، اردو رباعی کی ابتداء و ارتقاء اردو رُباعی شمالی ہند میں، دہلی، لکھنؤ کے رباعی نگار شعراء رباعی کا اہم دور غالبؔ و انیسؔ، دبیرؔ، مومنؔ و ذوقؔ کا عہد، دور جدید کے رباعی نگاروں میں مولانا حالیؔ، اکبرالہ

۱۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۹۸ء ۳۱۴

۲۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۹۸ء ص ۳۲۷

آبادی، اسماعیل میرٹھی، مجروحؔ اور شادؔ عظیم آبادی، امیرؔ مینائی، داغؔ، چکبستؔ اور دوسرے شعراء وغیرہ ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ممتاز رباعی نگاروں میں فانی، جوش، فراق، امجد، جگت موہن لال رواںؔ، یگانہ چنگیزی، سیماب، عبدالباری آسی، آغا قزلباش، حامد حسن، آثرؔ لکھنوی وغیرہ رباعی کے امکانات، ضمیمہ اول، تحقیقات شادانی پر ایک نظر ضمیمہ دوم، کیا کیا خضر نے سکندر سے اور آخر میں ماخذات کا ذکر ہے۔

اسی کتاب میں ایک جگہ رباعی کے ابتدائی ناموں کے متعلق بحث ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''رباعی کا ابتدائی نام ترانہ ہے، ترانہ ایرانی الاصل ہے اور رباعی کے دوسرے ناموں چہار بیتی مصراعی وغیرہ کی طرح فارسی و عربی الفاظ سے مرکب نہیں ہے۔''(۱)

رباعی کے اشعار میں موسیقی و نغمگی پائی جاتی ہے اس لئے اس کا نام ترانہ رکھا۔ محمد بن قیس قاضی اور قدر بلگرامی نے اپنی اپنی کتاب میں رباعی کو ترانہ ہی قرار دیا ہے۔ رباعی کے ایک اہم دور میں ڈاکٹر صاحب نے انیس و دبیر کے رُباعیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انیسؔ کے مجموعہ کلام میں تقریباً ساڑھے پانچ سو اور دبیرؔ کے یہاں دو سو رباعیاں ہیں، انیس و دبیر دونوں کی رباعیاں انکے مجموعے کلام سے الگ کر کے مجموعہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔''(۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنوی شعراء میں سب سے زیادہ رباعی انیس و دبیر نے کہی ہے فن مرثیہ کی طرح رباعی میں بھی انیس و دبیر نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب دور جدید کے رباعی نگاروں میں حالیؔ و اکبرؔ کی رباعی کا امتیاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالیؔ کی طرح اکبرؔ کی رباعی نگاری کا مقصد بھی اصلاحی ہے ان موضوعات میں بھی چنداں فرق نہیں ہے۔ جو چیز ان دونوں کے یہاں مابہ الامتیاز ہے وہ صرف ان کا اپنا انفرادی انداز بیان ہے۔ حالیؔ نے جس کام کو

۱۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص: ۳۲

۲۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص: ۸۸

انتہائی سنجیدگی، متانت، خاموشی اور سادگی سے انجام دیا۔ اکبر نے اسے طنز و ظرافت، قہقہہ اور شوخی کی مدد سے پورا کیا بلکہ انداز بیان کی قدرت کے لحاظ سے اکبر کا مرتبہ حالی سے بلند ہے۔"(۱)

حالی و اکبر کی رباعیوں میں قومی و وطنی اصلاح نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"رباعی کا اردو شاعری پر سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ اس نے اردو شاعری کے عام لب ولہجہ کو سنجیدہ بنانے میں مدد دی ہے۔"(۲)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"جدید رجحانات میں غزل و نظم کی طرح اردو رباعی کو بھی متاثر کیا اور بیسویں صدی کے اوائل ہی میں جوش، فراق، امجد، سیماب، یگانہ اور رواں وغیرہ چند ایسے بڑے رباعی نگار پیدا ہو گئے جنہوں نے اس پس افتادہ صنف کو نظم وغزل کے برابر لا کھڑا کیا۔"(۳)

طبع دوم کی اس کتاب میں شامل ضمیمہ اول "تحقیقات شادانی پر ایک نظر" اور ضمیمہ دوم، کیا کیا خضر نے سکندر سے، یہ دونوں ضمیمے مضمون کی شکل میں فرمان صاحب کی دوسری کتاب "تحقیق و تنقید" طبع اول ۱۹۶۲ء میں طبع دوم ۱۹۷۲ء میں خواجہ پریس دہلی سے بعنوان "شخصیت وتنقید وتمثیل نگاری" میں بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں فرمان صاحب کی وہ مضامین شامل ہے جو مختلف جگہ پر شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کو تحقیقی نوعیت کا درجہ ملا ہے۔

مثنوی نگاری سے ڈاکٹر فرمان صاحب کو خاص دلچسپی رہی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک ڈاکٹر صاحب کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں "اردو کی منظوم داستانیں" ۱۹۷۱ء دریائے عشق اور بحرِ محبت کا تقابلی مطالعہ ۱۹۷۲ء نواب مرزا شوق کی تین مثنویاں، مذہب عشق، زہر عشق ۱۹۷۱ء اور اردو کی بہترین مثنویاں

۱۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص: ۹۵

۲۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص: ۱۴۶

۳۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص: ۱۴۷

۱۹۹۳ء اس کے علاوہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء میں مثنوی سحر البیان کے پس منظر پر ایک نظر اور گلزار نسیم کی نمایاں خصوصیات پر اپنا مضمون شامل کیا ہے۔ اردو مثنوی پر فنی و تحقیقی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اردو کی بہترین مثنویاں میں لکھتے ہیں:

''مثنویات پر تحقیقی و تنقیدی بحث کے آغاز سے پہلے ایک التزام یہ کیا گیا ہے کہ ہر مثنوی کے مصنف کا سوانحی خاکہ مختصر الفاظ میں دے دیا گیا ہے۔ یہ خاکہ قاری کے تاریخی شعور کو مہمیز کرے گا اور اسے مثنوی نگار کے اس عہد خاص اور فضائے حیات میں لے جائے گا جس میں مثنوی کا پس منظر و منظر ہی نہیں پیش منظر بھی روشن تر نظر آئے گا۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں خاص کر مثنوی سحر البیان، گلزار نسیم اور زہر عشق پر قلم اٹھایا ہے اور ان پر مفصل بحث کی ہے۔ فرمان صاحب مثنوی کے موضوع بحر و وزن اور اشعار کے متعلق لکھتے ہیں:

''مثنوی موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے ہر قسم کے داخلی و خارجی موضوع پر مثنوی کہی جا سکتی ہے۔ نہ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ بحر وزن کی کوئی تخصیص۔ مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مثنوی، جس بحر و وزن میں چاہے کہہ سکتے ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب مثنوی نگاری کو اپنے تحقیق و تنقید کا موضوع بنا کر اس پر مسلسل کام کرتے رہے ایسا نہیں اس موضوع پر کام نہ ہوا ہو، اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر چند ایک فرمان صاحب کا کام بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ اردو کی منظوم داستانوں میں، سحر البیان، گلزار نسیم، زہر عشق وغیرہ کے متعلق رقمطراز ہیں:

''سحر البیان، گلزار نسیم، زہر عشق، بہار عشق اور قول غمگین وغیرہ ایسی

۱۔ اردو کی بہترین مثنویاں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۸

۲۔ اردو کی بہترین مثنویاں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص: ۷

فنکارانہ نظمیں ہیں جن کی شاعرانہ عظمت واہمیت ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ انقلابات پہلے بھی آئے ہین اور آئندہ بھی آتے رہیں گے۔لیکن یقین ہے کہ وہ ان نظموں کوفنا نہ کرسکیں گے۔اس لئے کہ ان کی عظمت،عظمت فن پر قائم ہے اور فنی عظمت کبھی انقلاب کا شکار نہیں ہوتی۔''(۱)

بقول پروفیسر افتخار اجمل شاہین:

''اردو کی بہترین مثنویاں تحقیق وتنقید کے امتزاج کی ایک بہت خوبصورت مثال ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب ''نواب مرزا شوق کی مثنویاں'' کے دیباچے میں زہر عشق کے متعلق لکھتے ہیں:

''زہر عشق اردو کی وہ مشہور زمانہ مثنوی ہے جس کا نام عام وخاص سبھی نے سن رکھا ہے۔ یہ مانا کہ اردو کی مشہور ترین مثنویوں میں ''سحر البیان اور گلزار نسیم کے نام بھی شامل ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے سوا دوسرے طبقے کے لوگ نہ تو اس مثنویوں سے کچھ زیادہ واقف ہیں اور نہ ان سے پورا لطف اٹھاسکتے ہیں۔''زہر عشق'' کی مقبولیت کی نوعیت ان سے بہت مختلف ہے۔ بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں سے لے کر معمولی اردو خواں تک شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو،جس نے مثنوی زہر عشق نہ پڑھی ہو جو کھلے بندو نہیں پڑھ سکے۔انہوں نے چھپ کر پڑھی اور جو پڑھنے سے معذور ہیں انہوں نے اپنے دوستوں سے اور ہم عمروں سے پڑھوا کر سنی ہے۔ پڑھنے اور سننے کا یہ ذوق وشوق کسی نہ کسی طور پر آج بھی لوگوں میں باقی ہے اس مقبولیت کا سبب مثنوی زہر عشق میں وہ ظاہری ومعنوی خوبیاں ہیں جو اردو کی کسی اور مثنوی میں نظر نہیں آتی۔''(۳)

۱۔اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۷۱ء ص:۶۷۹

۲۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص:۳۷۳

۳۔نواب مرزا شوق کی مثنویاں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء دیباچہ ص:۲

اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان صاحب کی ایک اور تصنیف دریائے عشق اور بحرالمحبت کا تقابلی مطالعہ ہے میر کی مثنوی دریائے عشق ایک نوجوان اور ایک حسینہ کے ربط باہمی کی کہانی ہے جسے مصحفی نے دوبارہ بحرالمحبت کے نام سے نظم کی ہے۔ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ یہ سب اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی ترجمان اور میر تقی میر کی شخصیت و مزاج کی عکاسی ہیں لیکن شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے ان کی عشقیہ مثنویاں زیادہ قابل توجہ ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب مصحفی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں ان کی جامعیت قادر الکلامی اور نرم لب و لہجے کی دلکشی کا اعتراف کم وبیش ہر ناقد نے کیا ہے اور شاعری کے اصول وضوابط کی پیروی کے لحاظ سے انہیں اساتذہ سخن میں شمار کیا جاتا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ان کی ہر معاصر اور بعد کے ہر نقاد نے یہ بھی کہا ہے کہ انکے کلام میں ہمہ رنگی تو ہے لیکن یک رنگی نہیں ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتب کی ہوئی کتاب ''اردو شاعری فنی ارتقاء'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، واسوخت، ریختی، قطعہ، گیت، شہر آشوب، منظوم، ڈرامہ، سانٹ، دوہا، پیروڈی اور ہائکو پر فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین پروفیسر عبدالقادر، فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گوکھپوری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، شمیم احمد، نیاز فتح پوری، آل احمد، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وزیر آغا، انجم اعظمی، امیر احمد علوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابو محمد سحر، مولانا ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر ابولیث صدیقی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر صفدر حسین، سید شاہ ولی الرحمٰن ولی، شعیب اعظمی، ڈاکٹر گیان چند، سلیم اختر، سید تمکین کاظمی، کوثر چاند پوری، اظہر علی فاروقی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکر عزیز تمنائی، سلیم

۱۔دریائے عشق اور بحرالمحبت کا تقابلی مطالعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء دیباچہ ص:۴

۲۔دریائے عشق اور بحرالمحبت کا تقابلی مطالعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء دیباچہ ص:۶

جعفر اور فضل جاوید کے مضامین ہیں۔ انتخاب مضامین بہت خوب ہے اور مختلف اصناف کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جو بہت مفید ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے اپنی مضامین بھی کئی موضوعات پر شامل کئے ہیں۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''مثنوی'' ''گلزار نسیم'' کے بارے میں فرمان صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔

سحر البیان کے پس منظر پر ایک نظر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مثنوی سحر البیان کی بحر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ممکن ہے کہ انشاء نے یہ بات اپنے پھکڑ پن میں میر حسن کا مذاق اڑانے کے لئے بطور طنز لکھ دیا ہو کہ میر حسن عشقیہ مثنوی کے لئے رزمیہ بحر کا انتخاب کر کے جدت طرازی کی ہے۔ یہ بات اس لئے قرین قیاس ہے کہ اول تو انشاء کی ہر بات سنجیدہ نہ ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ وہ سحر البیان جیسی بلند پایہ مثنوی کو امتحان کی نظر سے دیکھتے تھے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''میر حسن فطری شاعر تھے اور خلق و ایجاد کی خاص قوت لے کر آئے تھے اس لئے ان کی مثنوی کسی تقلید کا شکار نہیں ہوئی۔ انہوں نے یقیناً اپنے پیش رو شعراء کی مثنویوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ استفادہ اس نوعیت کا ہرگز نہیں جو انہیں ان کا مقلد تتبع ثابت کر سکے۔ مثنوی و سحر البیان کا رنگ تقلید و تتبع سے یکسر پاک ہے اور ایک ایسے طرز خاص کی حامل ہے جسے اردو بیانیہ شاعری کا معیار و میزان قرار دیا جا سکتا ہے۔''(۲)

''گلزار نسیم'' کی نمایاں خصوصیت کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

۱۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص ۱۸۸، ۱۸۹

۲۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص ۱۹۲

''گلزارنسیم ۱۲۵۴ھ میں مکمل ہوئی اور دیاشنکر نسیم کا نام میر حسن کے نام کے ساتھ لیا جانے لگا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اختصار و ایجاد کا فن جس حسن و خوبی سے گلزار نسیم میں برتا ہے اردو شاعری میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ ایجاز کے لئے استعارات، کنایات، تلمیحات اور بعض صنائع کا استعمال ناگزیر ہے۔ ان کے بغیر کلام کو بلیغ و مختصر بنانا مشکل ہے لیکن ان تمام چیزوں کو کلام میں خوبصورتی برتنے کا سلیقہ سب میں نہیں ہوتا اور اس لئے صنعتیں اکثر تزئین کلام کے بجائے اس کا عیب بن جاتی ہیں۔ نسیم چونکہ تشبیہات، استعارات، کنایات، تمثیلات اور صنائع اور بدائع کے استعمال کا خاص سلیقہ ہے اس لئے کلام ایجاز و اختصار کا حامل ہوتے ہوئے بھی حسن و اثر سے عاری نہیں ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب چکبست کے ہم خیال ہیں کہ انہوں نے رعایت لفظی کو شروع سے آخر تک برتا ہے اور اسی وجہ سے کلام کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''نسیم نے اپنے استاد آتش ہی کے مقدمے کے مطابق الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑا ہے اور شاعری سے مرصع سازی کا کام لیا ہے۔ نسیم نے اس اصول کو دانستہ برتا ہے اور ایسے سلیقے سے برتا ہے کہ دوسرے اردو شاعر سے ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا اپنا الگ رنگ ہے سحر البیان سے الگ اور اردو کی تمام مثنویوں سے الگ اس رنگ میں شدید تاثیر نہ سہی لیکن لطف سخن کا اور سارا سامان موجود ہے۔''(۳)

۱۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص ۱۹۳
۲۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص ۱۹۴
۳۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص ۲۰۲

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت مدیر نگار پاکستان اردو کی نایاب وکامیاب کتابوں کومحفوظ کرنے کے لئے ان کو دوبارہ خصوصی شماروں میں شامل کیا۔ نگار پاکستان (ستمبر ۱۹۸۹ء) کے خصوصی شمارہ میں رباعیات سرمد مع منظوم اردو ترجمہ کو شائع کیا۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا یادگار تحقیقی مقالہ بھی بطور مقدمہ شامل ہے جو انہوں نے بقول فرمان فتح پوری سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے سے پہلے سرمدؔ کے سوانح پر لکھا تھا۔ فرمان صاحب نے ملاحظات میں لکھا:

''یہ مقالہ آج تک قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور شاید ہمیشہ دیکھا جائے گا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے:

''جواہر منظوم ترجمہ اردو رباعیات سرمدؔ طبع چہارم کا ایک مجلّا نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ میری ان پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے جسے میں ہندوستان سے پاکستان آتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا یہ میرے والد مرحوم (متوفی ۱۹۳۳ء) کے ذاتی ذخیرۂ کتب فارسی کی یادگار ہے۔ اس کے سرورق پر اور جلد کے اندرونی حصوں میں بہت سی خاندانی یادداشتیں درج ہیں۔''(۲)

نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۹ء بھی ''رباعیات سرمدؔ'' سے متعلق تھا جو ستمبر کے پرچے کا تتمہ تھا۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مقدمے کے آخر میں لکھا۔ ''عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا اور ایک ہی سال کے بعد سرمدؔ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ

۱۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۹ء خصوصی شمارہ ملاحظات ص:۳

۲۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۹ء خصوصی شمارہ ملاحظات ص:۵

خونے کہ عشق ریز دہر گز بدر نباشد

یہ سرمدؔ کے خون کی ہی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالم گیر کو کبھی

راحت واطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے۔"(۱)

چند رُباعیات سرمدؔ اوران کامنظوم اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔سرمدؔ

دربادیۂ تجربہ یارب ہمہ جا — افتادسرد کاربہ زیشت وزیبا

غیرازتوکسے نہ گشت گردیادرسم — دیدم ہم راوآزمودم ہمہ را

ترجمہ

میدان میں تجربہ کے اے بارے خدا — ہر اچھے برے سے کام اپنا اٹکا

کب تیرے سوا سنی کسی نے فریاد — ہر ایک کو میں خوب دیکھا بھالا

شادی بو از دین و دنیا ہمہ را — از ہر دو نجات وہ کہ شادیست مرا

آشفتۂ خود بکن کہ آنم ہوس است — از پردہ بروں آتی و خود بنمارا

ترجمہ

ہے سب کی خوشی حصول دین و دنیا — دونوں سے نجات دے یہ ہے ارمان مرا

اپنا ہی بنالے مجھے حسرت یہ ہے — پردہ سے نکل کر اپنا جلوہ دکھلا

ادب پاروں سے محبت کرنے والے ہمیشہ ڈاکٹر فرمان صاحب کے احسان مند رہیں گے کہ نگار پاکستان کے ذریعہ انہیں رُباعیات سرمدؔ اوراس کے منظوم ترجمے سے لطف اندوز ہونے کاموقع ملا۔

ایک اور مثال لیجئے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار پاکستان جون ۱۹۹۲ء میں عمر خیام کی رباعیات کا اولین اردو منظوم ترجمہ شائع کیا۔اس کے مترجم راجا لکھن لال ہیں۔جنہوں نے ۱۲۶۰ھ میں ترجمہ کیا تھا جسے ڈاکٹر محمد تقی الدین احمد نے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار اپنے مقدمے کے ساتھ صرف پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا تھا۔اس میں خیام کی ۳۲۳ رُباعیات شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے ملاحظات میں لکھا ہے:

۱۔نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۹ء خصوصی شمارہ ص:۱۶

''مرتب کا مقدمہ جامع ہے اور اس میں راجا مکھن لال اور عمر خیام دونوں کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ رباعیات کے وزن و ایجاد کے بارے میں بھی مرتب نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس میں کئی باتیں محل نظر اور غلط محض ہیں۔''(ا)

منظوم ترجمے کی دو مثال ملاحظہ فرمایئے۔ عمر خیام

آمد سحرے نداز مئے خانۂ ما   کے رند خرا باتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پرنم کینم پیانہ زمے   زاں پیش کہ پرکنند پیانۂ ما

ترجمہ

دی بادِ سحر نوید دیوانے کو   یعنی دل مے گسار مستانے کو
اٹھ بھر لیں بہ عشق دوست ساغر اپنا   ان سے آگے بھر جو پیانے کو

خارے کہ زیر پائے حیوانیست   زلف ضع و ابروئے سلطانیست
ہر خشت ک برکنگرہ ایوانیست   انگشت وزیرے و سرسطاسیت

ترجمہ

جو خاک زیر پائے ہر حیوان ہے   وہ مشت غبار حضرت انسان ہے
اور خشت جو ہیں کنگرہ ایوان کے   انگشت وہ زیر ہے، سرسلطانی بنے

تحقیق وتنقید

اردو کی نعتیہ شاعری ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تحقیقی کارنامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری ۱۹۷۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی اس سے پہلے بھی کئی نعتیہ شاعری کی

ا۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۲ء ملاحقات ص: ۷

کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب نے اردو کی نعتیہ شاعری پر قلم اٹھایا ویسے تو ڈاکٹر صاحب شاعر بھی ہیں سخن فہم بھی ہیں مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اردو ادب کے وہ سہ پارۂ جو گذشتہ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے فرمان صاحب کے انتھک محنت کے نتیجے میں وہ سارے مضامین محفوظ اور مرتب شکل میں اردو والوں کے ہاتھوں میں پہونچ گئے۔ فرمان صاحب کے کتابوں کا بہت بڑا حصہ ان کا مرتب کیا ہوا ہے۔

فرمان صاحب کا نہ صرف مطالعہ بہت وسیع ہے، بلکہ قوت انتخاب بھی متنوع ہے، مثال کے طور پر ان کی ''نعتیہ شاعری'' پیش کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کو ترتیب دینے میں اپنی کوشش بھر خاصی محنت کی ہے لیکن نعتیہ شاعری پر اس سے کہیں بہتر کام کیا جاچکا ہے۔

فرمان صاحب کی اس کتاب میں ''عربی و فارسی نعت اور اردو پر اس کے اثرات'' اس عنوان کے تحت خاصہ طویل مضمون جو ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے جو اس مجموعہ میں شامل کیا ہے۔ فرمان صاحب نے اردو کے جن معروف اور غیر معروف شعراء کو یکجا کر دیا ہے بہر حال قابل قدر ہے۔ اس لئے کہ پراگندہ اور منتشر اوراق کو یکجا کر دینا اپنے آپ میں ایک کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے یہاں نعتیہ شاعری یا ایسی شاعری جس کے موضوع کا تعلق اسلام یا اسلامی اقدار و روایات سے ہو کچھ زیادہ لائق پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ اول تو ان اقدار کی متحمل نظموں کو مذہب، اخلاقیات اور تاریخ کا منظوم درس خیال کر کے ہمارے ناقدین ان پر نظر ڈالنا ہی پسند نہیں کرتے اور اگر بے دلی و تنگ نظری کے ساتھ کسی نے اس پر توجہ کی تو ایسی نظموں کو صحافت سے قریب تر موضوعاتی شاعری کا نام دے کر انہیں بے وقعت اور کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''(۱)

۱۔ اردو کی نعتیہ شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص: ۲۳

ڈاکٹر صاحب نعتیہ شاعری میں خود لکھتے ہیں:

''میری کتاب نعتیہ شاعری کے موضوع پر کوئی محققانہ کتاب نہیں، اسے اردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ اس میں نعتیہ شاعری کے سارے ادوار و افراد اور احوال و آثار کی تفصیل تاریخ وار بلحاظ درج نہیں ہے۔ یہ نعت گو شعراء کا تذکرہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس میں سارے شاعروں کا ذکر نہیں چند کا ذکر آیا ہے۔ یہ اردو کی نعتیہ شاعری پر جامع تنقیدی تصنیف بھی نہیں ہے بلکہ زیر نظر کتاب اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک سرسری مبصرانہ جائزہ ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر صاحب ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''میری کتاب اس حد تک محققانہ ضرور ہے کہ اس کا معلوماتی حصہ سنی سنائی باتوں کے سہارے نہیں لکھا گیا بلکہ جن شعراء کے نعتیہ کلام کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے ان کے کلام پر ایک نظر ضرور ڈالی گئی ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''کتاب کے آخر میں اردو فارسی نعتوں کا ایک انتخاب بھی دے دیا گیا ہے یہ انتخاب دو باتوں کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ نعتیہ شاعری کے بڑے ذخیرے کا کچھ اچھا حصہ بہ یک نظر ہمارے سامنے آ جائے اور اس کی قدر و قیمت کا ہمیں بآسانی اندازہ ہو سکے دوسرے اس لئے کہ انتخاب کے ذریعے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو بعض معیاری نعتیں پڑھنے کو مل جائیں۔'' (۳)

۱۔ اردو کی نعتیہ شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء ص: ۱۵

۲۔ اردو کی نعتیہ شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء ص: ۱۶

۳۔ اردو کی نعتیہ شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء ص: ۱۷

اس کتاب میں ایک باب عربی فارسی نعت اور اردو پر اس کے اثرات کے موضوع پر ہے جس میں حسان بن ثابت، کعب بن زبیر بوصیری، سعدی، امیر خسرو، جامی، قدمی اور بعض دیگر شعراء کا ذکر کیا ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اردو میں نعت گوئی کی مقبولیت اور اس کے اسباب ومحرکات کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو کی نعتیہ شاعری کا مبصرانہ جائزہ لیا ہے جس میں رسمی نعت گوئی اور اس کی مختلف صورتیں، اردو میں حقیقی نعت گوئی کے دور کا آغاز، محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری اور اس کی خصوصیت، امیر مینائی، مولانا حالیؔ اور مولانا ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری، علامہ اقبالؔ کی شاعری اور نعت کے موضوع سے اس کا رشتہ بعض صوفی عالم شاعر اور ان کا نعتیہ کلام، چودھری دلورام کوثری ایک ہندو عاشق رسول منظوم تاریخ اسلام وسیرت نبویؐ کے مختلف مجموعے اور شاہ نامۂ اسلام، عہد حاضر کے بعض نعت گو شاعر اور ان کے نعتیہ کلام کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''دکن، دہلی، لکھنؤ، رام پور، بھوپال، حیدر آباد اور لاہور جہاں جہاں اردو شاعری کے مرکز قائم ہوئے ہر جگہ بزم شعراء میں نعت کا موضوع مقبول عام وخاص رہا اور ہر دور میں بعض بہت اچھی نعتیں لکھی گئیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اردو میں نعت گوئی کا سلسلہ زیادہ تر رسمی رہا ہے۔''(۱)

اردو کی نعتیہ شاعری میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے بعد حالیؔ نے بھی نعت گوئی سے گہری دلچسپی لی ہے۔ اس کے بعد سب سے ممتاز اور اہم نام علامہ اقبالؔ کا ہے اقبال کے بعد اردو شعراء میں نعت گو کی حیثیت سے مولانا ظفر علی کا نام لیا جاتا ہے۔ مولانا نے بہت سی نعتیں اور نظمیں کہی ہیں ان کی سب سے مشہور نعت وہ ہے جس کا مطلع ہے۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
ایک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

۱۔ اردو کی نعتیہ شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص:۴۶

ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے کہ دلورام کوثری ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں حقیقی معنوں میں نعت گو کہہ سکتے ہیں۔صوفی شعراء میں شاہ نیاز بریلوی اور علمائے دین میں ممتاز ترین نام مولانا احمد رضا خاں رضا بریلوی کا ہے۔مولانا صاحب نعت وسلام اور منقبت کہتے تھے وہ سادہ اور برجستہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔عام طور سے ان کا یہ سلام بہت مشہور ومقبول ہوا۔دیکھئے۔

مصطفٰے جان رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

ان کا ایک نعت بھی بہت مشہور ہوا جس کا مطلع ہے۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

اس کے علاوہ حسن رضا خاں بریلوی، سید واجد علی، حمید صدیقی، بہزاد لکھنوی، عبدالعزیز خالد، حفیظ جالندھری، مولانا ضیاء القادری، محشر رسول نگری، اعظم چشتی، عبدالکریم ثمر اور اکبر وارثی میرٹھی جن کی کتاب ''میلاد اکبر'' ہے۔

جن میں حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' پر فرمان فتح پوری کا تبصرہ نہایت قابل قدر ہے جو اُن کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے جس کو دیکھنے سے مفید معلومات ہوتی ہے۔حفیظ جالندھری نے آنحضرتؐ کے دنیا میں تشریف لانے سے چند ساعت قبل کا منظر پیش کیا ہے جس کے چند اشعار دیکھئے۔

یہ کس کی جستجو میں مہر عالمتاب پھرتا تھا ازل کے روز سے بیتاب تھا بے خواب پھرتا تھا
یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں
یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی زمیں کو تکتے تکتے آ گئیں آنکھیں ستاروں کی
کروڑوں رنگتیں کس کے لئے ایام نے بدلیں پیاپے کروٹیں کس دُھن میں صبح وشام نے بدلیں
یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا گوارہ کرلیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا
یہ سب کچھ ہورہا تھا ایک ہی امید کی خاطر یہ ساری کوششیں تھی ایک صبح عید کی خاطر

اِن اشعار کے بعد ازاں حضورؐ کی ولادت کا بیان ہے اور اس کا آخری حصہ ''سلام'' کے عنوان سے ہے

جس کا پہلا شعر ہے۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی

سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی

ڈاکٹر صاحب نے عربی، فارسی شعراء کے نعتیہ کلام کو تبرکات کے طور پر پیش کیا ہے جن میں شیخ سعدی

کی یہ نعت پیش کی ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجےٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ و آلہ

اس کے بعد شاہ عبدالعزیز دہلوی، خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو دہلوی، عبدالرحمٰن جامی، حاجی محمد

جان قدسی، اسد اللہ خاں غالبؔ، شاہ نیاز احمد بریلوی اور علامہ اقبال کے کلام کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کتاب کے آخر میں ''اردو کی منتخب نعتیں میں'' امیر مینائی سے لے کر یوسف ظفر تک کی

نعتوں کا انتخاب کیا ہے جس میں خاص کر اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، اصغر گونڈوی اور اکبر الہ آبادی کی نعت

پیش کی ہے۔

اکبر الہ آبادی کے نعت کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

یہ جلوۂ حق سبحان اللہ، یہ نور ہدایت کیا کہنا

جبرئیل بھی ہیں شیداں ان کے، یہ شان نبوت کیا کہنا

اقبال سہیل اعظم گڑھی کی مشہور نعت جس کو شہرتِ دوام حاصل ہوا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

احمدِ مرسل فخرِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم

مظہرِ اول مرسلِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یہ پوری نعت نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ احسان دانش، افقر موہانی، احمد ندیم

قاسمی، محمد اعظم چشتی، اسیر بدایونی، ہری چند اختر، جگناتھ آزاد، اختر حسین اختر، ڈاکٹر ابراہیم خلیل شیخ، بیدم

وارثی، بیدل جبل پوری، بہزاد لکھنوی، بیاد یزدانی، حفیظ تائب، ثروت حسین، عبدالکریم ثمر، محمد علی جوہر، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، الطاف حسین حالی، حسرت موہانی، حسن بریلوی، حفیظ جالندھری، احمد رضا خاں بریلوی، روش صدیقی اور ساغر نظامی کی نعتیں شامل ہیں۔ ساغر نظامی کی نعت کے چند اشعار دیکھئے۔

حسن سراپا عشق مجسم صلی اللہ علیہ وسلم روئے منور گیسوئے پرخم صلی اللہ علیہ وسلم

سوزِ سراپا درد مجسم صلی اللہ علیہ وسلم آنسو تیرے شبنم شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اس کتاب میں ضیاء القادری بدایونی کی سلام، چودھری دلورام کوثری ماہر القادری، محشر رسول نگری، وحید ہسوی، یوسف ظفر وغیرہ اور خود فرمان فتح پوری کی نعت شامل ہے۔

اردو کی ظریفانہ شاعری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے'' کی اشاعت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۲۰۰۴ء میں بھی کی گئی ہے یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں پاکستان میں پہلے شائع ہو چکی تھی۔

فروری ۲۰۰۴ء میں ''کلام طنز و مزاح'' مرتبہ فاروق ارگلی کی اشاعت فرید بک ڈپو دہلی سے ہوئی ہے اس کا کتاب کا آغاز ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حسب ذیل اقتباس سے کیا گیا ہے۔

''ہنسنا ہنسانا، جس کا ادبی نام طنز و مزاح یا شوخی و ظرافت ہے، آدمی کا جبل عمل ہے۔ جس طرح آدمی خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر واہ سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہے اسی طرح وہ اپنے دوست کو دیکھ کر خوشی سے دانت نکالنے اور زندگی کے مضحک پہلوؤں پر ہنسنے پر مجبور ہے اس کی یہ مجبور کہیں بے ادبی و گستاخی گردانی جاتی ہے کہیں لطف انگیز و نشاط آور۔ باشعور و باذوق افراد کی یہ کوشش ہوتی ہے اور یہی ہونی بھی چاہئے کہ طنز و ظرافت کی دو دھاری تلوار سے کسی کی دل آزادی کا کام نہ لیا جائے بلکہ اسے ہلکے پھلکے نشتر کی چبھن تک محدود رکھا

جائے جو مریض کی صحت کا جامن ہو اور لطف اندوزی کا کامیاب وسیلہ بھی۔"(۱)

یہ اقتباس ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے" سے لیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر فرمان صاحب کی نگارشات کس شوق سے ہندوستان میں ارباب ذوق پڑھتے ہیں اور ان کے بلند پایہ مرتبہ کا کس قدر احترام ہمارے ملک میں کیا جاتا ہے۔

پروفیسر سید جاوید اقبال نے اپنے ایک مضمون میں اردو کی ظریفانہ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے" ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور اس میں پہلی بار اردو کی ظریفانہ شاعری کی نوعیت اور اس کے نمائندہ شعراء پر سیر حاصل بحث ملتی ہے، ورنہ اس سے پہلے طنز وظرافت کی ماہیت اور اس کے نظریاتی و تاریخی ارتقاء کا جائزہ لے کر حوالہ ذاتی معلومات ہی فراہم کی گئی ہیں اور اردو کی ظریفانہ شاعری اور شعراء کو بہت کم ہاتھ لگایا گیا ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب طنز و مزاح کے متعلق لکھتے ہیں:

"اکثر مزاح نگاروں نے مشاعروں کی داد ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور اس پر غور نہ کیا کہ سنی جانے والی شاعری کو پڑھے جانے کے لائق بھی ہونا چاہئے۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب اکبر الہ آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حیوان ظریف کا صحیح اطلاق اکبر الہ آبادی پر ہوتا ہے وہ اردو کے تنہا شاعر ہیں جن کی شاعری ظرافت کے جملہ اقسام پر محیط ہے۔ طنز و مزاح، ہجو ملیح، کنایہ، رمز، بذلہ سنجی، لطیفہ، چٹکلہ اور پیروڈی غرضیکہ ظرافت نگاری کی جتنی

۱۔ کلام طنز و مزاح۔ مرتبہ فاروق ارگلی مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۴ء ص: ۵

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص: ۳۸۲

۳۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۲

ممکن صورتیں ہوسکتی ہیں سب ان کے یہاں ملتی ہیں اور اس درجہ موثر اور دلچسپ پیرائے میں کہ اردو کی شاعری میں نہ ان سے پہلے ان کی نظیر ملتی ہے اور نہ ان کے بعد۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا کہ مواد کی کثرت اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے بھی اکبر کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ معاشرت، مذہب، سیاست، قیادت، تعلیم، حکومت، تہذیب اور اخلاق کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ شیخ، واعظ، مرزا جمن، کلو، بدھو، رمضان، مولوی مدن، ہر چرن داس، گاندھی جی، کرزن، مہاراج سبھی ان کے دائرۂ ظرافت میں شامل ہیں۔ سرسید پر تو ان کے بے شمار اشعار ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سرسید اور اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اکبر نے ان اشعار میں سرسید کی ذات یا ذاتی صفات کو نہیں بلکہ ان کی تحریک علی گڑھ کے بعض نتائج و اثرات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ علی گڑھ تحریک چونکہ ایک ہمہ گیر تہذیبی و تعلیمی تحریک تھی، اس لئے برصغیر کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اچھے یا برے اثرات سے محفوظ نہ تھا سائنس اور سائنسی آلات کے اثرات حکومت و قیادت کی روایت مجلسی آداب و اخلاق، مذہبی عقائد و خیالات وطریقہ تعلیم و تدریس اور علوم و فنون سبھی اس تحریک سے متاثر ہو رہے تھے اس لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اکبر سرسید کا ذکر کرتے اور ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مزید لکھتے ہیں:

''سعی و عمل کے بارے میں تو سرسید اور ان کے درمیان کوئی اختلاف رائے تھا ہی نہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے مسلمانوں کا اقتدار چھن جانے

۱۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۵

۲۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۷

کے بعد جس بے حسی و بے عملی کا شکار تھے اس کا اظہار، اکبر، سرسید، حالی نذیر احمد سبھی نے ایک جگہ نہیں جگہ جگہ کیا ہے۔" (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ سرسید مذہب اور سائنس کے درمیان جس طرح کا سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے، اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"سرسید کی کامیابی اور اکبر کی ناکامی کا تصور بھی تاریخی شعور کی کمی اور برصغیر کی زندگی پر سرسید اور اکبر کے اثرات سے بے خبری کا نتیجہ ہے سرسید ایک انقلاب لانا چاہتے تھے، لاکر رہے اکبر اس انقلاب کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے، کم کر کے رہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے اپنے مشن میں دونوں کامیاب رہے اور دونوں کے مشن سے ہماری تہذیبی وسیاسی زندگی متاثر ہوتی ہے۔" (۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب سید محمد جعفری کی بابت لکھتے ہیں:

"اکبر کی تقلید میں بھی بہتوں نے زور مارا لیکن کامیاب کوئی نہ ہوا بایں ہمہ اگر اکبر کے بعد اردو شاعری کی تاریخ میں کوئی قابل ذکر نام آتا ہے اور جسے بجا طور پر اکبر کے طرز کا بڑا شاعر کہہ سکتے ہیں تو وہ سید محمد جعفری ہیں۔ سید محمد جعفری کا دائرہ طنز وظرافت نہ صرف یہ کہ بہ اعتبار موضوع اکبر کی طرف رنگارنگ اور وسیع ہے بلکہ ان کا اسلوب اور فنکارانہ طرز عمل ہی اکبر سے بہت مماثل ہے۔" (۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ اساتذہ کے اشعار اکبر اور سید محمد جعفری دونوں کے یہاں نئی معنویت کو جنم دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی عموماً حافظ وسعدی کے اشعار کا سہارا لیتے ہیں اور سید محمد جعفری

۱۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۷

۲۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۳

۳۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۳۱

غالب اور اقبال سے اپنا کام نکالتے ہیں۔ سید محمد جعفری کی شہرت کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہوتا ہے اور ۱۹۵۰ء تا ۱۹۷۵ء کے درمیانی عرصے میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ ان کے شعری سرمایہ کا بہترین حصہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سید محمد جعفری کی کئی نظموں مثلاً کلرک، کھڑا، ڈنر، ابلیس کی فریاد، مرزا غالب فلم سازوں میں اور اقبال و نقاد کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شیخ نذیر، محمود سرحدی، ظریف جبل پوری، مجید لاہوری، ضمیر جعفری، انعام درانی، انعام احسن حریف اور دلاور فگار کی ظرافت نگاری کی تعریف کی ہے لیکن شیخ نذیر کو ''طنز و مزاح کا شاعر بے نظیر'' قرار دیا ہے۔ اقبال کی مشہور نظم ''حقیقت حسن'' ہے، جو شیخ نذیر کی نظم ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شہباز امروہوی کو طنز و مزاح کا معتبر شاعر قرار دیا ہے۔ ضمیر جعفری کی ظرافت نگاری کو اعلیٰ معیار ہونے کی گواہی دی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ظریف لکھنوی اور ان کے مجموعۂ کلام ''دیوان جی'' کے بارے میں لکھا ہے:

> ''وہ قادر الکلام ظرافت نگار تھے، جو لوگ اودھ کی مقامی بولی سے واقف نہیں ہیں یا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ناواقف ہوتے جارہے ہیں، ان کے لئے ظریف لکھنوی کی زبان اجنبی ہوگئی ہے۔ زبان کی اجنبیت کے سبب ان کی شاعری بھی عام قاری کے لئے اجنبی ہوتی جارہی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ صلاحیت اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت رکھنے کے باوصف انہیں آج وہ شہرت حاصل نہیں جس کے وہ مستحق تھے۔'' (۱)

اس کتاب کے شروع میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو کے ایک ظریفانہ شاعر کی بابت لکھا تھا:
''ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ کانگریس کے مشہور لیڈر سیتارمیہ (سیتارام) کسی مشاعرے کی صدارت کررہے تھے اس مشاعرے میں ظریف لکھنوی نے جب یہ شعر پڑھا۔

۱۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۹۲

نر ہے یا مادہ، عجب ترکیب ہے اس نام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

تو انہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی اس کتاب میں کچھ اور ظرافت نگار شعراء کے نام بھی شامل کئے ہیں، وہ ہیں: احمق پھپھوندوی، فرقت کاکوروی، واہی نقوی، ظریف جبل پوری، مسٹر دہلوی، آزاد عسکری اور عظیم عباسی، راجہ مہدی علی خاں۔

واہی نقوی ممتاز ترین ظرافت نگاروں میں تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"انہوں نے ایسا قدم جمایا کہ وہ آج بھی ہندوستان کے مقبول ترین مزاح نگار شاعر خیال کئے جاتے ہیں، ان کی شاعری محض لفظ و بیان کی شاعری نہیں بلکہ فکر و خیال کی شاعری ہے وہ ہنسنے ہنسانے کے ساتھ قاری کو غور و فکر پر بھی مجبور کرتے ہیں۔"(۲)

فاروق ارگلی نے "کلام طنز مزاح" میں جعفر زٹلی سے لے کر فاروق ارگلی تک ۶۸ ظرافت نگاروں کے کلام کے نمونے پیش کئے ہیں اور ان کے شعراء کے بارے میں لکھا ہے۔

فاروق ارگلی نے دلاور فگار کے بارے میں لکھا:

"وہ ہندو پاک کے عظیم ترین مزاح نگار مانے جاتے ہیں، فگار کی شاعری اس عہد کی مقبول ترین طنزیہ شاعری ہے۔"

دلاور فگار کی ظرافت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یوں رائے ظاہر کی ہے:

"دلاور فگار عہد حاضر کے ان ظرافت نگاروں میں تھے جنہیں باشعور و

۱۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۱ء ص:۱۱

۲۔ اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۱ء ص:۱۰۷

۳۔ کلام طنز و مزاح۔ مرتبہ فاروق ارگلی مطبوعہ دہلی ۲۰۰۱ء۔ ص:۲۲۴

باخبر شاعر کہنا چاہئے اس لئے کہ ظرافت نگاری یا نثر نگاری سنجیدہ شاعری سے مشکل تر شئے ہے۔ اعلیٰ درجے کی ظرافت اور درجہ اول کی طنزیہ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ شاعر اپنے گردوپیش کے ساری سماجی وسیاسی ہلچل کو محسوس کر سکتا ہو اور اجتماعی شعور کو اپنے ذاتی شعور کا جز بنا سکتا ہو۔ ایسا کرنے ہی سے وہ اپنی تخلیق کے ذریعے معاشرے کی ناہمواریوں کے برتنے والوں پر کچوکے لگاتا ہے۔ نشتر زنی کرتا ہے، لیکن ایسے حسن کارانہ انداز سے کہ اس کے طنز ومزاح کے چبھن سے دوسروں کے علاوہ وہ شخص بھی ایک طرح کا لطف محسوس کرتا ہے جس پر نشتر زنی کی جاتی ہے۔ دلاور فگار کی طنزیہ شاعری کا یہی خاص وصف ہے کہ کسی فرد کی ذاتی ناہمواری کو نہیں بلکہ سماج کی ناہمواری کو ضرب لگاتا ہے اور معاشرے کی خوش اسلوبی کو اپنی اصلاح کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔‘‘(۱)

دلاور فگار نے اپنی طنز ومزاح کی شاعری کے ذریعے جو کچھ کہا، زیادہ تر کسی فرد یا کامرشیل ادارے کی فرمائش پر کہا اور اس کی وجہ سے باوصف طنز وظرافت کی وہ کاٹ چھانٹ اور چابک دستی پیدا نہ ہوسکی جو اکبر کی طرح دیرپا اور کارگر ثابت ہوئی۔

نامور نقاد اور ادیب پروفیسر مظفر حنفی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

’’بیسویں صدی کے نصف اول کو ہم اردو کی ظریفانہ شاعری کا عہد زریں کہہ سکتے ہیں۔ اس دور تک پہونچتے پہونچتے اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کے وسیلے سے سیاسی شعور کو عام کر دیا تھا اور ملک میں حصول آزادی کے لئے عوامی جدوجہد میں تیزی آچکی تھی۔ چنانچہ اعلیٰ اور بامقصد ظریفانہ شاعری کے لئے فضا بیحد سازگار تھی۔ اخباروں اور رسالوں میں ’’اودھ پنچ‘‘ کی روش پر

۱۔ کلیات دلاور فگار۔ از دلاور فگار طبع اول مطبوعہ دہلی ۲۰۰۳ء ص:۶۸۶

طنزیہ اور مزاحیہ مکالموں کے توسط سے ظریفانہ شاعری کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اکبر الہ آبادی کے مختصر مجموعے "گاندھی نامہ" پر توجہ نہیں کیا اس میں اکبر الہ آبادی نے مہاتما گاندھی، علی برادران، خلافت تحریک پر خوب خوب گل افشانی کی ہے۔

اکبر نے کہا تھا:۔

شاہنامہ ہو چکا اب عہد گاندھی نامہ ہے

گاندھی نامہ کو اکبر الہ آبادی نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیا تھا لیکن وہ ان کی زندگی کے اندر شائع نہیں ہو سکی۔ اس شعری مجموعے کے اشعار طنز نگاری کے بہترین نمونہ ہیں اور ظریفانہ شاعری میں ان کو بلند مقام حاصل ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بحث بھی دلچسپ ہے کہ اکبر الہ آبادی کے اشعار میں "بدھو" سے کیا مراد ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے:۔

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

مولانا عبد الماجد دریابادی بدھو میاں کے متعلق لکھتے ہیں:

"بدھو میاں" سے اشارہ مولانا محمد علی اپنی شخصیت و ذات سے متعلق سمجھے۔ اس خاکسار سے بڑھ کر مولانا محمد علی اور حضرت اکبر کا نیاز مند اور عقیدت پسند اور کون رہا ہوگا۔ میرے علم میں یہ بات پہلی بار آ رہی ہے ورنہ اس سے قبل جب جب سنا تھا یہی سنا کہ یہ اشارہ مولانا عبد الباری فرنگی محلی ہی کی جانب ہے اور اسی شہرت عام کے بعد بطور تلافی حضرت اکبر نے یہ شعر بھی ارشاد کیا تھا:۔

اے چرخ ہوائیں شوق چلے، اے شاخ عمل گلباری کر
کچھ کام کریں، کچھ سعی کریں، ہر شیخ کو عبد الباری کر (۲)

۱۔ تنقید العباد۔ از پروفیسر مظفر حنفی۔ ص:۱۷۷

۲۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ از مولانا عبد الماجد دریابادی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۴۸ء ص:۱۹۱

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب اردو کی ظریفانہ شاعری پہلی بار پاکستان سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے۔ دوبارہ ہندوستان میں دہلی سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پہلے کی لکھی ہوئی اپنی تصنیف کو ۲۰۰۴ء میں دوبارہ شائع کر دیا اور یہ بھی نہ لکھا کہ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس لئے قاری کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ جدید تنقیدی کارنامہ ہے اور اس میں جدید تر ظریفانہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو میں ہائیکو

اردو میں ہائیکو جیسا کہ کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ہائیکو'' صنف شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ ہائیکو کے متعلق بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے ہیں، جن کو پڑھ کر عام قاری کی تشنگی باقی ہی رہتی ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ہائیکو کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے، وہ ہائیکو کے تمام ضروری گوشوں کو سموئے ہوئے ہے۔ تنہا اس ایک مضمون کو پڑھ کر ہائیکو کے بارے میں بنیادی اور ضروری باتیں قاری کو معلوم ہو جاتی ہے۔

فرمان صاحب کے لکھنے کا انداز اتنا سلیس ہے کہ عام طور پر ان کی تحریروں سے مستفیض ہوا جاسکتا ہے۔ بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے ایسے کارنامے انجام دینے والوں میں فرمان صاحب کا نام بہت نمایاں ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان سے پہلے یا ان کے ہم عصروں میں کن لوگوں نے مطلقہ موضوع پر کتابیں لکھی ہیں مزید معلومات کے لئے ہم ڈاکٹر صاحب ہی کی رہنمائی میں آگے بڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے ہائیکو کے بارے میں لکھا ہے کہ ہائیکو جاپان کا تحفہ ہے۔ جاپان کی مقبول ترین اصناف سخن میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا سبب غالباً اس کی ہیئت کا اختصار ہے اور کچھ موضوعاتی اختصار لکھتے ہیں:

''اختصار، جاپانیوں کا فنادِ مزاج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ عملی زندگی سے

وہ کچھ اس طرح منسلک ہیں کہ محض لطف اندوزی کے لئے وقت نکالنا ان کے لئے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ وہ جزیروں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے باسی ہیں۔ چھوٹے قد اور چھوٹی آنکھیں، کم گو اور کم سخن بقامت کہتر، بقیمت بہتر کے قائل ہر بڑی چیز کو خوبصورتی کے ساتھ چھوٹی کردینے پر مائل، چنانچہ موٹر کاریں ہوں یا بسیں، ریفریجریٹر ہوں یا ٹی وی سیٹ، ریڈیو ہوں یا ٹرانزسٹر، کمپیوٹر ہوں یا گھڑیاں طباعی مشینیں ہوں یا زراعتی ٹریکٹر، بڑوں کے کام کی چیزیں ہوں یا بچوں کے کھلونے سب کو انہوں نے مختصر سے مختصر اور خوبصورت سے خوبصورت تر کر کے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ تیزی کے ساتھ اردو میں ہائیکو کی مقبولیت بڑھتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے عبدالعزیز خالد، شان الحق حقی، ڈاکٹر پرویز پرواز، ادا جعفری، قاسم پیرزادہ، تابش دہلوی، محمد امین، سرشار صدیقی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، سحر انصاری، بشیر صیفی، حسن اکبر کمال، اقبال حیدر، شاہدہ حسن، سید حیدر گردیزی اور اختر شمار کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کراچی میں ہائیکو مشاعروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ محمد امین، سید حیدر گردیزی، اختر شمار کے طبع زاد ہائیکو کے مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور عبدالعزیز خالد نے کم و بیش دو سو جاپانی شعراء و شاعرات کی ہائیکو کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے امید ظاہر کی ہے کہ اردو میں ہائیکو نگار مزاج اور انتشار کا شکار نہ ہوں گے اور اس کی صورت و معنے دونوں لحاظ سے قابل شناخت بنائیں گے۔

قطعہ اور اس کے مماثل اصناف

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون قطعہ اور اس کے مماثل اصناف، قطعہ اور اس کے اوزان شرائط قطعہ دو بیتی رباعی کے سلسلے میں بحث کی ہے جس میں غالبؔ، ذوقؔ، آزادؔ کے قطعہ و رباعی مثال کے طور پر پیش کئے

۱۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۵۳۸

گئے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر کے شعراء اور بیسویں صدی کے شعراء میں اکبر و اقبال اور بعد کے قطعہ نگار شعراء کا ذکر کیا ہے جو بہت معلوماتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنے مضمون میں قطعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''قطعہ کو ہیئت اور معنی کے اعتبار سے قصیدہ یا غزل مسلسل خیال کرنا چاہئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قصیدہ اور غزل میں مطلع کا ہونا ضروری ہے اور قطعہ میں عموماً مطلع نہیں آتا۔ گویا کسی نظم کے پہلے شعر کے پہلے مصرعے سے قافیہ نہ لانے کے سبب اسے قطعہ کہا جاتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب قطعہ اور رباعی کے امتیاز کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رباعی کے اوزان مخصوص ہیں ان مخصوص اوزان کے سوا کسی دوسرے بحر و وزن کے دو شعروں کو قطعی سمجھنا چاہئے۔ اگر چہ قطعہ کے باب میں اہل عروض و قواعد نے یہ حکم لگایا کہ اس کے پہلے مصرعے میں قافیہ نہیں آتا لیکن عملاً یہ پابندی ضروری نہیں خیال کی گئی اس لئے کہ بعض علماء و شعراء نے دو مقفیٰ شعروں کو بھی قطعہ کا نام دیا ہے۔ اردو فارسی کے دواوین میں سیکڑوں اس کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ بعض جگہ ان کی صراحت بھی کر دی گئی ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے مضمون قطعہ اور اس کے مماثل اصناف میں ان قطعہ نگار شعراء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس طرف خصوصیت سے توجہ دی ہے فرمان صاحب ان شعراء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالی، شبلی، اکبر، اسماعیل میرٹھی اور آزاد کی نظم نگاری کے تحت حاصل ہوئی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے خصوصاً اس کی طرف توجہ کی ہے اور ان کی ظریفانہ شاعری عموماً قطعہ ہی کی صورت میں ہے۔ اقبال نے بھی کثرت سے قطعات کہے ہیں اور اسے ہر قسم کے سنجیدہ اور فلسفیانہ مضامین کا متحمل بنا دیا ہے۔ اکبر اور اقبال کے زیر اثر بیسویں صدی کے شعراء نے قطعہ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ دو چار قطعے تو خیر آج کے ہر

۱۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۴۱۱

۲۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء ص: ۲۵

شاعر نے کہے ہیں۔'' (۱)

ڈاکٹر صاحب نے ان شعراء کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے قطعہ نگاری میں ممتاز مقام بنایا ہے ان شعراء میں ''احسان دانش، سیماب اکبر آبادی، اختر انصاری دہلوی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام آتے ہیں، ان کے قطعات محض تاریخی اہمیت کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان میں ساری فنی خصوصیات اور شاعرانہ لوازم موجود ہیں جو اردو شاعری میں ان کے رتبے کا بلند کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''تحقیق و تنقید'' پہلی بار ۱۹۶۲ء میں کراچی پاکستان سے اس کے بعد اکتوبر ۱۹۶۹ء میں خواجہ پریس دہلی سے شائع ہوا۔ جس کا انتساب عم محترم صدیق حسن مرحوم کے نام کیا ہے۔ اس میں مضمون زبان اور رسم الخط، غالب کے کلام میں استفہام، دردؔ کی شخصیت تصوف اور شاعری، جگر لخت لخت، فراقؔ ایک رجائی غزل گو، انشاء اور رانی کیتکی کی کہانی، فارسی کی پہلی شاعرہ ''رابعہ''، خطبات عبدالحق، قدیم اردو ڈرامے کے ایک اہم فنکار، آزادؔ کی تمثیل نگاری پر ایک نظر، کچھ تحقیقات شادانی کے بارے میں، علاقائی زبانیں اور اردو ادب، کیا کیا خضر نے سکندر سے مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب پھر اگست ۱۹۷۲ء میں خواجہ پریس دہلی سے ''شخصیت و تنقید و تمثیل نگاری'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں لکھا ہے کہ یہ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ جو صرف ایک مضمون کے اضافہ کے ساتھ ''خواجہ الطاف حسین حالی اور شعراء کے حالات'' کو شامل کیا ہے۔ باقی سارے مضامین وہی ہیں جو ''تحقیق و تنقید'' میں شامل ہیں۔

یہ تحقیقی و تنقیدی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی ملتی ہے فرمان صاحب تحقیق و تنقید کے فرق کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یوں تو تحقیق و تنقید میں بہ اعتبار کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ تحقیق کے معنی حق کی تلاش و تصدیق کے ہیں۔ تنقید کا لفظ بھی کم و بیش یہی معنی دیتا ہے۔ پھر بھی علمی و ادبی مباحث میں یہ الفاظ نمایاں معنوی فرق کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ تحقیق عموماً خارجی و تاریخی واقعات اور الفاظ و محاورات کی چھان بین پر نظر رکھتی ہے اس کے برعکس تنقید کسی ادبی تخلیق کے حسن اندوہ کو نگاہ میں رکھ کر

۱۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰ء ص: ۴۱۵

اسے معیار و حلقہ اثر کا تعین کرتی ہے لیکن دوسرے طور پر قیاس کر کے ادب کو
تحقیق وتنقید کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا۔"(۱)

تحقیق کے بارے میں فرمان صاحب نے لکھا تھا:

"تحقیق کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ فلاں چیز کب لکھی گئی، کس کی
ہے۔ ہم عصر کون کون تھے وغیرہ۔ صرف اہم اور افادی امور کو ادبی تحقیق کا
موضوع بنایا جائے جو ایسے اہم اور افادی امور جن سے تنقید کی نئی راہیں کھلتی
ہیں اور جن کے وقوف سے ادب کے عام قارئین ایک قسم کی طمانیت محسوس
کرتے ہیں۔"(۲)

عبدالرحمٰن ناصر نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے:

"تحقیق میں ڈاکٹر صاحب بغیر کسی مستند اور معتبر حوالے کے نہ تو کسی
روایت کو صحیح مانتے ہیں اور نہ ہی خود کوئی بات بغیر حوالے کے کرتے ہیں۔ تحقیق
کے لئے موضوع کا انتخاب کرتے وقت وہ اس کے افادی پہلو کو افادیت دیتے
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی سرمائے میں ادبی افادیت کے حامل مضامین
وموضوعات کی کثرت ہے۔"(۳)

نورین فردوس کے مطابق:

"ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمارے ملک کے ایسے محقق ہیں جو اس صبر آزما
محنت کے عادی ہیں ادبی تحقیق کے میدان میں ان کے شوق اور دلچسپی کی وجہ
سے ان کا شمار آج اردو ادب کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔"(۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب تحقیق وتنقید جس میں فرمان صاحب نے مختلف النوع موضوع پر

۱۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۹ء ص: ۷

۲۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۹ء ص: ۸

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۲۱

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۸۶

مضامین لکھے ہیں۔ فرمان فتح پوری کی نظر تحقیق میں بہت ہی عمیق اور وسیع المطالعہ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مختلف موضوعات کو منتخب کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

فراق صاحب کے بعض مضامین میں فراق ایک رجائی غزل گو اور جگر لخت لخت محض روایتی ڈھنگ کے ہیں اور اسی لئے یہ مضامین یک رُخ اور ہلکے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی فرمان صاحب کے مضامین کا مجموعہ اردو تنقید میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی کتاب ''تحقیق وتنقید'' کے ایک مضمون میں فارسی کی پہلی شاعرہ ''رابعہ'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''رابعہ فارسی کے قدیم ترین شعراء رودکی، شہید بلخی، دقیقی اور ابوشکور وغیرہ کی ہم عصر ہے۔ اور اس کا تعلق خاندان سامانیہ کے اس ممتاز دور سے ہے جو فارسی شعر وادب کا اولین دور کہا جاتا ہے۔ سامانیہ دور طاہریہ اور صفاریہ کے خاتمہ پر ۳۹۵ھ سے شروع ہوتا ہے اس میں نہ صرف یہ ہے بڑے بڑے علماء و فضلاء وشعراء پیدا ہوئے بلکہ یہ بھی ہوا کہ ایرانی ادب اپنے قومی وملکی مزاج سے پہلی بار ہم آہنگ ہوا۔ رابعہ اسی عہد سے متعلق ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مولانا شبلی کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نے بھی شعر العجم میں رابعہ کے ذکر میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ انہوں نے دور سامانیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رابعہ کے متعلق صرف اس قدر وضاحت فرمائی ہے:

> ''اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعر وشاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ رابعہ قرداری بلخی جو رودکی کی ہم عصر تھی اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی، اس کا باپ کعب الاعراب میں سے تھا۔ لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی، فارسی دونوں میں شعر کہتی تھی۔ نہایت حسین اور صاحب فضل وکمال تھی، یکتاش نام ایک غلام سے اس کو عشق تھا، لیکن پھر عشق مجازی سے گذر کر

۱۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۳۴

عشق حقیقی تک نوبت پہونچی، چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے، تاہم چونکہ عورت کا اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا۔اس لئے لوگوں نے اسے قتل کر ڈالا۔"(۱)

(شعرالعجم از شبلی صفحہ ۲۶ مطبع معارف اعظم گڑھ)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"صاحب مجمع الفصحا نے رابعہ کے اشعار بھی نقل کیے ہیں اور اپنی مثنوی گلزار ارم کا بھی ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے رابعہ اور یکتاش کی داستان غم نظم کی ہے۔فارسی کے مشہور شاعر شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی الٰہی نامہ کا موضوع بھی رابعہ اور یکتاش کا عشقیہ قصہ ہے۔عطار نے پانچ سو اشعار کی طویل مثنوی میں رابعہ کی دردناک داستان محبت از آغاز تا انجام بڑے فنکارانہ انداز سے نظم کی ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

"تمام علمائے ادب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رابعہ فارسی ادب کی پہلی قابل ذکر شاعرہ تھی۔" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک دوسرا مضمون خطبات عبدالحق پر بہت ہی جامع اور تاریخی مضمون ہے جو مولوی عبدالحق کے خطبات کا یوں ذکر کیا ہے۔"خطبات عبدالحق ادبی نقطہ نظر سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں اور ان کا خطباتی ادب میں وہی مقام ہے جو فن خطوط نگاری کی تاریخ میں غالب کے خطوط کا۔خطوط نگاری کا تعلق انسان کی نجی اور خانگی ضرورتوں سے ہے اور اس لئے ان کا ادب سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔"(۳)

۱۔تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۳۵، ۱۳۶

۲۔تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۳۷

۳۔تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۴۵

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مولوی عبدالحق کے خطبے کے متعلق لکھتے ہیں:

''خطبے میں مولوی صاحب نے سادہ اسلوب کی مشکلات اور اسکے فوائد پر مدلل بحث کی ہے۔ بعض خطبات میں ادب و انسانیت سوسائٹی اور ادب، زبان اور عورت سیاست و زبان، اصطلاحات و محاورات، زبان کے اشتقاق ماخذ کے اصول وغیرہ کے موضوعات پر بڑی عالمانہ بحث ملتی ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک دوسری جگہ ''انشاء اور رانی کیتکی کی کہانی'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''انشاء اللہ خاں کبھی اپنے علمی رعب و دبدبہ اور درباری اعزاز و رسوخ کی وجہ سے بڑی اعلیٰ پائے کی شخصیت معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی مزاح و ہجو میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ اعلیٰ پائے کے شخصیت ہیں اور نہ بہت نمایاں۔ بات یہ ہے کہ وہ زہر خندا کے سم قاتل کے اثر سے ناواقف ہیں۔ صرف قہقہہ لگانا جانتے ہیں۔ قہقہہ ان کی سنجیدگی کو دبا سکتا ہے۔ لیکن ان کے قہقہے پر سنجیدگی کا زور نہیں چلتا۔ مزاح نگاری میں ان کی مثال ایک ایسی پھوہڑ حسینہ کی ہے جو ظاہری حسن و جمال سے آراستہ ہو۔ لیکن باطنی شائستگی سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ طبیعت کی اس بے اعتدالی نے انہیں غیر معمولی فنکار بننے سے باز رکھا۔'' (۲)

اسی مضمون میں آگے چل کر انشاء خوش طبعی کے متعلق لکھتے ہیں:

''انشاء کے پیش نظر خوش طبعی کے علاوہ کوئی مقصد نہ تھا۔ چنانچہ اس بے مقصد خوش طبعی کے آثار اکثر جگہ نمایاں ہیں۔ دیکھئے کنور اودے بھان کے جشن شادی کے بیان میں انشاء کیسی جولانی طبع دکھاتے ہیں۔ ڈومنیوں کے روپ میں سارنگیاں چھیڑ چھاڑ سو ملے گا۔ دونوں ہاتھ ہلاؤ۔ انگلیاں نچاؤ۔'' جو کسی

۱۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۶۰

۲۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۳۰، ۱۳۱

نے نہ سنی ہوں وہ تاؤ بھاؤ، آؤ، جاؤ، راؤ، چاؤ، دکھاؤ، ٹھنڈیاں کپکپاؤ، ناک بھویں، تان تان بھاؤ بتاؤ ایسا جماؤ لاکھوں برس میں ہوتا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے محمد حسین آزاد کی تمثیل نگاری پر ایک نظر، ڈالتے ہیں، محمد حسین آزاد اردو ادب کے تمثیل نگاری میں اپنا ایک الگ مقام بنا رکھا ہے۔ آزاد نے بہت سی انگریزی مضمون سے اخذ ترجمہ کئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری تمثیلوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"تمثیلوں کے اولین نمونے ہمیں قدیم طرز کی منظوم اور نثری داستانوں میں ملتے ہیں ان داستانوں میں کبھی پرندوں، کبھی حیوانوں، کبھی دیوی دیوتاؤں، کبھی جن و پری اور کبھی کبھی روحوں کو انسانی کردار کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور ان کے واقعات و کمالات کی مدد سے مصلحانہ باتیں ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی اور اردو سب میں اسی قسم کی تمثیلیں ملتی ہیں۔"(۲)

آزاد نے اردو میں تمثیلی مضامین اس وقت لکھنا شروع کئے جب سادگی و پرکاری اور حقیقت نگاری نے جگہ لے لی تھی جس کے سبب آزاد کے مضامین کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"آزاد نے اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کر ایسے انگریزی مضامین اور ایسے انداز بیان کو اپنایا جو بڑی حد تک ماضی کی داستان بن چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نیرنگ خیال کے مضامین میں اسلوب کی ندرت و دلکشی کے سوا دور حاضر کے انسان کی دلچسپی کا سامان بہت کم موجود ہے۔ آزاد نے مغرب سے متاثر ہو کر اپنے بعض معاصرین کی طرح اردو کو بہت کچھ دینا چاہے لیکن وہ ایک طرز خاص کے سوا کچھ اور نہ دے سکے۔ یہ طرز خاص بھی نہ تو سنجیدہ علوم و فنون کے

۱۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۳۲، ۱۳۳

۲۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۸۴، ۱۸۵

مباحث میں کام آسکتا ہے اور نہ کوئی شخص اسکی تقلید کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیرنگ خیال کا اسلوب دلکش ہونے کے باوجود صرف تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔"(۱)

فرمان صاحب کی تحقیق کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

"فرمان صاحب بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں اس دعوے کی صداقت کے اثرات میں صاف سیدھے اور واضح صغریٰ و کبریٰ قائم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریحی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقصد بنتا ہے اور صغریٰ و کبریٰ کی ایک نئی ترتیب کسی اور نتیجے کے انتباط کا ذریعہ بنتی ہے، مقدمات، مفرد اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس انتزاج، استقراء استنباط اور استناج کے کئی مرحلوں سے گذرتی ہوئی یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔"(۲)

ڈاکٹر عقیلہ شاہین فرمان صاحب کی تنقید کے متعلق لکھتی ہیں:

"ڈاکٹر فرمان فتح پوری دور حاضر کے ان معتبر ناقدوں میں سے ہیں جن کی تنقیدی رائیں ہمارے ادب میں سند اور حوالہ کی چیز بن گئی ہیں۔"(۳)

فرمان صاحب سادہ زبان اور سیدھے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ فرمان صاحب لفظوں کی آرائش و زیبائش سے دور نظر آتے ہیں وہ سیدھے بات کہنا پسند کرتے ہیں جو اُن کے تحقیق و تنقید کے قد کو اور بھی بڑھا دیتا ہے، جس کی وجہ سے جلد ہی ان کا شمار صف اول کے محققین میں شمار ہونے لگا۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں ڈاکٹر فرمان صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۸۹،۱۸۸

۲۔ فورٹ ولیم کالج مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مطبوعہ کراچی ۱۹۹۲ء ص: ۱۲

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۱۰

''جن اصحاب نے تحقیق میں خصوصی نام پیدا کیا اور اپنی محنت اور کاوش سے اردو تحقیق کے دائرہ کو وسیع کیا، ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر غلام حسن ذوالفقار، مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی ایسے قابل ذکر اسماء نظر آتے ہیں، ان حضرات کی گراں قدر تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے اصناف ادب اور اہل قلم کے بارے میں کارآمد معلومات جمع کر کے تاریخ ادب کو کئی لحاظ سے وسعت دی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ ایسے ایسے گمشدہ موضوع کو اپنی تحقیق کے ذریعے حقائق سے روشناس کراتے ہیں جہاں عام قاری کی پہونچ مشکل ہوتی ہے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں جا بجا یہ موتیاں ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

منظر امکانی نے ایک انٹرویو میں جب ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے پوچھا کہ آپ شاعری سے تنقید اور تحقیق کی طرف کیسے آئے، تو فرمان صاحب نے جواب دیا:

''بات یہ ہوئی کہ ''نگار'' میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے اردو کو ہندی رسم الخط میں تبدیل کرنے کی زوردار وکالت کی میں نے اس وقت زبان کے حوالے سے کوئی خاص مطالعہ وغیرہ بھی نہیں کیا تھا۔ بس اپنے خیالات کو تحریر میں اس صورت میں لایا کہ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے ایک بھرپور تعریفی مضمون لکھا۔ میں پاکستان آچکا تھا اور مجنوں صاحب سے میری ملاقات بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس مضمون نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ادھر علامہ نیاز نے بھی مجھے مشورہ دیا کہ میں شاعری ترک کر کے مضامین لکھوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خود علامہ نیاز بھی شاعری ترک کر چکے تھے۔''(۲)

۱۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء ص: ۲۸۳

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۷۰۵

یہی وہ باتیں تھیں جو ڈاکٹر صاحب کے حوصلے کو بلند کیا اوران کے قلم ہمیشہ کسی نہ کسی تحقیق وتنقید میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بیسویں صدی کے ممتاز غالبؔ شناسوں میں ہیں مرزا غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان صاحب کے لکھے ہوئے پندرہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں جس کا نام ''غالب، شاعر امروز فردا'' ہے اس مجموعہ کی اشاعت ستمبر ۱۹۷۰ء میں اظہار سنز لاہور سے ہوئی تھی۔

ڈاکٹر سلیم اختر اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''غالب شاعر امروز فردا'' میں ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنی محققانہ کاوشوں سے کلام غالب اوراس سے وابستہ بعض اہم جزئیات کے بارے میں گراں قدر معلومات بہم پہونچائی ہیں۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے غالب کی شاعری اوراس کی فکر کے بعض اہم پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔''(۱)

پروفیسر سید معین الرحمٰن نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''غالبؔ شاعر امروز فردا'' کے بارے میں لکھا تھا:

> ''غالبؔ سے فرمان صاحب کا ایک گونہ شغف ہے۔غالبؔ پر ان کی یہ کتاب ان کے اسی مدۃ العمر کے عشق کا مظہر ہے۔پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کے بعض خالصاً تحقیقی مضامین، غالبؔ کی زندگی کے بارے میں نئی معلومات کے حامل ہیں۔بعض ایک نئے تنقیدی زاویے سے غالبؔ کے فکرو فن کے مخفی گوشوں کو سامنے لاتے ہیں اور بعض مضامین میں تحقیق وتنقید دونوں کے خوشگوار امتزاج سے قابل قدر نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔''(۲)

۱۔ ماہنامہ محفل لاہور، ۱۹۷۰ء ص:۴۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۲ء جلد اول ص:۲۶۵

ان ادیب و ناقد کی آراء سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرمان صاحب کی غالبؔ شناسی کتنی مقبول و عام ہے اپنے قلم کے زورِ طبع سے سبھی کو اپنا گرویدہ و پسندیدہ منوالیا ہے۔ یہی ان کے تحریروں کی خوبی ہے۔

پروفیسر وقار عظیم نے ''غالبؔ، شاعر امروز فردا'' کی تقریبی تعارف میں ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:

''فرمان صاحب کی تحقیقی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی جنہیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔''(۱)

پروفیسر وقار عظیم نے آخر میں لکھا ہے:

''فرمان صاحب نے غالبؔ کو ایک محبِ وطن عظیم کے پیکر میں بھی دیکھا ہے اور اس کی ذات میں انہیں محبوبی کے جلوے بھی نظر آئے ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کی انہوں نے پوری فراخدلی سے داد دی ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحقیق اور تنقید دونوں کا دامن افراط و تفریط کی دست برد سے محفوظ رہا ہے۔''(۲)

اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر فرمان نے لکھا ہے:

''اردو میں غالبؔ کا نام بالعموم میر، نظیرؔ اور اقبالؔ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ تینوں اردو کے منفرد اور ممتاز شاعر ہیں لیکن غالبؔ کی حیثیت ان سے بہت مختلف ہے۔ غالب صرف عظیم شاعر ہی نہیں، عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری اور نثر دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے دونوں کو ایک نہایت دلکش، فکر انگیز، اچھوتا تہہ دار اور پرو کار و باوقار لب ولہجہ دیا ہے۔ ایسا لب ولہجہ جس کی کوئی دوسری مثال اردو میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے ان کا نام دنیا کے صرف ان گنے چنے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ لینا مناسب ہوگا جو

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم طبع اول مطبوعہ دہلی ۱۹۹۱ء ص: ۳۳

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم طبع اول مطبوعہ دہلی ۱۹۹۱ء ص: ۳۴

بہ یک وقت، نثر و نظم دونوں میں منفرد خلاقی حیثیتوں کے مالک ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب غالبؔ کی غزل کی اہمیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"شاعر کی حیثیت ان کی دین شاید اس سے بھی زیادہ ہے۔ اردو غزل کو انہوں نے ایک نئی جہان معنی سے آشنا کیا ہے۔ اس میں عظمت رفعت کے تازہ آثار پیدا کئے ہیں۔ تقلید و روایت سے بغاوت کر کے زندگی کے جدید تر میلانات ور جحانات میں تغزل کا رنگ بھرا ہے اردو شاعری کو فکر انگیز حکیمانہ اسلوب دے کر اس کی سطح کو بلندی بخشی ہے۔ الفاظ کی شعبدہ گری پر افکار کو ترجیح دی ہے۔ شاعری کو لفظی صناعی اور قافیہ پیائی کے طلسم سے نکال کر فکر و شعور کی حیات افروز فضا میں داخل کیا ہے۔ زمین اور زمین پر بسنے والوں کے مسائل، نفسیات کو شعر کا موضوع بنا کر زندگی اور ادب کا رشتہ استوار کیا ہے۔ بادہ و شاعر کا ذکر اور آرائش خم کاکل کے شغل کو مشاہدہ حق کی گفتگو اور اندیشہ ہائے دور دراز کا حاصل قرار دیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی کو اعلیٰ انسانی مقاصد سے ہم آہنگ کر کے اسے بنی نوع انسان کے زخم دل کا مرہم بنایا ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان نے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مہیش پرشاد، مولانا غلام رسول مہر، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر شوکت سبزوری، پروفیسر حمید احمد خاں ڈاکٹر آفتاب احمد، پروفیسر سید معین الرحمن نے غالب کے بارے میں جو تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔ اس کو فراخدلی سے سراہا ہے۔

اس کے باوجود ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

"غالبؔ کا کلام جسے ان کے "دل حسرت زدہ کی تفسیر کہنا چاہئے۔ ایک "مادۂ لذت درد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے بعض لوگ بقدر لب دنداں اپنا

ا۔ غالبؔ، شاعر امروز فردا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء پیش لفظ ص:۳

۲۔ غالبؔ شاعر امروز فردا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء کتاب سے پہلے ص:۲

اپنا کام تو نکال سکتے ہیں، لیکن اپنی کسی ایک تحریر یا کتاب سے غالبؔ کے سخن فہموں کو سیراب نہیں کر سکتے۔ کم از کم میں اپنے تئیں یہی محسوس کرتا ہوں اور اسی لئے میں اپنی اس کتاب کو غالبؔ کے سلسلے میں ادنیٰ سپاس نامے کی حیثیت دیتا ہوں۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب غالبؔ پر ان کے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے:

اس مجموعہ میں پندرہ مضامین ہیں بعض کی نوعیت تحقیقی ہے اور بعض کی تنقیدی بعض تحقیق اور تنقید دونوں سے تعلق رکھتے ہیں یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں اور مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں "غالبؔ کے کلام میں استفہام" غالبؔ کے مقطع "مکمل شرح دیوان غالبؔ پر ایک نظر، غالبؔ و اقبال" اور "غالبؔ کے اسلوب سخن کا ایک اہم پہلو" یہ تو پندرہ بیس سال پرانے مضامین ہیں اور فرمان صاحب کی تنقیدی تحریروں کے اولین نقوش ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ چونکہ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اس لئے ایک معنوی ربط و آہنگ کے باوجود موضوع کا تسلسل کہیں کہیں ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے اور ان مضامین میں کہیں کہیں انتخاب اشعار انداز بیان اور خیال کی تکرار بھی نظر آتی ہے:

"پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین کا مجموعہ "غالبؔ شاعر امروز فردا" کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں"

"کسی شاعر کو بیک وقت شاعر امروز اور شاعر فردا کہلائے جانے کے حق صرف اس وقت پہونچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیان فصل و بعد سے گذر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانون فطرت نے ہر عہد کے انسان منسلک کیا ہے۔ فرمان صاحب نے غالبؔ کو اسی مفہوم میں "شاعر امروز فردا" کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی

(غالبؔ شاعر امروز فردا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء ص: ۴)

صورت دے دی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالبؔ شناسی کو ہر ادیب و ناقد نے سراہا ہے اور ان کو صف اول کے غالبؔ شناسوں میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔

دور جدید کے صف اول کے غالبؔ شناس ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہیں ان کے پندرہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ "غالبؔ شاعر امروز فردا" کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "غالبؔ صدی پر بلا مبالغہ کئی سو کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ خود میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں صرف غالبؔ صدی کے موقع پر شائع ہونے والی دوسو سے زیادہ کتابیں (یا کتابی اہمیت کی چیزیں) موجود ہیں، لیکن بقاء، صرف ان چیزوں کے لئے ہے جو عالم انسانیت کے لئے نفع بخش ہوں۔ غالبؔ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب ان چیزوں کے لئے ہے جو عالم انسانیت کے لئے نفع بخش ہوں۔ غالبؔ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب ان کے کم وبیش ایک چوتھائی صدی کے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ فرمان صاحب کے نقطہ نظر میں تازگی اور اسلوب میں توانائی ہے۔ اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اہم کتاب غالبؔ صدی پر شائع ہونے والی ان سیکڑوں کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔"(۲)

"غالبؔ شاعر امروز فردا" میں فرمان صاحب کا مضمون "غالبؔ کے کلام میں استفہام" شامل ہے جس کو نامور نقاد اوریجنل مضمون مانتے چلے آئے ہیں یہ مضمون سب سے پہلے نگار لکھنؤ (مئی ۱۹۵۲ء میں) شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس وقت شائع ہوا تھا جب فرمان صاحب کے معاصرین جو نامور غالبؔ شناس ہیں انہوں نے لکھنا بھی نہیں شروع کیا تھا۔

۱۔ نقوش لاہور غالبؔ نمبر ۳، ۱۹۷۱ء ص: ۲۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۶۵

فرمان صاحب نے پروفیسر وقار گل سے گفتگو کرتے ہوئے کہے تھے۔

''میری ابتدائی کاوشوں میں ۱۹۵۲ء میں جو مضمون شائع ہوا تھا۔ وہ غالبؔ کے کلام میں استفہام تھا جو ایک تنقیدی مضمون ہے اور یہی میری تنقید کی ابتداء بھی۔''(۱)

پروفیسر افتخار اجمل شاہین نے لکھا ہے:

''ممتاز مفکر سقراط'' اور اس کے شاگرد نئے نئے سوالات اٹھانے کے سلسلے میں خاص شہرت رکھتے ہیں کہ فکر و فلسفہ کی اساس ہی سوال و جواب پر ہے۔

''سوال علم کی ایک ایسی کلید ہے جس سے رازہائے سربستہ کو کھولنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے سوال کے اسی اہم پہلو کے پیش نظر غالبؔ کی خصوصیات شاعرانہ کا عالمانہ اور ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے غالبؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں فلسفیانہ طرز فکر کی بنیاد ڈالی ہے۔ غالبؔ معروف معنی میں فلسفی نہ سہی مگر سوالیہ انداز اور استفہامیہ اسلوب اختیار کر کے انہوں نے اردو شاعری میں فلسفیانہ اور فکری عنصر پیدا کرنے کی اولین کوشش کی ہے اور غالبؔ کے کلام میں اس عنصر کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے فرمان صاحب کے اس مضمون کا مطالعہ ضروری ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں صرف ''غالبؔ شاعر امروز فردا'' ہی میں اظہار خیال نہیں کیا۔ انہوں نے متعدد تحریروں میں غالبؔ شناسی کا ثبوت دیا ہے ان سب باتوں کی وجہ سے بحیثیت غالبؔ شناسوں پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری سبقت لے گئے ہیں ان کے دیگر مضامین کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ غالبؔ کا ایک غیر معروف قطعہ۔ افکار نو، لاہور فروری ۱۹۶۱ء

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کتاب نما خصوصی شمارہ مطبوعہ دہلی ۱۹۹۱ء ص:۴۷

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص:۳۶۶

۲۔ غالبؔ وانیسؔ کازمانہ۔رُباعی کااہم دور مشمولہ اردو رباعی ۱۹۶۲ء

۳۔ جدید اردو غزل، غالبؔ سے حالیؔ تک۔سالنامہ نگار کراچی ۱۹۶۵ء

۴۔ جہان غالبؔ (تبصرہ) نگار کراچی اکتوبر ۱۹۶۹ء

۵۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالبؔ شناسی،سیپ کراچی شمارہ (۱۹۸۰ء)

۶۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالبؔ (تبصرہ) نگار کراچی مارچ ۱۹۶۸ء

۷۔ احوال ونقد غالبؔ (مقدمہ،تبصرہ) نگار کراچی ستمبر ۱۹۶۷ء

۸۔ غالبؔ وسرسید۔ہماری زبان علی گڑھ نومبر ۱۹۶۸ء

۹۔ کیا دیوان غالبؔ نسخہ امروہہ واقعۃً جعلی ہے رسالہ ''غالبؔ'' کراچی ۱۹۷۶ء

۱۰۔ ہم عصر ساجی مسائل کاادراک اور غالبؔ۔غالب نامہ دہلی جولائی ۱۹۹۲ء

۱۱۔ ہم عصر ساجی مسائل ادراک اور غالبؔ۔(سالنامہ صریر کراچی ۱۹۹۱ء)

۱۲۔ غالبؔ کے اثرات جدید شاعری پر۔سہ ماہی تمثال (کراچی) ۱۹۹۳ء

۱۳۔ غالبؔ کی شاعری اور مسائل تصوف۔سالنامہ صریر کراچی جولائی ۱۹۹۳ء

۱۴۔ کلام غالبؔ میں ''لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار''،قلمی زیر طبع ماہنامہ اوراق،لاہور۔

۱۵۔ غالبؔ اور دوسرے مضامین تبصرہ۔نگار کراچی ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''شرح ومتن غزلیات غالبؔ'' لکھ کر تفہیم غالبؔ کے کام کو آسان بنادیا ہے۔

۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالبؔ صدی نمبر شائع کیا اور اسی سال سوویت جائزہ میں چھپی ہوئی کتاب دوبارہ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء میں شائع کیا جس میں روسی ادیبوں نے غالبؔ کے بارے میں مضامین لکھے تھے۔۱۹۸۷ء میں انہوں نے غالبؔ بہ نگاہ نیاز نمبر شائع کیا۔۱۹۸۸ء کے خصوصی شمارے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتب کی ہوئی کتاب ''غالبؔ کے اردو خطوط'' کا تنقیدی ایڈیشن شائع کیا۔۱۹۹۱ء میں سید حامد صاحب کا مقالہ ''غالبؔ کی فارسی غزل'' دوبارہ نگار پاکستان میں شائع کیا۔نگار پاکستان ۱۹۹۲ء میں سید محمد مصطفیٰ صابری کی کتاب ''غالبؔ اور تصوف'' دوبارہ شائع کیا۔فرمان صاحب نے ۱۹۹۳ء میں نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ ''مشکلات غالبؔ'' شائع کیا جو مولانا نیاز فتح پوری کی نایاب تصنیف تھی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۲۰۰۰ء میں ''شرح غالب'' شائع کی جو انہیں کی تحریر ہے فرمان صاحب مرزا غالبؔ کے پرستاروں میں ہیں اور انہوں نے اپنے محبوب شاعر کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور انہوں نے غالبؔ فہمی کو فروغ دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک انتہائی فکر انگیز مضمون بعنوان ''غالبؔ کے کلام میں استفہام'' لکھا جو نگار لکھنؤ (مئی ۱۹۵۲ء) میں پہلی بار شائع ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے غالبؔ سنچری کے موقع پر جو کتاب ''تنقید غالبؔ کے سو سال'' کے زیر عنوان پر اوریجنل مضامین کے مجموعے کے طور پر شائع کی اس کے لئے بھی یہ انتخاب کیا گیا۔ ڈاکٹر فرمان کی کتاب ''غالبؔ شاعر امروز فردا'' مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۶۹ء میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔ مشفق خواجہ نے ۱۹۸۷ء میں یوم غالبؔ کے یادگاری مجلّہ کراچی میں بھی اس مضمون کو شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''کچھ دنوں پہلے پروفیسر اسلوب احمد انصاری ۲۱/اپریل ۱۹۸۶ء کے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا کہ ''اقبالؔ پر اسی طرح کا ایک اوریجنل مضمون لکھ دیجئے جیسا کہ ''غالبؔ کے کلام میں استفہام'' کے عنوان سے غالبؔ پر لکھا تھا۔''(۱)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلوب احمد انصاری کو فرمان صاحب کا یہ مضمون کس قدر پسند تھا اور ان کے زور قلم پر کتنا یقین تھا کہ ویسا ہی جامع مضمون فرمان صاحب اقبال پر بھی لکھ سکتے ہیں اس لئے ایک مضمون اقبال پر لکھنے کی خواہش ظاہر کی:

نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ظ۔ انصاری کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس خصوصی شمارہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون بعنوان ''انداز گفتگو کیا ہے'' اور اپنا مضمون بعنوان ''کلام غالبؔ میں استفہام'' بھی شائع کیا۔ یہ مضامین ماہنامہ ''کتاب نما'' بابت ستمبر ۱۹۸۸ء مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی میں پہلے شائع ہوئے تھے۔

نگار پاکستان کے خصوصی شمارہ کے ملاحظات میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص:۴

''ہندوستان سے جو مشاہیر علم و ادب کبھی کبھار پاکستان تشریف لاتے ہیں، ان میں سے بعض شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری دونوں کو گم کردہ راہ اور بہکا ہوا قرار دیتے ہیں۔ بعض کی تحریروں سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ظ۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کی علمی و ادبی حیثیتوں کے کچھ زیادہ قائل نہیں ہیں۔ مقامی طور پر اس کا سبب کچھ بھی ہو لیکن مجھ جیسے دور بسنے والوں کا عام خیال یہ ہے کہ جو لوگ ظ۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کو گم کردہ راہ ٹھہراتے ہیں وہ خود ان دونوں کی عالمانہ حیثیت سے مرعوب اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری شمس الرحمٰن اور ظ۔ انصاری کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

''جناب شمس الرحمٰن اور ظ۔ انصاری دونوں ہمارے عہد کے وسیع المطالعہ و ہمہ جہت ادیب ہیں مشرق کی اہم زبانوں اور قدیم ادب سے آگاہی رکھنے کے ساتھ ساتھ مغرب سے بھی پوری طرح واقف ہیں، ان کی ہر تحریر خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبہ زبان و ادب سے ہو، ان کی سنجیدہ مزاجی توازن فکر اور وسعت مطالعہ کا ثبوت دیتی ہے اور اردو تنقید و تحقیق کے امکانات کو اس طرح روشن کرتی ہے کہ ہم اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہو سکتے۔'' (۲)

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون ''دشمنان غالبؔ اور غالبؔ''، تفہیم و تحقیق غالبؔ کے سلسلے میں کئی اعتبار سے فکر انگیز اور توجہ طلب ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں بت پرستی کی روایت ختم ہونے کے بجائے اور طاقت پکڑ رہی ہے۔ چند کے سوا بیشتر اہل قلم بزرگوں کی ہر بات کو جانچے بغیر، خواہ وہ یکسر غلط ہی کیوں نہ ہو تسلیم کر لیتے ہیں۔ پھر بار بار اس کے حوالے دے کر اس

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص:۴

۲۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص:۴

غلطی کو اتنا مستحکم کر دیا جاتا ہے کہ اس کی تردید کرنا یا حقائق کو سامنے لانا اور انہیں تسلیم کرنا آسان نہیں رہتا۔ غالب کے سلسلے میں بھی وہی ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب نے پہلی بار اس طرف توجہ کی ہے اور نہایت مدلل انداز میں اہل ونظر کو کم سے کم غالب کے سلسلے میں راہ اعتدال اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ مشورہ بہتوں کو گراں گذرے گا لیکن کیا کیا جائے۔ غالب کے بارے میں لکھنا ہے تو غالب کے قول کو مدنظر رکھنا ہی پڑے گا۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک مضمون بعنوان "کلام غالب میں استفہام" بہت پہلے لکھا تھا اور یہ نگار لکھنؤ (مئی ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس موضوع پر اور کسی نے مضمون اس سے پہلے نہیں لکھا تھا۔ جب فاروقی صاحب کا مضمون "انداز گفتگو کیا ہے؟" رسالہ "غالب نامہ (جولائی ۱۹۸۷ء) دہلی میں شائع ہوا تو کچھ لوگ فاروقی صاحب پر خوشہ چینی کا الزام لگانے لگے۔ فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں فرمان صاحب کے مضمون کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور نے لکھا:

"جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے رسالہ "غالب نامہ" دہلی (شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء) میں فرمان صاحب کا حوالہ دیئے بغیر "انداز گفتگو کیا ہے؟" کے عنوان سے غالب کے طرز استفہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کیہ کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے "غالب کے کلام میں استفہام" مطبوعہ نگار لکھنؤ مئی ۱۹۵۲ء کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ (تھیس "غالب نامہ" تجزیاتی مطالعہ عاصمہ اعجاز ۱۹۹۳ء)(۲)

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۷

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء ص: ۲۶۶

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں دوریاں پید ہوگئی تھیں۔ پاکستان میں جو رسالے اور کتابیں شائع ہوتی تھیں ان کی خبر ہندوستان میں نہیں ہوتی تھیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب باخبر محقق اور نقاد ہیں۔ لیکن ان کے لئے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ پاکستان میں چھپنے والے سب مضامین اور کتابوں تک ان کی رسائی ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ فرمان صاحب کا مضمون سب سے پہلے نگار لکھنؤ میں ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں فاروقی صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور فرمان صاحب غیر معروف شخص تھے۔ اس لئے ضروری نہیں ہے کہ فرمان صاحب کے مضمون کا علم ہو جاتا۔ فرمان صاحب کا یہ فکر انگیز مضمون ان کی مشہور کتاب ''غالبؔ، شاعر امروز فردا'' اور دیگر پاکستان میں چھپنے والے جریدوں اور کتابوں میں شائع ہوتا تھا، لیکن فاروقی صاحب کو ان کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ فاروقی صاحب پر سرقہ خوشہ چینی کا الزام بے بنیاد ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ فرمان صاحب کے مضمون کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

پروفیسر سید جاوید اقبال نے اپنے مضمون بعنوان ''اولیات ڈاکٹر فرمان فتح پوری'' میں لکھا ہے:

> ''غالبؔ، شاعر امروز فردا'' ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آئی جس میں پہلی بار فکر غالبؔ سے متعلق کئی مضامین یکجا ملتے ہیں۔ ان مضامین میں ''غالبؔ کے کلام میں استفہام'' فکر غالبؔ کے حوالے سے اردو میں پہلا تنقیدی مضمون ہے جس میں غالب کے مفکرانہ رویے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ مضمون پہلی بار نگار (لکھنؤ ۱۹۵۲ء) میں چھپا، دوسری مرتبہ ''تحقیق وتنقید'' طبع اول ۱۹۶۳ء میں، تیسری مرتبہ ''تنقید غالبؔ کے سو سال'' (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء میں) اور چوتھی مرتبہ زیر نظر کتاب میں شامل کیا گیا۔ اس مضمون کا شمار غالبؔ شناسوں نے غالبؔ پر لکھے گئے اوریجنل مضامین میں کیا ہے اور ہر مکتبۂ فکر نے اسے داد دی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ ''کلام غالبؔ میں استفہام'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر اس کو بغور

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۳۸۳

مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے غالبؔ کے کلام میں استفہامیہ لہجے میں انداز بیان کی دلکشی کے ساتھ ساتھ فکر ونظر کی رعنائی بھی دریافت کی ہے۔ تفہیم غالبؔ کے سلسلے میں فرمان صاحب کا مقالہ سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقالے میں لکھا ہے:

''غالبؔ کے اسلوب شاعری میں جو چیز بہت نمایاں ہے وہ ان کا سوالیہ یا استفہامیہ لب ولہجہ ہے۔ اس لب ولہجہ سے ان کی جدت طرازی، مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرز فکر تینوں چیزوں کا سراغ ملتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مزید لکھتے ہیں:

''کلمات استفہام کو روز مرہ کی تقریر وتحریر میں غیر معمولی دخل ہے۔ اردو میں عام طور پر کون، کیا، کب، کدھر، کب تک، کیوں، کیونکر اور کیسے وغیرہ استفسار کے لئے لائے جاتے ہیں۔ یہ کلمات الگ الگ زیادہ اہم نہیں لیکن وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ استعمال ہو کر کلام پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ان کی معنویت اور اہمیت خود بخود جھلک پڑتی ہے۔ یہ کلمات نہ صرف اظہار استفسار کا کام کرتے ہیں بلکہ اکثر کلام کو فصیح وبلیغ بنانے میں مدد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔''(۲)

آگے چل کر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''کلمات استفہام کو مختلف طریقوں سے زبان میں دخل ہے اور ان کا برمحل استعمال کلام کے حسن واثر میں اضافہ کرتا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۶۳
۲۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۶۴
۳۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۶۶

''صرف غالبؔ اردو کے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے کلماتِ استفہام''
کی گہرائیوں اور لطافتوں کو شدت سے محسوس کیا اور استفساریہ انداز بیان میں
پورا زور صرف کیا۔ مرزا کے اسلوب بیان کی جدت کا راز بڑی حد تک اسی انداز
بیان میں پوشیدہ ہے۔''(۱)

نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقالہ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ غالبؔ کے یہاں تجسس اور ڈرامہ کی جو فضا ملتی ہے وہ انہیں بیسویں صدی کے ذہن کے بہت قریب لے آئی، غالبؔ نے نئے نئے سوال اٹھائے ہیں لیکن ان سوالوں کے باہر بھی وہ اپنی بات سوالیہ انداز میں کہنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ معشوق کی یکتائی کا مضمون بھی وہ استفہام کے ذریعہ ادا کرتے ہیں۔

فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''غالبؔ کو دیکھئے جو سر سید کو مشورہ دیتے ہیں کہ بھائی پرانی عمارتوں اور
لوگوں کا ذکر لا حاصل ہے۔ انگریزوں کو دیکھ کر وہ بجلی کی لہروں کے ذریعے
پیغام رسانی کرتے ہیں اور دھوئیں کے زور پر لوہے کے جہازوں کو سمندر کے
سینے میں دوڑائے ہیں۔ غالبؔ کے اس نظریئے کو انگریز پرستی پر محمول کرنا غلط
ہوگا کیونکہ وہ اپنی شاعری میں بھی لاشعوری طور پر سہی، لیکن بے شک وہ شبہ فکر و
احساس کے ان دھاروں سے آشنا معلوم ہوتے ہیں جو جدید مغرب میں جاری
وساری ہے اور جن کا اس وقت ان کے ماحول میں کوئی ذکر نہ تھا۔ غالبؔ کا رویہ
استقبال پرستوں کے Reverence for the Machine رویئے
سے قریب نظر آتا ہے۔''(۲)

فاروقی صاحب مرزا غالبؔ کی فارسی مثنوی (تقریظ آئینۂ اکبری مصحفہ سید احمد خان کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس میں کہا تھا ۔)

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۶۷

۲۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۵۰

صاحبانِ انگلستاں را نگر شیوہ و انداز پناہ را نگر
تاچہ آئین ہا پدیر آوردہ اند آنچہ ہرگز کس نہ دید، آوردہ اند
زیں ہنر منداں ہنر بہشتی گرفت سعی پر پشییاں پیشِ گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند ہند نہ صد گو نہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بہروں آورند ایں ہنر منداں ز حسن چوں آورند
تاچہ اخوی کواندہ اند انہاں برآب دود کشتی را ہمی راند، و آب
گہہ و خاں کشتی بہ جیحوی می بزد گہہ و خاں گرد و بہ ہاموں می برد
غلتکِ گردوں بگر داند و خاں نرہ گا ؤ و اسپ را ماں دکاں
ازدِ خاں زورق برفتار آمدہ باد و موج ایں ہردو بیکار آمدہ
نغمہ ہائے زخمہ از ساز آورند حرف چوں طائرہ بہ پرواز آورند
ہیں نمی بنی کہ ایں دانا گروہ درد و دم آرند حرف از سد گروہ
می زنند آتش بہ باد اندر ہمی درد درخشد باد چوں اخگر ہمی
رو بہ لندنماند راں رخشندہ باغ شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
کاروبار مردم ہشیار بیں در ہر آئین صد نو آئین کار بیں
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار کشتہ آئین دگر تقویم پار“(۱)

جناب عبدالرحمٰن ناصر معروف براڈ کاسٹر لغت نویس، ادیب، اسسٹنٹ اسکالر اردو لغت بورڈ کراچی ہیں۔

مضمون نگار نے مندرجہ ذیل حوالہ کے بارے میں لکھا کہ کلمات استفہام کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پہلی بار منکشف کیا ہے:

”مرزا غالبؔ کے اسلوب بیان کی جدت کا راز بڑی حد تک کلمات

۱۔ کلیات غالبؔ فارسی مرتبہ امیر حسن نورانی۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص: ۳۹۸، ۳۹۹

استفہام کی گہرائیوں اور لطافتوں کوشدت سے محسوس کرنے اور استفساریہ انداز بیان اختیار کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ان کے استفہامیہ لب و لہجے سے ان کی جدت طرازی، مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرز فکر تینوں چیزوں کا سراغ ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کلمات استفہام کے استعمال سے جیسا فائدہ شاعری میں غالبؔ نے اٹھایا ہے کسی دوسرے شاعر نے نہیں اٹھایا ہے۔"(۱)

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے فکر انگیز مضمون سے بہت پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون میں ،مرزا غالبؔ کے استفہامیہ لب ولہجہ میں فلسفیانہ طرز فکر کے سراغ ملنے پر زور دیا ہے فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں اس بات کا اضافہ کیا کہ غالبؔ کے استفہامیہ اندازِ گفتگو مغربی تہذیب سے اثر انداز ہوئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ" ۲۰۰۴ء میں عاکف بک ڈپو، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کا انتساب ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر سلیم اختر کے نام کیا ہے جن کے ذہن وقلم کی آبیاری سے اردو زبان وادب کا چمنستان سیراب وشاداب ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اس کتاب کا تعارف یوں کرتے ہیں:

"غالبؔ کے فکر وفن کے بارے میں یہ میری دوسری کتاب ہے۔ پہلی کتاب "غالبؔ شاعر امروز فردا" غالبؔ صدی کے جشن کے موقع پر شائع ہوئی تھی۔ گویا دوسری کتاب کم وبیش پچیس سال کے وقفے کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ یہ پچیس سال دوسری علمی وادبی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ غالبؔ اور غالبیات کو سینے سے لگائے رہنے میں گذرے ہیں۔ اس عرصے میں غالبؔ کے بارے میں میرے کئی مضامین مختلف رسائل میں چھپے اور اہل نظر کی توجہ کا مرکز بنے، ان میں جس مضمون کو میں نے اپنے شعور اور لاشعور کا حاصل اور ایک طرح سے القائی انکشاف وتنقید کا جز جانا وہ کلام غالبؔ میں لفظ تمنا کی

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص:۴۲

تکرار بطور استعارہ فلسفۂ آثار تھا۔ اب بھی اس کتاب کا مضمون اول ہے۔"(۱)

فرمان صاحب نے مزید لکھا:

"تنقید غالبؔ کے سلسلے میں میرے اس مضمون کی حیثیت کم وبیش وہی ہے جو میرے ایک پرانے مضمون "کلام غالبؔ میں استفہام" کی تھی۔"(۲)

فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"غالبؔ کے بارے میں میرا پہلا تنقیدی مضمون "غالبؔ کے کلام میں استفہام" مئی ۱۹۵۲ء کے نگار (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اور غالبیات کے باب میں میرے اس طویل مطالعے اور مسلسل غور وفکر کا حاصل تھا، جسے میں ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے اپنائے ہوئے تھا کہ میرے اس مضمون کو تنقید غالبؔ کے سلسلے میں بالکل نیا اور چونکا دینے والا مضمون خیال کیا گیا۔ سارے علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے داد دی گئی اور مجھے غالبؔ کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے غالبؔ کے کلام میں لفظ تمنا کی تکرار کی بابت اپنے فکر انگیز مقالہ میں غالبؔ شناسی کا بھرپور ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک سادہ سے لفظ "تمنا" کا استعمال ان کے فکر وفن کے بعض بہت اہم نکتوں اور بنیادی رویوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی سرشت مزاج کا وہ خاص پہلو جو انہیں بہ ہر گام وبہ ہر روش جدت پسند، فلسفہ طراز، مستقبل بیں وفرداشناس، خود بیں وآزادرو، ہر لمحہ متغیر ومتجسس، اندیشہ ہائے دور دراز میں

۱۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۷
۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۷
۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۸

غلطیاں اور مشاہدہ حق کی گفتگو میں از خودرفتہ بنائے رکھتا ہے دراصل لفظ ''تمنا'' میں پوشیدہ ہے اور ان کا طرز فکر جیسا لفظ ''تمنا'' سے اجاگر ہوتا ہے۔ کسی دوسرے لفظ سے نہیں ہوتا۔ گویا ''تمنا'' کا لفظ غالبؔ کے یہاں محض وسیلہ حسن تکرار نہیں، بلکہ معنی کی سطح پر ایک استعارہ فلسفہ آثار بھی ہے اس لفظ سے سراغ لگتا ہے کہ ان کے اکثر افکار و خیالات جنہیں عموماً منتشر سمجھا جاتا ہے۔ وہ منتشر نہیں ہیں بلکہ ایک خاص فکری رشتے میں جڑے ہوئے ہیں۔''(۱)

فرمان صاحب نے اپنے فکر انگیز مضمون میں غالبؔ کے کلام میں لفظ ''تمنا'' جگہ جگہ پر مفرد صورت میں اور مرکبات کی صورت میں استعمال دکھایا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''ان کی یہی معنوی یکسانگی، غالبؔ کے ذہن کے بعض سربستہ و منتشر اجزاء کو واشگاف کرتی ہے اور ایک کل کی صورت میں ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہ کلیات، فکر غالبؔ کا وہ گوشہ خاص یا رُخ ہے جو انہیں اپنے عہد کا سب سے بڑا تجدد پسند بناتا ہے۔ نئی چیزوں کو اپنانے پر ہر لحہ آمادہ رکھتا ہے، روش عام پر چلنے سے باز رکھتا ہے۔ خراب سے خراب حالات سے آنکھیں چار کرنے اور حقائق کو فراخدلی کے ساتھ قبول کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''غالبؔ کے یہاں ''تمنا'' کا لفظ محض آرزو و خواہش، شوق اشتیاق، محبت، عشق، طلب، جذب جنوں، لگن، لگاؤ، دُھن اور مستی وغیرہ کا سادہ مترادف نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی وسعت ہے اور یہ دراصل استعارہ ہے حرکت و فعالیت کا، تحرک و تغیر کا خود اعتمادی و خود اختیاری کا، ناسازگار حالات

۱۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۹، ۲۰

۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۲، ۲۳

سے ستیزہ کاری کا، زندگی سے بہرحال وابستہ رہنے کا اور اسے تسخیر کرنے کا، شرر سے ستارہ اور ستارہ سے آفتاب تک پہونچنے کا، خوب سے خوب تر کی تلاش میں خود کو کھوئے رکھنے کا، آدمی کو محشر خیال سمجھنے کا اور ارادہ وعمل میں اسے مختار جاننے کا، لاانتہا کی انتہا تک پہونچنے کا، آرزومندی کا، بے نہایت حصول کے لئے کوشاں رہنے کا، ذہن انسانی کی رسائیوں کو بے کراں جاننے کا اور اس کی فتح مندی وکامرانی پر یقین رکھنے کا، زمانے کی ناہنجاری کا مقاومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کا اور یاس ناامیدی کی تاریک فضا میں رجائیت وامید کے چراغ جلائے رکھنے کا کام کیا ہے۔"(۱)

آگے چل کر فرمان صاحب غالبؔ کے کلام میں استفہامیہ لہجے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غالبؔ کے یہاں اگرچہ کوئی مربوط نظام فکر نہیں ملتا لیکن ان کا ذہن بہرحال فلسفیانہ تھا اس لئے کہ وہ کیوں، کیا، کیسے کے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے اور اب لفظ "تمنا" کے مدد سے اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ غالبؔ اصطلاحی مفہوم میں فلسفی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، لیکن فلسفیانہ ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حیات افروز نظام فکر وفلسفہ بھی رکھتے تھے، یہ فلسفہ زندگی کو مسلسل منقلب ومتحرک جانتے، انسان کو اپنے ارادہ وعمل میں بااختیار سمجھنے، تسخیر کائنات کے باب میں مسلسل سعی کرتے رہنے اور سعی میں کامیابی وناکامیابی سے بے نیاز رہ کر خوش وخرم رہنے کا فلسفہ ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنے اس مضمون کے ذریعہ غالبؔ کی فلسفیانہ شاعری اور نظریہ حیات کو خوب سراہا ہے۔ وہ غالبؔ کے فلسفہ زندگی کو خوب سمجھتے ہیں اور انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے دنیا کو خوب سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے بیسویں صدی کے نصف آخر کے غالبؔ شناسوں میں ان کا مقام

۱۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۳۶

۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۴۲

سب سے ارفع واعلیٰ ہے۔

فرمان صاحب کا مضمون ''غالبؔ کی شاعری اور مسائل تصوف'' بھی تفہیم غالبؔ کے لئے بہت ضروری ہے۔فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''غالبؔ نے بھی تصوف کے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی لیکن ایسا کرنے میں وہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ اس مسائل کا بیان کرنے پر قادر نہ تھے بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ ان کے مزاج کو تصوف سے مناسبت نہ تھی۔''(۱)

فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''غالبؔ کی مستقبل بیں اور دور اندیش فلسفیانہ سوچ انہیں صوفیوں کی طرح یک سو ہو کر بیٹھ جانے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔وہ ماضی سے زیادہ حال و مستقبل پر نظر رکھتے اور نئی سے نئی چیز کو قبول کر لینے پر ان کا ذہن ہر وقت آمادہ رہتا تھا۔ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنا یا ماضی پرستی کو سراہنا ان کے مزاج کے خلاف بات تھی چنانچہ اسلاف کے نقش پر چلنے سے زیادہ اپنی راہ آپ بنانے کے قائل تھے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے ایک مضمون ''ہم عصر سماجی وتہذیبی مسائل کا ادراک اور غالبؔ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''..........کلکتے کی نئی تہذیب اور بولتی ہوئی زندگی کا اثر غالبؔ پر محض تاثراتی و لمحاتی نہ تھا، وہ پوری سنجیدگی سے یہ سمجھنے اور محسوس کرنے لگے تھے کہ برصغیر کے موجودہ سیاسی و سماجی حالات میں مغربی تہذیب کے قہقہوں کے آگے مشرق کی مٹی کے دیئے بہت دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔''(۳)

۱۔تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۵۵
۲۔تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۶۸
۳۔تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۹۵

اسے غالبؔ نے بہت پہلے نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ اپنے عہد کے معزز علماء وفضلاء کے سامنے بالاعلان پیش بھی کر دیا تھا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اس کتاب کے آخر میں ''نسخہ حمیدیہ کے چند اشعار کو انتخاب کیا ہے۔

''جاننے والے جانتے ہیں کہ غالبؔ کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری سے کمتر درجے کی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان کی مقبولیت وشہرت کا مدار فارسی پر نہیں اردو پر ہے یہی صورت کم وبیش علامہ اقبالؔ کی ہے۔ میرے نزدیک اقبالؔ کی فارسی شاعری بحیثیت مجموعی، اردو شاعری سے زیادہ توانا و پرکار ہے۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ سو سال میں فارسی اور ذوق فارسی پر ایسا زوال آیا کہ غالبؔ واقبالؔ کی فارسی شاعری کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کی وہ مستحق تھی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء کے خصوصی شمارہ میں سید حامد صاحب کا مقالہ وغالب کی فارسی غزل شائع کیا ملا، خطات میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

''غالبؔ کی فارسی شاعری کے سلسلے میں اس طرح کا صرف ایک مضمون اس سے پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ علامہ نیاز فتح پوری کا تھا۔ امداد امام اثرؔ کی غالب شناسی کے جواب میں تھا اور یہ نگار میں چھپا تھا۔ نیاز کے اس مقالے نے غالبؔ کی شاعری کی طرف اہل ذوق کو رجوع کرنے میں وہی کردار ادا کیا تھا جو غالب کے اردو کلام کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری کے مقالے ''محاسن کلام غالبؔ'' نے کیا تھا بعد ازاں غالبؔ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا۔ کتابی شکل میں بھی اور مقالات کی صورت میں بھی لیکن غیر دلکش پیرائے میں، اس لئے بے اثر رہا۔ سید حامد صاحب کا مقالہ اس کمی کو پورا کرتا ہے۔''(۲)

۱۔ ماہنامہ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء ص:۴)

۲۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء خصوصی شمارہ ملاحظات ص:۴

ڈاکٹر فرمان صاحب نے سید حامد صاحب کے مقالہ کی تعریف کی اور لکھا کہ انہوں نے غالبؔ کی ساری اہم غزلوں اور بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے اور بہت خوبصورت نثر میں ان کی مختصر تشریح بھی کر دی ہے نیز ہم معنی اردو اشعار بھی جا بجا دے دیئے ہیں۔

اس خصوصی شمارے میں --فرمان صاحب نے غالبؔ کے ۷ ار مشہور فارسی اشعار درج کئے ہیں۔ فرمان صاحب کا حافظہ بہت اچھا ہے اور انہیں لاتعداد فارسی اور اردو اشعار یاد ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سید حامد صاحب کا تعارف کرایا ہے وہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیانی عرصہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ اور فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ سید حامد صاحب کی وجہ سے یونیورسٹی کا وقار حکومت اور عوام کی نظر میں بحال ہوگا۔ ہندوستان اور ان کی سربراہی و قیادت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک بار پھر حقیقی معنوں میں یونیورسٹی ہوگئی۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے سید حامد کے ان خدمات کا بھی ذکر کیا ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کئے۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''سید حامد، تقریر و تحریر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ کراچی کے چند روزہ قیام میں انہوں نے انجمن ترقی اردو، کراچی یونیورسٹی، اردو ڈکشنری بورڈ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کے اجتماعات میں ہندوسانی مسلمانوں کے موجودہ سیاسی و سماجی شعور اور تعلیمی و اقتصادی مسائل پر جو برجستہ خطبات دیئے، وہ فکر انگیز بھی تھے اور معلومات افزاء بھی۔''(۱)

سید حامد صاحب نے اپنی اس فکر انگیز مقالہ میں لکھا:

> ''ہر بڑے شاعر کی دنیا میں داخل ہونے اور وہاں زندگی گذارنے کے اپنے الگ آداب ہوتے ہیں۔ انہیں برتنے لگے تو انکشافات کے حیرت انگیز ابواب کھلتے چلے جائیں گے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ اشعار بھی جنہیں نادانی کی تاریکی یا ہمہ دانی کے زعم میں آپ نے خاکستر سمجھ رکھا تھا وہ بھی

۱۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء خصوصی شمارہ ص: ۸

چنگاریوں اور لعل و گہر سے بھرے ہوئے ہیں۔"(۱)

حامد حسن صاحب غالب کی اردو فارسی غزلوں میں امتیاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب کی اردو اور فارسی غزلوں میں بہت سی مشابہتوں سے قطع نظر ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اردو کی غزلیں بظاہر سکون اور عافیت کے ساتھ فراغت میں کہی گئی ہیں۔ ان میں کشادگی فرحت اثری اور شگفتگی ہے۔ یہاں شاعر تنہا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی اردو غزلیں نام نہاد "بے رنگی کے باوصف اردو شاعری میں عدیم المثال ہیں۔"(۲)

غضنفر علی اوف اپنے مضمون "فارسی میں غالب کا رنگ تغزل" میں مرزا غالب کی فارسی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے فارسی ادب کی پرانی عظمت کا چراغ دوبارہ ایسے وقت میں روشن کیا جبکہ وہ اپنا بلند مقام اردو ادب کے لئے خالی کر رہا تھا۔"

غالب سے متعلق نگار پاکستان کے خصوصی شمارے

۱۹۶۹ء میں رسالہ 'سوویت جائزہ' (شعبہ اطلاعات سفارت نامہ، سوویت یونین دہلی) نے غالب نمبر شائع کیا تھا جس میں روسی ادیبوں کے مضامین شامل تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار پاکستان (ستمبر ۱۹۸۶ء) میں اس کو دوبارہ شائع کیا اور اس نایاب و کمیاب نسخہ کو نذر قارئین کیا اور غالب شناسوں پر احسان کیا۔ اس شمارے میں فرمان صاحب کے ملاحظات کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ انیسویں صدی کا ہندوستانی ادب اور مرزا غالب۔ ای چیلی شیف۔

۲۔ سوویت یونین میں غالب کی مقبولیت۔ اکامیشین بابا جان غفوروف۔

۳۔ غالب کا فلسفہ حیات۔ ایل آر گوردن پولسنکایا۔

۱۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء خصوصی شمارہ ص: ۱۰

۲۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء خصوصی شمارہ ص: ۲۴

۳۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء ص: ۱۹۵۲ء

۴۔ حالی اور مرزا غالب۔ اے شوخا چیف۔

۵۔ غالب اور اقبال۔ این پریگرینا۔

۶۔ فارسی میں غالب کا رنگ تغزل۔ غضنفر علی اوف

۷۔ غالب ایک مطالعہ۔ اکادمیشین بابا جان غفور اوف۔

۸۔ سوویت یونین میں غالب کی تخلیقات کا مطالعہ۔ جی وائی علی اوف۔

بابا جان غفوروف نے اپنے مضمون میں لکھا:

''سوویت تاجکستان اور وسط ایشیا کی دوسری جمہوریتوں میں غالب کے کلام کو بیحد پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت ہے۔ بس اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ بیدل کے شاعری کو قبولیت کا شرف وسط ایشیا ہی میں حاصل ہوا ہے۔ بیدل کے کلام سے دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس کی حیثیت ایک ادبی تحریک کی ہوگئی جسے ''بیدل شناسی'' کہا جاتا ہے بیدل شناسی ہی کا نتیجہ ہے کہ دوسرے ہندوستانی شاعروں سے دلچسپی بڑھی جن میں غالب کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔''(۱)

بابا جان غفوروف نے مزید لکھا:

''اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کی فکر انگیزی اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ بردمند ہوئی۔ آج کے جدید ہندوستانی ادب کے بہت سے زبردست شعری دریا غالب ہی کے کلام سے پھوٹے ہیں۔''(۲)

غالب کی انسان دوستی اس عظیم تخلیقی عنصر کے حائل ہیں جو ان کی شاعری کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے اور جو مشرق کی قوموں کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

۱۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء ص: ۷

۲۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء ص: ۱۰

ای چیلی شیف نے لکھا:

''غالبؔ کی شاعری اور ان کا عالمی نقطہ نظر اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۱)

ایل آر گوردن پولسدکایا نے لکھا:

''غالبؔ کے کلام کو ایک ناقد نے صحیح کہا ہے کہ غالبؔ کے خیالات کی ایک خصوصیت ان کی وسیع المشربی ہے جس پر آج کی تعلیم یافتہ نسل کے لوگ بھی رشک کر سکتے ہیں۔''(۲)

بابا جان غفوروف نے لکھا:

''غالبؔ کی شاعری کا ایک امتیازی پہلو، زندگی کو فلسفی کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش ہے۔''(۳)

ہندوستان سے باہر مرزا غالبؔ کے کلام کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ غالبؔ کے اردو اور فارسی دیوان سوویت یونین کی ریاستوں میں بے حد مقبول رہے ہیں۔ ان کے ترجمے ہوئے ہیں اور رسالوں اور کتابوں میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ غالبؔ کی نظم کے ساتھ ساتھ ان کی نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ خاص طور پر غالبؔ کے خطوط میں بہت دلچسپی دکھائی گئی ہے۔ تاشقند میں بیدل خسرو اور غالبؔ کی فارسی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غالبؔ کی بین الاقوامی شہرت کی اصل وجہ ان کی انسان دوستی اور تازگی فکر ہے غالبؔ پشکن اور طالسطائے کے ہم عصر ہیں۔

شرح غالبؔ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شرح غالبؔ لکھ کر غالب شناسی کے میدان میں اپنا رُتبہ اور بڑھا دیا۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں فرمان صاحب امریکہ گئے اور حسب مطابق ان کا قیام اپنی بیٹی ڈاکٹر شمیم اور اپنے داماد ڈاکٹر

۱۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء ص:۲۳

۲۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء ص:۴۷

۳۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۸۶ء ص:۵۸

سلمان کے ساتھ نیویارک میں رہا۔ نیویارک میں سردی بہت بڑھ گئی تو ان کو اپنے بیٹے ڈاکٹر سید ابصار علی کے پاس اورلینڈ (ریاست فلوریڈا) میں پناہ لینی پڑی۔ دو مہینے وہاں رہے لیکن وہاں مشکل یہ تھی کہ ڈاکٹر ابصار کے گھر میں طب اور چند مذہبی کتابوں کے سوا کوئی کتاب نہ تھی۔ فرمان صاحب اپنے ساتھ مولانا حامد علی خاں مرتبہ دیوان غالبؔ (مطبوعہ ۱۹۶۹ء لاہور) لے گئے تھے۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''کتابوں کے بغیر وقت گذارنا کتنا بڑا عذاب ہے۔ اس کا حقیقی اندازہ مجھے اورلینڈو کے قیام میں ہوا۔ صبح سویرے اٹھنے کی عادت نے وقت کو مزید گراں بار کر رکھا تھا اور صبح ساڑھے پانچ تا ساڑھے آٹھ بجے یعنی ناشتے سے پہلے تین گھنٹے کا وقت کاٹنا میرے لئے سخت دشوار ہوتا تھا عجب طرح کا عالم عذاب تھا۔ اس عالم عذاب میں ایک دن نہ جانے کیسے یک بیک یہ بات ذہن میں آئی کہ کیوں نہ دیوانِ غالبؔ کی شرح لکھنی شروع کر دی جائے۔ یہ خیال ایسا سکون بخش محسوس ہوا کہ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شرح دیوان غالبؔ کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہو گیا اور میرا سارا وقت اسی کام میں گذرنے لگا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری شرح غالبؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''دیوان غالبؔ کے باقاعدہ اور مسلسل مطالعے سے غالبؔ کا وہ تنقیدی و خود احتسابی ذہن بھی سامنے آ گیا جس نے ان سے اپنے کلام کی کاٹ چھانٹ کرائی اور کچھ ایسی کاٹ چھانٹ کرائی کہ غالبؔ کی ساری غزلیں خواہ طرحی ہوں یا غیر طرحی اپنے ہم عصر شعراء کے مقابلے میں حد درجہ مختصر ہو کر رہ گئیں۔ اور یہ انکشاف مجھ پر پہلی بار ہوا کہ ان کی طویل سے طویل غزل صرف سولہ سترہ اشعار کی ہے اور یہ بھی تعداد میں صرف ایک ایک ہیں۔ بیس کے قریب ان کی غزلیں ایک شعری ہو یعنی ان میں سے ہر غزل صرف ایک شعر کی حامل ہے۔ کم و بیش تیس غزلیں دو دو شعر کی اور پچیس

۱۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۰ء ص: ۷

غزلیں صرف تین تین شعروں کی ہیں۔"(۱)

شرح فرمان کی خصوصیت ہے کہ اس میں نہ بے جا اختصار ہے اور نہ بے طوالت۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"تفہیم و تشریح کے باب میں خود کفیل ضرور ہیں یعنی اس کے مطالعے سے عام قاری کے ذہن کی تشفی ہو جانی چاہئے اور اس کے لئے ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہ ہوگی۔"(۲)

دیگر شارحین غالبؔ میں فرمان صاحب نے نیاز، حسرتؔ، شاداںؔ، آسیؔ، اور آغا باقر کا ذکر یوں کیا ہے:

"علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرتؔ موہانی جیسے رموز سخن سے آگاہ اور نکات کلام غالبؔ سے آشنا شارحین غالبؔ اب کہاں پیدا ہوں گے لیکن اختصار نویسی کے سبب ان کی شرحیں وہ غرض پوری نہ کر سکیں جس کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اس طرح کا عیب شاداں بلگرامی اور مولانا عبدالباری آسی کی شرحوں میں ہے۔ ان بزرگوں نے شرح غالب کے سلسلے میں ایک جگہ نہیں جگہ جگہ ایسی بے جا طوالت اور غیر ضروری تشریحات سے کام لیا ہے۔ قاری کے لئے غالبؔ کا شعر آسان ہو جانے کے بجائے کچھ اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بعض شارحین نے اپنی طرف سے تو بہت کم لکھا البتہ دوسری شرحوں سے ایک ایک شعر کی درجنوں بامعنی اور بے معنی تشریحات نقل کر کے شعر غالب کو سہل کرنے کے بجائے گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ آغا محمد باقر اور بعض دوسروں کی شرحیں اسی قبیل کی ہیں اور دراصل بحیثیت مجموعی شرح کلام غالبؔ کی یہی وہ کمزوریاں ہیں جن کے سبب میں کبھی ان سے مطمئن نہ ہو سکا اور یہی بے اطمینانی میرے

۱۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۹ء ص: ۸،۹

۲۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۹ء ص: ۹

لئے ایک اور شرح غالب کا جواز بن گئی۔"(۱)

واقعی شرح فرمان کو پڑھ کر مرزا غالب کے کلام کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے دوسری شرحوں میں یہ بات نہیں ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے محبوب ترین شاعر غالب ہیں اور انہوں نے محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔

فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اشعار کی تشریحات کو طوالت سے بچانے کے لئے میں نے مذکورہ بالا وضاحتی انداز سے گریز کیا ہے۔ جسے مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے محاسن کلام غالب" میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے "فکر اقبال" اور شمس الرحمٰن فاروقی نے "شعر شور انگیز" میں اپنایا ہے۔ پھر بھی میں غالب سے اپنے غیر معمولی وابستگی کے سبب غالب کے اشعار کی تشریح میں کچھ ایسا ڈوب جاتا تھا اور اس کے لفظی ومعنوی محاسن کی توضیح کچھ اس انداز سے کرنے لگتا تھا کہ شرح کی حدوں سے آگے بڑھ کر میرا قلم اور میری تحریر تاثراتی تنقید کے دائرے میں داخل ہوجاتی تھی۔"(۲)

فرمان صاحب نے دیباچے میں بتایا ہے کہ پریس بھجوانے کے پہلے انہوں نے مسودے پر نظر ثانی کی اور اس سلسلے میں علی گڑھ کے سعید الدین احمد کی شرح مطبوعہ ۱۹۲۶ء سے بطور خاص مدد لی۔

شرح فرمان سے چند مثالیں پیش ہیں۔غالب کا مشہور شعر ہے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

فرمان صاحب اس کی شرح یوں بیان کرتے ہیں:

"یہاں آگہی سے مراد باخبری وواقفیت اور علم وفکر ہیں۔عنقا ایک فرضی پرندہ مراد ناپید اغائب اور لامولود۔اس شعر میں دراصل غالب نے اپنی مشکل

۱۔شرح ومتن غزلیات غالب از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۰ء ص:۹،۱۰

۲۔شرح ومتن غزلیات غالب از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۰ء ص:۱۲،۱۳

پسندی اور اپنے حریفوں کی ناسخن شناسی و غالب ناشناسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرے شعر کے مفہوم تک رسائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ لوگ اپنے علم و دانش کا کتنا ہی بڑا جال بچھائیں میرے کلام کے معانی ان کی گرفت میں نہیں آسکتے۔ اس طرح کا اظہار غالبؔ نے اپنے کلام کے بارے میں بعض دوسرے مقامات پر بھی کیا ہے۔"(۱)

مرزا غالبؔ کا شعر ہے۔

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس شعر کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں:

"غزل کی صنف میرے غیر معمولی ذوق شعر گوئی کے لئے ناکافی ہے اور میرے خیالات کے بحر ذخار کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایک وسیع ایک آب جو کی سی ہے اس لئے مجھے اپنے اظہار خیال کے لئے کسی وسیع تر صنف سخن کو اپنانا پڑے گا۔"(۲)

اس غزل کا مدحیہ شعر ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

فرمان صاحب اس کی یوں تشریح کرتے ہیں:

"نہ جانے کس پاکیزہ و مقدس شخصیت کا مبارک نام میرے ہونٹوں پر آیا کہ میری قوت گویائی نے میرے ہونٹوں کو احترام و عقیدت کے ساتھ چوم لیا۔ یوں بھی منہ کے اندر زبان لبوں کو مس کرتی رہتی ہے۔ یہی اس کا بوسہ لینا ہوا۔ یہ شعر واضح طور پر نعت کا ہے اور اس کا اطلاق اگر کسی شخصیت پر ہوتا ہے تو وہ صرف حضور اکرمؐ ہی کی شخصیت ہو سکتی ہے۔"(۳)

۱۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۹ء ص: ۱۷، ۱۸

۲۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۹ء ص: ۴۳۱

۳۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۹ء ص: ۴۳۱

غالبؔ کا یہ شعر نعتیہ نہیں ہے یہ تجمل حسین خاں کی مدح میں کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے اس شعر کا استعمال اپنی تقریر و تحریر میں کیا ہے اور اس کو حضور اکرمؐ سے منسوب کیا ہے۔

مرزا غالبؔ نے اس شعر میں اپنے ممدوح تجمل حسین خاں کی طرف اشارہ کیا ہے غالبؔ کا شعر ہے۔

رنج رہ کیوں کھینچئے واماندگی کو عشق ہے ‏ ‏ ‏ اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

فرمان صاحب اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہماری واماندگی پر نہ جائیے اور اسے قدم آگے بڑھانے سے نہ روکئے اس لئے کہ ہماری واماندگی کو ہم سے عشق ہے، وہ ہر عالم میں ہمارے ساتھ رہے گی اور اس پر مسافت و مسافرت کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس لئے راستے کی تھکن اور واماندگی کا خیال نہ کیجئے۔ اس نے قدم منزل کی جانب بڑھا دیا ہے، وہ اب کسی حال میں پیچھے نہ ہٹے گا واماندگی اور قدم اٹھنے کے الفاظ میں یہ روایت بھی رکھی ہے کہ تھکا ہوا قدم مشکل ہی سے آگے بڑھنے کو اٹھتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نئی شرح غالبؔ لکھ کر عام قاری کی ضرورت کو پورا کیا ہے مگر دیگر شارحین کی شرحیں یکسر رد نہیں کی جا سکتی۔ تفہیم غالب کے لئے ان کے مطالعہ کرنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی کتاب غالب شاعر امروز فردا میں مولانا عبدالباری آسی لکھنوی کی شرح دیوان غالبؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ شرح باعتبار جسامت دوسری شرحوں سے بھاری بھر کم ضرور ہے لیکن نہ ان مصائب سے پاک ہے جو آسی صاحب کے دوسری شرحوں میں پائے جاتے ہیں اور نہ وہ مطلب کی صحت کے اعتبار سے حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کی شرحوں سے بہتر ہے۔ آسی صاحب کہیں کہیں تو سہل ممتنع کے اشعار کی مطلب نگاری سے بھی پوری طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔''(۲)

۱۔ شرح و متن غزلیات غالبؔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۲۰۰۰ء ص: ۳۰۲

۲۔ غالبؔ شاعر امروز فردا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء ص: ۱۷۲

ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں جو مختلف جگہوں پر شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ غالبؔ، شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء

۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ کراچی ۱۹۹۵ء

۳۔ شرح دیوان غالبؔ ملتان۔ ۱۹۹۹ء

مقالات جو رسالہ نگار میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ غالبؔ کے کلام میں استفہام — نگار لکھنؤ مئی ۱۹۵۲ء

۲۔ مکمل شرح دیوان غالبؔ پر ایک نظر — نگار لکھنؤ جولائی ۱۹۵۴ء

۳۔ غالبؔ اور اقبالؔ — نگار لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۵ء

۴۔ غالبؔ اور اقبالؔ — نگار لکھنؤ مئی ۱۹۵۶ء

۵۔ غالبؔ کے اسلوب سخن کا طنز پہلو — نگار لکھنؤ مارچ ۱۹۵۷ء

۶۔ غالبؔ کے اسلوب سخن کا طنز پہلو — نگار لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۷ء

۷۔ غالبؔ کا نفسیاتی مطالعہ — نگار لکھنؤ نومبر ۱۹۶۱ء

۸۔ اقبالؔ اور غالب کا تقابلی مطالعہ — نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۶۲ء

۹۔ غالبؔ شکن: یگانہ (نجیب جمال) — نگار کراچی اپریل ۱۹۶۴ء

۱۰۔ جدید اردو غزل: غالبؔ سے حالیؔ تک — نگار کراچی جولائی اگست ۱۹۶۵ء

۱۱۔ غالبؔ اور دوسرے مضامین (نظیر حسنین زیدی) — نگار کراچی جولائی اگست ۱۹۶۵ء

۱۲۔ جہان غالبؔ (کوثر چاندپوری) — نگار کراچی نومبر ۱۹۶۶ء

۱۳۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی — نگار کراچی نومبر ۱۹۶۶ء

۱۴۔ غالبؔ نقش ہائے رنگ رنگ — نگار کراچی مارچ ۱۹۶۷ء

۱۵۔ احوال و نقد غالب (حیات سال) — نگار کراچی ستمبر ۱۹۶۷ء

۱۶۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب (شاداں بلگرامی) — نگار کراچی ۱۹۶۸ء

۱۷۔ غالبؔ سے متعلق ایک خط اور اس کا جواب — نگار کراچی مارچ ۱۹۶۸ء

۱۸۔ غالبؔ کے کلام میں استفہام	نگار کراچی فروری ۱۹۸۷ء
۱۹۔ غالبؔ کے کلام میں استفہام	نگار کراچی اکتوبر ۱۹۸۸ء
۲۰۔ غالبؔ کے اسلوبِ سخن کا طنز پہلو	نگار کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۲۱۔ دیوان غالب سے فال (اداریہ)	نگار کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۲۲۔ غالبؔ اور گنجینۂ معنی کا طلسم	نگار کراچی اکتوبر ۱۹۶۹ء
۲۳۔ فلسفہ کلام غالبؔ (شوکت سبزواری)	نگار کراچی جون ۱۹۶۹ء
۲۴۔ غالبؔ ڈائری۔ یو بی ایل	نگار کراچی جون ۱۹۶۹ء
۲۵۔ غالبؔ اور مطالعہ غالبؔ (عبارت بریلوی)	نگار کراچی اگست ۱۹۶۹ء
۲۶۔ نذر غالبؔ (عطاء الرحمٰن کاکوری)	نگار کراچی اگست ۱۹۶۹ء
۲۷۔ ہنگامہ دل آشوب: بسلسلہ غالبیات (قدرت نقوی)	نگار کراچی ستمبر ۱۹۶۹ء
۲۸۔ محاسن کلام غالبؔ (بجنوری: فخری ایڈیشن)	نگار کراچی ستمبر ۱۹۶۹ء
۲۹۔ صحیفہ غالبؔ ا۔۳	نگار کراچی اکتوبر ۱۹۶۹ء
۳۰۔ اشاریہ غالبؔ (سید معین الرحمٰن)	نگار کراچی مئی، جون ۱۹۷۰ء
۳۱۔ دیوان غالب نسخہ حمیدیہ (حمید احمد خان)	نگار کراچی مئی، جون ۱۹۷۰ء
۳۲۔ غالبؔ کون؟ (سید قدرت نقوی)	نگار کراچی ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء
۳۳۔ نقوش غالب نمبر ۲ (محمد طفیل)	نگار کراچی ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء
۳۴۔ ادب لطیف غالب نمبر (ناصر زیدی)	نگار کراچی جولائی، اگست ۱۹۷۱ء
۳۵۔ غالبؔ اور انقلاب ستاون (ڈاکٹر معین الرحمٰن)	نگار کراچی جنوری، فروری ۱۹۷۵ء
۳۶۔ اقبالؔ اور غالبؔ کا تقابلی مطالعہ	نگار کراچی نومبر، دسمبر ۱۹۷۷ء
۳۷۔ سوویت جائزہ	نگار کراچی فروری ۱۹۸۲ء
۳۸۔ غالب اور صادقین کی یاد میں	نگار کراچی فروری ۱۹۸۷ء
۳۹۔ غالبیاتی مطالعات نیاز (سالنامہ)	نگار کراچی نومبر ۱۹۸۷ء

۴۰۔ غالبؔ کے خطوط (ڈاکٹر خلیق انجم)	نگار کراچی فروری ۱۹۸۸ء
۴۱۔ غالبؔ کے معاصر (بہادر شاہ ظفر، ڈاکٹر اسلم پرویز)	نگار کراچی اپریل ۱۹۸۸ء
۴۲۔ غالبیات۔ ظ۔ انصاری و شمس الرحمٰن فاروقی	نگار کراچی اکتوبر ۱۹۸۸ء
۴۳۔ غالبؔ دوست (مختار الدین احمد کی نذر)	نگار کراچی فروری ۱۹۸۹ء
۴۴۔ غالبؔ کی فارسی شاعری (ملاحظات)	نگار کراچی جون ۱۹۹۱ء
۴۵۔ غالبؔ کی فارسی غزل (نیاز فتح پوری)	نگار کراچی جنوری ۱۹۹۳ء
۴۶۔ غالبؔ اور تصوف (محمد مصطفےٰ خاں صابری)	نگار کراچی جولائی ۱۹۹۳ء
۴۷۔ مشکلات غالبؔ اول (نیاز فتح پوری)	نگار کراچی اکتوبر ۱۹۹۳ء
۴۸۔ ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالبؔ	نگار کراچی نومبر ۱۹۹۳ء
۴۹۔ مشکلات غالب دوم (نیاز فتح پوری)	نگار کراچی جنوری ۱۹۹۴ء
۵۰۔ کیا دیوان غالبؔ نسخہ امروہہ واقعی جعلی ہے؟	نگار کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۵۱۔ ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالبؔ	نگار کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۵۲۔ کلام غالبؔ میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار	نگار کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۵۳۔ غالبؔ کی شاعری اور مسائل تصوف	نگار کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۵۴۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر	نگار کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۵۵۔ شارحین غالبؔ۔ حسرت اور نیاز	نگار کراچی مئی ۱۹۹۵ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین جو رسالہ نگار کے علاوہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں ملاحظہ ہو۔

مقالات	کتب و رسائل
غالبؔ کے کلام میں استفہام	تحقیق و تنقید، کراچی ۱۹۶۳ء
غالبؔ کے کلام میں استفہام	تنقید غالبؔ کے سو سال فیاض محمود لاہور ۱۹۶۹ء
غالبؔ کے کلام میں استفہام	غالبؔ شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء

غالبؔ کے کلام میں استفہام	ادیب، علی گڑھ جنوری، جون ۱۹۹۲ء
غالبؔ کے کلام میں استفہام	تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ، دہلی ۱۹۹۵ء
غالبؔ کے کلام میں استفہام	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، دہلی ۲۰۰۴ء
غالبؔ کے کلام میں استفہام	غالب شناسی اور نیاز و نگار، ڈاکٹر سلیم اختر لاہور، ۱۹۹۸ء
مکمل شرح دیوان غالب پر ایک نظر	غالب شاعر امروز فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
غالبؔ کے مقطعے	ساقی، کراچی اکتوبر ۱۹۹۵ء
غالبؔ کے مقطعے	غالبؔ، شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ اور اقبالؔ	غالبؔ، شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ کے اسلوب سخن کا طنزیہ پہلو	غالبؔ، شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ کے اسلوب سخن کا طنزیہ پہلو	تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ، ۱۹۹۵ء
غالب کا ایک گم نام قطعہ	افکار نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء
غالب کا نفسیاتی مطالعہ	کافر نہ بود، فروغ اردو لکھنؤ غالب نمبر ۱۹۶۸ء
غالب کا نفسیاتی مطالعہ	غالب شاعر امروز فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
رُباعی کا ایک اہم دور	اردو رباعی طبع اول کراچی ۱۹۶۲ء
غالبؔ و انیسؔ کا زمانہ	اردو رباعی طبع دوم لاہور، ۱۹۸۲ء
مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی	سیپ، کراچی، شمارہ ۸، ۱۹۶۲ء
مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی	بہ اضافہ ادبیات وشخصیات لاہور، ۱۹۹۳ء
غالب نقش ہائے رنگ رنگ	ہماری زبان، دہلی، مارچ، ۱۹۶۷ء
غالبؔ و سرسیدؔ	ہماری زبان، دہلی، ۱۵/نومبر ۱۹۶۸ء
غالبؔ کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز	ہماری زبان، علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۸ء
غالبؔ کی یادگار قائم کرنے ک یا ولین تجویز	قومی زبان، کراچی مارچ ۱۹۶۹ء
غالبؔ کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز	ہندوستانی ادب، حیدر آباد دکن جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء

غالبؔ کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز	غالب شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز	سورج، لاہور، ۱۹۹۶ء
غالبؔ نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں	ماہ نو، کراچی جنوری، فروری ۱۹۶۹ء
غالبؔ نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں	غالب شاعر امروز فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
غالبؔ کے اولین تعارف نگار	اردو، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء
غالبؔ کے اولین تعارف نگار	غالبؔ شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ کے اولین تعارف نگار	سورج، لاہور ۱۹۹۶ء
دیوان غالبؔ سے فال	قومی زبان، کراچی فروری ۱۹۸۱ء
غالبؔ کے حالات (بعد وفات) پہلا مضمون	العلم، کراچی جنوری، جون ۱۹۶۹ء
غالبؔ کے حالات (بعد وفات) پہلا مضمون	غالبؔ شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ اور گنجینۂ معنی کا طلسم	نقوش، لاہور، غالب نمبر ۱۹۶۹ء
غالبؔ اور گنجینۂ معنی کا طلسم	غالب شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ شاعر امروز فردا	شاعر، بمبئی غالب نمبر ۱۹۶۹ء
غالبؔ شاعر امروز فردا	ہمدرد صحت، کراچی جون، ۱۹۶۹ء
غالبؔ شاعر امروز فردا	غالب شاعر ماروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
غالبؔ شاعر امروز فردا	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء
اے کاش کبھی میں اور غالبؔ	غالبؔ ذاتی تاثرات کے آئینے میں، شکور احسن
اے کاش کبھی میں اور غالبؔ	راوی، لاہور، غالب نمبر، اپریل ۱۹۶۹ء
اے کاش کبھی میں اور غالبؔ	غالب شاعر امروز فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
اے کاش کبھی میں اور غالبؔ	محمل، مجلّہ اسلامیہ کالج برائے خواتین، لاہور ۱۹۷۰ء
اے کاش کبھی میں اور غالبؔ	جزو دیباچہ، کتب تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ ۱۹۹۵ء، دہلی ۲۰۰۴ء
غالب اور غالب تخلص کے دوسرے شعراء	صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء

غالب اور غالب تخلص کے دوسرے شعراء	غالب شاعر امروز فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
پیچ و آہنگ غالب (مرتبہ۔ وزیر الحسن عابدی)	اردو، کراچی جنوری، مارچ ۱۹۷۰ء
غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر	ماہ نو، کراچی فروری ۱۹۷۰ء
غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر	کتاب سے پہلے، غالب شاعر امروز فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر	ماہ نو، کراچی جنوری فروری ۱۹۹۸ء
پروفیسر حمید احمد اور غالب	افکار، کراچی شمارہ پچاس سال ۱۹۷۰ء
پروفیسر حمید احمد اور غالب	ادبیات و شخصیات لاہور، ۱۹۹۳ء
غالب نو دریافت بیاض کی روشنی میں	نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء
غالب نو دریافت بیاض کی روشنی میں	نیا اور پرانا ادب، کراچی ۱۹۷۴ء
کیا دیوان غالب نسخہ امروہہ واقعی جعلی ہے؟	غالب، کراچی سالنامہ ۷۶۔۱۹۷۷ء
کیا دیوان غالب نسخہ امروہہ واقعی جعلی ہے؟	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب ۱۹۹۵ء
تحقیق غالب مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	فلیپ، مطبوعہ، کراچی ۱۹۸۱ء
تحقیق غالب مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناسی تھیسس، افصح وحید، لاہور، ۱۹۹۶ء
غالبیاتی مطالعات نیاز	غالب فن و شخصیت نیاز فتح پوری مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کراچی ۱۹۸۷ء
ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب	سالنامہ صریر، کراچی، ۱۹۹۱ء
ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب	غالب نامہ، دہلی جولائی ۱۹۹۲ء
ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء
کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفۂ آثار	اوراق، خاص نمبر لاہور ۱۹۹۳ء
کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفۂ آثار	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء
غالب کی شاعری اور مسائل تصوف	سالنامہ صریر کراچی، جون جولائی ۱۹۹۳ء
غالب کی شاعری اور مسائل تصوف	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء

غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر	سہ ماہی کراچی جون ۱۹۹۳ء
غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء
نسخہ حمیدیہ سے چند اشعار	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء
مقدمہ بیان غالبؔ ۔ اطہر رضوی	ادب اور ادب کی افادیت کراچی ۱۹۹۶ء
دام آگہی مغرب میں غالب شناسی کی تازہ مثال	قومی زبان، کراچی فروری ۱۹۹۷ء
دیوان غالبؔ کی پانچ غزلیں تشریح و توضیح	فردا مجلّہ گورنمنٹ کالج مئی جون ۱۹۹۷ء
غالبؔ کی دو غزلوں کی شرح	تحقیق نامہ شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء
شرح دیوان غالب، کیوں اور کیسے؟	تحقیق نامہ شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء
گنجینۂ معنی کا طلسم اور غالب	تحقیق نامہ شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء
غالبؔ، دیوان غالبؔ، نسخہ خواجہ (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)	ماہِ نو، لاہور، ۲۲راپریل ۱۹۹۹ء
دام آگہی مغرب میں غالب شناسی	مشمولہ ادب اور ادب کی افادیت کی تازہ مثال، کراچی ۱۹۹۶ء

اقبال شناسی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے محبوب ترین شاعر علامہ اقبال ہیں اور ''اقبال سب کے لئے'' کے مطالعے سے اقبالؔ اور ڈاکٹر فرمان دونوں کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ اقبال صرف مسلمانوں کا شاعر ہے بے معنی سی بات ہے۔ اس کا لب و لہجہ مقامی و ملی نہیں ہمہ گیر و آفاقی ہے اور اس کا پیغام کسی خاص ملت کے لئے نہیں، سب کے لئے ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اقبال صرف ان معنوں میں سب کا شاعر نہیں ہے کہ اس نے بچے بوڑھے اور جوان سب کے لئے کچھ نہ کچھ لکھا ہے بلکہ وہ اس لئے بھی سب کا

۱۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء دیباچہ

شاعر ہے کہ اس کا پیغام اور فلسفہ حیات، ساری دنیا کے لئے ہے۔ایک انسان دوست مفکر شاعر اور سچے مسلمان کی حیثیت سے اقبال صرف ملت اسلامیہ کا شاعر ہو بھی نہیں سکتا۔اس سے انکار نہیں کہ اس نے اپنے پیغام کے لئے اسلام اور ملت اسلامیہ کو وسیلہ بنایا ہے لیکن اس کے پیغام کی بنیادی سعی مسلسل اور عمل پیہم پر ہے اور سعی و عمل اس کے یہاں نصب العین سے گہری وابستگی کا دوسرا نام ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اسرار خودی میں اس نے اپنے موقف کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں بتوں سے بیزاری کا مشورہ نہیں دیتا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ برہمنیت پر پورا اترا جائے۔آذریہ یا ابراہیمی، جادۂ تسلیم پر ثابت قدم رہا جائے اور جنون عاشقی میں خود کو کامل ثابت کیا جائے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:

"اقبال کو بیشتر کتابوں میں اب تک جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اقبال کے مطالعے کی راہیں ہموار کرنے کے بجائے مغالطے پیدا کرتا ہے۔ان کتابوں کے مطالعے سے کبھی اقبال پرانے قسم کا مذہبی ملا معلوم ہوتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا پیغام صرف پرانے خیال کے مسلمانوں کے لئے تھا اور برصغیر کے مسلمانوں تک محدود تھا۔کبھی یہ خیال گذرتا ہے کہ اقبال، فلسفہ خودی کے بہانے غارت گری و خونریزی کی دعوت دیتا ہے اور اس کا "شاہین" کمزوریوں اور ناتوانوں کا دشمن ہے۔"(۳)

۱۔اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء دیباچہ

۲۔اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء دیباچہ ص:۴

۳۔اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء دیباچہ ص:۶

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اقبال کی زندگی اور شاعری کے بارے میں بھی اس قسم کی گمراہیاں اور مغالطے عام ہیں چنانچہ اب تک جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ایک آدھ کو چھوڑ کر، ان سب میں ان کی پیدائش، تعلیمی اسناد کے حصول اور تصانیف کی اشاعتوں کی تاریخیں غلط درج ہیں اور ابتدائی زندگی سے لے کر وفات تک کتنے ہی واقعات بغیر کسی سند یا تحقیق کے غیر ذمہ دارانہ طور پر بیان کئے گئے ہیں۔''(۱)

دیباچہ اور کتابیات کو چھوڑ کر اس کتاب میں تیرہ (۱۳) ابواب ہیں، پہلا باب اقبال کی سیرت و سوانح کا ہے، دوسرا باب اقبال کی تصنیفی و تالیفی کارناموں کے جائزے کا ہے، تیسرے باب میں اقبال کے پیغام یا فلسفہ حیات یعنی خودی و بیخودی پر روشنی ڈالی گئی ہے، چوتھے باب میں اقبال کے تعلیمی نظریات کا بیان ہے، پانچویں باب میں اقبال کے سیاسی افکار اور عملی سیاست کا ذکر ہے، چھٹے باب میں ممالک اسلامیہ کی بیداری و ترقی کے متعلق اقبال کے خوابوں کا تذکرہ ہے اور اقبال کی پیش گویوں کا ذکر ہے، ساتویں باب میں اقبال کے فن اور نظریہ فن کو دکھایا گیا ہے، آٹھویں باب میں تصور عقل و عشق کا جائزہ لیا گیا ہے، نویں باب میں اقبال کے فکر و فن پر مشرق و مغرب کے اثرات کا ذکر ہے، دسویں باب میں اردو شاعری کو موضوع بنایا ہے، گیارہویں باب میں اقبال کی فارسی شاعری کا تجزیہ، بارہویں باب میں اقبال کا نئی نسل کے نام پیغام کیا تھا اس کو دکھایا گیا ہے، آخری باب میں مشرق و مغرب پر اقبال کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالبؔ و اقبالؔ کے پرستاروں میں سے ہیں ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ اقبال کافی گہرا اور وسیع ہے۔ اقبال ان کے پسندیدہ شاعر ہیں یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر صاحب اقبال پر قلم نہ اٹھائیں اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود ڈاکٹر فرمان صاحب نے اقبال پر ایک کتاب ''اقبال سب کے لئے'' لکھ ڈالی یہ کتاب اقبالیات پر اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے جس میں اقبال کی سوانح خاکہ تصانیف و مقالات، تعلیمی و سیاسی خدمات کے پس منظر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

۱۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء دیباچہ ص:۶

اقبالؔ کی فارسی شاعری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری علامہ اقبال کی فارسی شاعری کی بابت لکھتے ہیں:

''برصغیر کے ہزار سالہ عہد اسلامی نے فارسی کے جن بڑے شاعروں کو جنم دیا ہے ان میں امیر خسرو، فیضی، بیدل، اقبال، غالب کے نام آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے کمالات شاعرانہ کا اعتراف ان کے بڑے سے بڑے مخالف اور کٹر سے کٹر ناقد نے بھی کیا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

اگر امیر خسرو، فیضی، بیدل اور غالب جیسے باکمال فارسی شعراء پیدا ہو گئے تو چنداں تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ ایسا ہونا ماحول کے تقاضو کے عین مطابق تھا۔لیکن بیسویں صدی میں جبکہ فارسی ذوق برصغیر سے تقریباً ختم ہو گیا تھا اقبال کا ایک عظیم فارسی شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آنا واقعی حیرت انگیز ہے۔''

(اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء ص:۳۹۶)

اقبال نے اردو کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ فارسی گوئی کی طرف کب اور کیوں توجہ کی اس کے جواب میں اقبال کے سوانح نگاروں اور خود اقبال نے مختلف باتیں کہی ہیں۔اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ اقبال ایک دفعہ یوروپ میں ایک دوست کے یہاں مدعو تھے اچانک ان سے سوال کیا گیا کہ آیا وہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں؟ انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ صرف ایک آدھ شعر انہوں نے فارسی میں کہے ہیں لیکن یہ سوال کچھ ایسے وقت کیا گیا کہ فارسی میں شعر گوئی کا محرک بن گیا۔ دعوت سے واپس آ کر رات کو انہوں نے دو فارسی غزلیں کہیں اور صبح اٹھتے ہی سنا دی۔لیکن یہ جواب شافی نہیں ہے۔اقبالؔ کی بعض تحریروں اور شعروں سے

(اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء ص:۳۹۵)

پتہ چلتا ہے کہ ان کے اس شعور و ادراک نے اردو کی بہ نسبت فارسی میں صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے اور اس کے ذریعے ان کا پیغام برصغیر سے باہر، اسلامی ممالک اور یوروپ تک پہونچ سکتا ہے، انہیں فارسی گوئی کی طرف مائل کیا۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ اردو کے مقابلے میں فارسی کلام کی مقدار بھی زیادہ ہے اور اس کی اثر پذیری بھی اردو کی بہ نسبت شدید تر ہے اس اثر پذیری میں جو چیزیں زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہیں ان میں جوش بیان، موسیقیت اور روانی کی صفات خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اقبال نے فارسی میں اگرچہ اردو کے بعد کہنا شروع کیا لیکن بعد میں انہیں فارسی گوئی سے ایسا انہماک رہا کہ ایک دو نہیں متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آگئے اور ان کے کلام کی مقدار اردو سے تجاوز کر گئی۔'' (۲)

اقبال کی فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' جب شائع ہوئی تو اس میں اقبال نے حکیم افلاطون کے ساتھ حافظ شیرازی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کی تصوف پسند حلقوں میں سخت مخالفت ہونے لگی۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کو ہر قسم کے مسلک تصوف کا مخالف و دشمن خیال کیا گیا۔ پیرزادہ مظفر احمد فضل نے ''اسرار خودی کے جواب میں'' راز خودی لکھی اور افلاطون و حافظ کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ علامہ کی ذات وصفات پر بارہا حملے کئے۔ حکیم فیروز الدین طرائی نے بھی اقبال کی مثنوی کی رو میں ایک رسالہ ''لسان الغیب'' کے نام سے شائع کیا۔ حتیٰ کہ اکبر الہ آبادی جیسے بزرگ نے بھی جن سے اقبال کے ذاتی تعلقات تھے اسرار خودی کو اعتراض کی نگاہ سے

۱۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۳۹۹

۲۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۴۰۲

دیکھا اور طرح طرح کے سوال اٹھائے ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' کے دوسرے ایڈیشن میں حافظ شیرازی سے متعلق اشعار حذف کردیئے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان نے علامہ اقبآل کے ہر مجموعے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ان کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ سب سے زیادہ اہمیت اقبآل کی مثنوی ''جاوید نامہ'' پر دی گئی ہے۔ عالمی ادب میں اس مثنوی کی اہمیت کا بھی مفصل ذکر ہے۔

اقبآل کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبآل نے اردو فارسی دونوں زبانوں کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور دونوں مریضانہ خیالات اور منفیانہ تصور عشق کے مقابلے میں زندگی اور عشق کا ایک ایسا ولولہ انگیز تصویر پیش کیا ہے کہ بقول شخصے اس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے پھوٹ پڑے، ایسے چشمے جس سے سیراب ہوکر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑگئی اور امید کی کھیتی لہلہا اٹھی، سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی، دل مردہ دوبارہ زندہ ہوگیا اور امت کو مرض کہن سے نجات مل گئی۔ مرض کہن سے نجات ملنی تھی کہ وہ قوم جو برطانوی سامراج اور ہندو قوم کی متحدہ قوتوں اور سازشوں کے سامنے سپر ڈال چکی تھی، تازہ شیرازہ بندی کے ساتھ دونوں کی مد مقابل بن گئی اور اقبال کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اقبال اردو فارسی کے دوسرے شعراء کی طرح طالب کو مطلوب میں گم کردینے یا فنافی الشیخ کا قائل نہیں ہے وہ اپنے مطلوب و مقصود کا دیدار و وصال ضرور چاہتا ہے لیکن ایک خاص فاصلے سے جہاں اس کے وجود یا احساس وجود کو

۱۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء دیباچہ ص: ۴۱۰، ۴۱۱

۲۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۴۶

کوئی خطرہ نہ ہو۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اقبال کی شاعری کے علاوہ ان کی نثر نگاری کو بھی بہت اہم قرار دیا ہے۔ وہ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات پر لکھے ہوئے امریکی اسپر نلنگ کا حوالہ دیتے ہیں جس نے لکھا تھا کہ ''مغربی دنیا نے بہ استثنائے چند ابھی تک سر محمد اقبالؔ کے علمی پایہ کو نہیں پہچانا اور اسی لئے اس کی وہ قدر و منزلت نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ ان کی وفات کے بعد اقبالؔ پر تمام زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے، یہی ان کی مقبولیت کی علامت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ''اقبال سب کے لئے'' پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور آفاقیت کے پوری طرح قائل ہیں، وہ اقبال کے فلسفہ حیات کے بھی بے انتہا پرستار ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب اقبال کے سیاسی افکار سے بیحد متاثر ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ان کی سیاسی زندگی کا سب سے اہم واقعہ اور ان کے سیاسی کارناموں میں سب سے اہم کارنامہ وہ ہے جسے تصور پاکستان کا نام دیا جاتا ہے اس سے انکار نہیں کہ انفرادی سطح پر اقبال سے پہلے بھی بعض مسلم رہنما و ادیب مثلاً سر سید احمد خاں اور مولانا عبدالحلیم شررؔ وغیرہ اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ ہندو اور مسلم برصغیر میں بہت دنوں تک ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور انہیں اپنے لئے الگ مملکت کا حصول ضرور ہو جائے گا۔ لیکن اجتماعی اور مقتدر سیاسی سطح پر مسلمانوں کی طرف سے برصغیر میں ایک نئی مسلم ریاست کی تجویز علامہ نے پیش کی۔''(۲)

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے محرک اول علامہ اقبالؔ تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نوجوانی کے زمانے میں مسلم لیگ کے دوقومی نظریئے اور مطالبہ پاکستان کے حامی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص ۲۴۶

۲۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۵۵،۱۵۴

سیاسی نظریہ ان کا آج بھی وہی ہے حالانکہ دنیا بہت بدل چکی ہے۔

اقبال و نیاز نمبر

نگار نے اول اول نیاز فتح پوری کی زیر ادارت جنوری، فروری ۱۹۶۲ء میں سالنامہ ''اقبال نمبر'' شائع کیا۔ اسی سال جولائی ۱۹۶۲ء میں نگار لکھنؤ سے کراچی منتقل ہوگیا اور یہاں سے اس کے دو ایڈیشن وقفے وقفے سے شائع ہوئے اور بہت جلد نایاب ہوگئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اقبال و نیاز نمبر سالنامہ ۱۹۹۰ء کے ''ملاحظات'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ نمبر دو سبب سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ ایک تو اس لئے کہ اس میں اقبال کی زندگی اور فن کے متعلق بعض بالکل نئے اور چونکا دینے والے معلومات افزاء مضامین شامل تھے۔ دوسرے اس لئے کہ اس کے کئی مقالے خود علامہ نیاز فتح پوری کے زور قلم کا نتیجہ تھے اور ان کے ذریعے اقبال کے فکر و فن کے بعض نئے گوشے منور ہوتے تھے۔''(۱)

اس نمبر میں اقبال اور اقبال کے متعلق شائع ہونے والی تمام تحریروں کا اشاریہ سید اظہر الحق حقی نے ''نگار اور اقبال'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ اس نمبر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''اقبال و غالب کا تقابلی مطالعہ'' بھی شامل ہے اس نمبر میں جگن ناتھ آزاد کا مضمون ''اقبال کی شاعری'' بھی شامل ہے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

> ''ہم نے فلسفی اقبال، سیاست داں اقبال کو تو پالیا لیکن شاعر اقبال کا سراغ ہم نہ لگا سکے۔''(۲)

آزاد نے مزید لکھا:

> ''اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر تھے نہ کہ فلسفی، ہاں وہ ایسے شاعر ضرور تھے جو فلسفیانہ انداز نظر اور مفکر دل و دماغ لے کر آئے تھے اور چونکہ اردو

۱۔ نگار پاکستان جنوری ۱۹۹۰ء ملاحظات ص:۳

۲۔ نگار پاکستان اقبال و نیاز نمبر سالنامہ ۱۹۹۰ء ص:۲

شاعری میں اس انداز فکر کا شاعر پہلی بار ہمارے سامنے آیا اس لئے ہم نے اسے فلسفی اور نہ جانے کیا کچھ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا، لیکن اس کی نوا سنجی کو نظر انداز کر دیا۔"(۱)

نگار پاکستان نومبر ۱۹۸۶ء کے قدیم اقبال نمبر میں شامل علامہ نیاز فتح پوری کے مضامین کو دوبارہ شائع کیا تھا۔ اس نمبر کی تفصیلات پر ایک نظر ڈالیے۔

ملاحظات، علامہ نیاز فتح پوری۔ حیات اقبال کی اہم تاریخیں، سید ابسار علی، اقبال کی زندگی کا خاکہ، اقبال کا ذہنی ارتقاء، اقبال کے سیاسی رجحانات، اقبال کا فلسفہ خودی، اقبال کا رنگ تغزل، یہ مضامین علامہ نیاز فتح پوری کے ہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے:

"بات یہ ہے کہ جو رچی ہوئی معنویت کلام اقبال میں پائی جاتی ہے وہ بیدلؔ کی نا قابل فہم معنویت سے بالکل علیحدہ ہے اور جو والہانہ انداز سخن طرازی اقبالؔ کے یہاں پایا جاتا ہے وہ غالبؔ کے شوخ و دشوار پسند اسلوب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔"(۲)

نیاز صاحب نے مزید لکھا ہے:

"مجھے اس کے بعض ایسے شاہکار چننے کا خیال ضرور پیدا ہوا جو اس کے تمام اردو منظومات میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتے ہوں اور اس جستجو میں آخر کار میری نگاہ مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق پر پڑی جو یقیناً اقبال کو زندہ جاوید بنا دینے کے لئے کافی ہیں کیونکہ اقبالؔ نے جو کچھ لکھا وہ انہیں نظموں کی شان نزول تھی اور جو نظمیں بعد میں لکھیں وہ انہیں کی تفسیر ہیں۔"(۳)

اس نمبر میں دوسرے نامور ادبی شخصیتوں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کا مضمون

۱۔ نگار پاکستان اقبال و نیاز نمبر سالنامہ ۱۹۹۰ء ص: ۹

۲۔ نگار پاکستان نومبر ۱۹۸۶ء قدیم اقبال نمبر، ص: ۷

۳۔ نگار پاکستان نومبر ۱۹۸۶ء قدیم اقبال نمبر، ص: ۸

''اقبال وغالب کے تقابلی مطالعہ'' بہت اہم ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک اور مضمون ''اردو شعر وادب پر اقبال کے اثرات'' میں لکھا ہے:

''انہوں نے اردو شاعری کو انسان کی حقیقی زندگی اور اس کے مسائل سے ہم کنار کر کے تامل و تفکر کے عناصر سے ہم آہنگ کیا۔ سچے جذبوں اور روحانی قدروں اور حیات افروز خیالات کو جگہ دے کر اس کے لہجے کو پروقار اور محترم بنایا۔ مغرب سے وہی چیزیں لیں جن کی ضرورت تھی اور جو انسانی مسائل کے حل میں معاون ہو سکتی تھی۔ زندگی کے بارے میں منفی رجحانات کو ترک کر کے مثبت رجحانات کو جگہ دی اور ادب کو زندگی سے اس طرح ہم رشتہ کر دیا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہ رہا ہیئت میں بھی وہ لکیر کے فکیر نہ رہے بلکہ مغرب کے زیر اثر نظموں نے ڈھانچوں میں نئی نئی تبدیلیاں کیں۔''(۱)

اقبال پر مشرق ومغرب کے اثرات

مشرق ومغرب کے زیر اثر اقبال نے دنیا کے بے شمار صاحب نظر افراد سے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کیا ہے۔علمائے شعر وحکمت کے وہی خیالات ان کی توجہ کا مرکز بنے ہیں جو قرآن وسُنت کی تعلیمات سے کسی نہ کسی رخ سے مماثل ومشابہ تھے ڈاکٹر فرمان صاحب مانتے ہیں کہ اقبال کے فکر وفن کے اساسی مآخذ صرف دو قرار پاتے ہیں۔ایک قرآن اور دوسرا حضورؐ کا اسوۂ حسنہ۔ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن اور آنحضرتؐ کی تعلیمات سے والہانہ لگاؤ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے قرآن وسیرت نبویؐ کے سوا، کسی اور مذہب یا علمائے مذہب کا مطالعہ نہیں کیا یا فکر وفن کے سلسلے میں دوسرے شعراء حکماء سے فائدہ نہیں اٹھایا۔''(۲)

۱۔نگار پاکستان دسمبر ۱۹۹۰ء ص:۱۵

۲۔اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۲ء ص:۲۶۷

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ اقبالؔ نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، گرونانک اور گوتم بدھ کی بھی تعریف کی ہے۔ شری کرشن کو اسرار خودی کے دیباچے میں ایشیا کا پہلا انسان دوست صاحب عقل قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں رامانج کی تعلیمات کو بھی سراہا ہے۔ بھرتری ہری خیالات کا بھی گہرا اثر قبول کیا ہے اور بال جبرئیل کا انتساب اسی کے شعر کے منظوم ترجمے سے کیا ہے۔ شنکراچاریہ کو محی الدین ابن عربی کی صف میں رکھا ہے اور دونوں کے نظریہ وحدت الوجود سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلم قومیت کا بانی اور ملت اسلامیہ کا بہت بڑا مسلہ شیخ احمد سرہندی کو قرار دیا ہے، مولانا رومؔی اقبال کے مرشد ہیں اور جگہ جگہ رومی کے فیض کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''اگر دونوں میں کوئی فرق ہے تو یہ کہ رومی کے یہاں عشق ہی سب کچھ ہے اور اقبال عشق کے توسط سے ''خودی کی تکمیل پر زور دیتے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''مغرب کے مفکروں اور شاعروں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا ذکر اقبال نے کلام میں نہ کیا ہو یا جس کے افکار و خیالات سے انہوں نے حسب ضرورت استفادہ نہ کیا ہو لیکن یہ استفادہ اقبال کے یہاں تقلیدی نہیں رہا، تنقیدی بن گیا۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''اقبال کا فن اور نظریہ فن'' کا باب بہت غور و فکر کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے تصور فن میں عہد بہ عہد اس تبدیلی اور ارتقاء کے اسباب تھے۔ ان اسباب کا تعلق ان ہی خارجی حالات سے تھا جنہیں ماحول یا فضا کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں کسی شاعر کے فکر و تخیل ہوتی ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق اقبال کے فکر و فن کا دوسرا دور ۱۹۰۸ء کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس

۱۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰ء ص:۲۸۱
۲۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰ء ص:۲۸۱
۳۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰ء ص:۲۰۱

دور میں تشکیل تلاش بے یقینی ہے۔ڈاکٹر فرمان صاحب اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حسن کے بارے میں اقبال کے تصورات میں کس نوع کی تبدیلیاں ہورہی تھیں اور وہ اپنے پرانے تصورِ حسن کو سوال و جواب کے ذریعے کس طرح تضحیک وطنز کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس خوبصورت نظم سے کیا جاسکتا ہے۔ جس کا عنوان ''حقیقت حسن'' ہے اور جو اقبال کے آرٹ کا نہایت ہی دلکش نمونہ ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ فن اور رموزِ فن پر اتنی وضاحت اور منطقی انداز سے اظہار خیال کرنے کی روایت، اقبال سے پہلے اردو شاعری اور ادب کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اردو میں فن کے بارے میں کوئی واضح تصور رکھنے اور اس کی روشنی میں شعر کہنے کا بے قاعدہ اور غیر منظّم سلسلہ غالبؔ سے اور منظّم و با قاعدہ سلسلہ، اقبال سے شروع ہوتا ہے۔ درمیان میں حالیؔ کی اصلاحی کوششیں بھی قابل ذکر ہیں کہ اقبال نے ان سے بہت کچھ رہنمائی حاصل کی ہے۔ غالبؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام اور خطوط میں نظریہ فن کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا مضمون ''لہو کے چراغ ایک مطالعہ'' جو نگار دسمبر ۱۹۶۲ء اور یہی مضمون فرمان کی کتاب ''نیا اور پرانا ادب'' میں بھی شامل اشاعت ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ اقبالؔ کی شاعری میں حالیؔ کے اثرات نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبالؔ جدید شاعری کے نہایت اہم ستون ثابت ہوئے اور انہوں نے

۱۔اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۰۵

۲۔اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۰۸

شاعری کو مقصد و پیغام سے ہم آہنگ کر کے حالؔی کے مشن کی بڑی حد تک تکمیل کر دی۔ ان کی بدولت جدید اردو شاعری نے بہ اعتبار فکر و فن بلند مقام حاصل کر لیا کہ قدیم و جدید کی بحث عملاً ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"غالبؔ اور حالؔی نے شاعری اور فن شاعری کے بارے میں غور و فکر کی جو طرح ڈالی تھی اس میں اقبال نے ایک شاندار عمارت تعمیر کر دی۔ انہوں نے اپنے فن اور نظریۂ فن کے بارے میں جگہ جگہ اظہار خیال کیا۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

"شاعری اقبال کی نگاہ میں فنون لطیفہ کی شاعری شاخوں میں لطیف ترین اور حیات افروز ہے بشرطیکہ اس کی تخلیق میں گرمی دل، لذت جستجو، سوز و گداز اور سچے جذبات کی سرمستی سے کام لیا گیا ہو۔ شاعری کی طرح شاعر کا مقام بھی، اقبال کی نظر میں انتہائی بلند ہے اور شاعر کے دو شعروں پر حور و بہشت تک سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اقبالؔ کے نزدیک فنی تخلیق کا محرک اول اور عنصرِ غالب، شاعر کی داخلی کیفیت یا اس کا باطنی شعور ہے اگر داخلی کیفیت یا باطنی شعور بے جان ہو تو پھر خارجی زندگی کا کوئی پہلو خواہ وہ بہ ذات خود کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، فنی تخلیق کا روپ نہیں دھار سکتا۔"(۴)

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی کتاب "اقبال سب کے لئے" لکھنے سے پہلے اقبالؔ پر قلم اٹھا چکے تھے۔ ڈاکٹر

۱۔ نیا اور پرانا ادب از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۱۶۱

۲۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۲۱۰

۳۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۲۱۳

۴۔ اقبال سب کے لئے از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص:۲۳۴

صاحب تصنیفی دور کے ابتدائی دنوں میں ہی علامہ اقبال پر ایک مقالہ لکھا تھا جو نگار دسمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ دوبارہ ''نگار'' جنوری، فروری ۱۹۶۲ء میں بعنوان ''غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ آگے چل کر یہی مقالہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''غالبؔ، شاعر امروز فردا'' میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے اقبالؔ پر مقالے لکھے ہوئے مختلف رسالوں اور کتابوں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ ''اردو کی نعتیہ شاعری اور اقبال'' نگار کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء، مقالہ ''تحقیقات، کچھ شادانی کے بارے میں'' کتاب ''تحقیق وتنقید'' کراچی ۱۹۶۳ء میں ''تحقیقات شادانی پر ایک نظر'' اردو رباعی فنی وتاریخی ارتقاء میں بھی یہ مقالہ شامل ہے ''علامہ اقبال کی بعض نظمیں اور جوہر'' نگار کراچی مارچ ۱۹۷۹ء میں، خودی اور اسلامی تصوف، نگار کراچی اپریل ۱۹۹۶ء شاعری یا فن اقبال کے نقطہ نظر سے ''مشمولہ اقبال کا ادبی نصب العین'' مرتبہ سلیم اختر، لاہور ۱۹۷۷ء ''عقل ودل ونگاہ کا مرشد اولین ہے عشق'' مطبوعہ اقبالیات لاہور جنوری ۱۹۸۲ء مشمولہ اقبال ۱۹۸۲ء مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت لاہور ۱۹۹۰ء ''اردو شعر وادب پر اقبال کے اثرات'' مشمولہ ''اقبال شناسی اور نیاز ونگار مرتبہ طاہر تونسوی، لاہور ۱۹۹۸ء میں شامل اشاعت ہیں۔ ان مقالات سے ڈاکٹر فرمان صاحب کے اقبال شناسی کی ثبوت ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبالیات پر صرف ایک کتاب لکھی ہے مگر یہی ایک کتاب اقبال کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

زبان اور اردو زبان

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''زبان اور اردو زبان'' پہلی بار ۱۹۷۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۸۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں ''زبان اور اردو زبان'' کے تمام منطقی دلائل اور مثالوں کے ذریعے اردو زبان کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات مشاہدات اور تدریسی تجربے شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تصانیف علمی اور تحقیقی ہوتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پوری طرح حق ادا کردیتے ہیں یہی ان کی تحریروں کی نمایاں وصف ہے۔ اردو کے لسانی تحقیق کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب میں جو مقالات شامل ہین وہ اس موضوع پر مکمل احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب بارہ ابواب

پر مشتمل ہے جس میں زبان اور اردو زبان، اردو کا لسانی خاندان اور دوسری زبانوں سے اس کا رشتہ، اردو کی جائے پیدائش کا قضیہ، زبان، رسم الخط اور اردو رسم الخط، اردو رسم الخط کی اصلاح کی بعض تجویزیں اور ان کا جائزہ، اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے، اردو اور پاکستان، اردو اور علاقائی زبانیں، اردو الفاظ کی معنی تقسیم و تفہیم، اردو شناسی کے بعض نقطے کا مباحث جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے:

''کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان تاریخ کو دراصل کسی قوم کی سماجی ترقی و تنزل کی تاریخ خیال کرنا چاہئے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو زبان کے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو غلاموں اور لونڈیوں کی طرح عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، ہندی و ترکی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی نہیں رہی بلکہ اردو نے ان زبانوں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے جو نگر کی زبانیں آپس میں کرتی ہیں۔''(۲)

اردو کسی زبان کا محتاج نہیں، اردو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے اس لئے جس لفظ کی جیسے جس جگہ ضرورت پڑی ویسے ہی استعمال کیا، کہیں حرف کو اسی صورت میں رہنے دیا تو کہیں اس میں تبدیلی رونما کر اسے اپنی پسند کا بنالیا۔ ڈاکٹر صاحب اردو الفاظ کے تلفظ اور حروف تہجی کی آوازوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''حرورف تہجی کی آوازوں، الفاظ کے تلفظ ان کے معنی اور املا، ہر شعبے میں ہوا ہے۔ ع، ق اور ص یقیناً عربی سے اردو میں آئے ہیں لیکن ان کی آوازیں ہم اس طور پر ادا نہیں کر سکتے جس طرح اہل عرب بولتے ہیں۔ سنسکرت کے ''ڑ'' اور فارسی کے ''ژ'' کا بھی یہی حال ہے۔ اس لئے اردو میں ان کی اصل آواز نکالنے پر زور دینا مناسب نہیں ہے۔ حروف کی طرح الفاظ کے تلفظ میں بھی بے شمار تغیرات واقع ہوئے ہیں۔''(۳)

۱۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء ص: ۴

۲۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء ص: ۵

۳۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء ص: ۵

ڈاکٹر صاحب کے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان میں عربی، فارسی اور سنسکرت الفاظ کی آمیزش ہے اس لئے اردو میں ان آوازوں اور تلفظات کے نکالنے پر زور نہیں دینا چاہئے۔

اردو زبان میں جو الفاظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں یا جو روزمرہ استعمال میں ہیں ہمیں ان الفاظ کو اردو ہی سمجھنا چاہئے۔ جو اردو میں بولے، لکھے یا پڑھے جاتے ہیں، وہ سب کے سب اردو ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اردو ایک مخلوط زبان ہے اور وہ برصغیر میں مسلمانوں کے داخلہ کے بعد وعربی و فارسی اور بعض مقامی بولیوں کے باہم میل جول اور ہندو مسلمان دونوں کی سماجی و معاشرتی ضرورتوں کے ماتحت وجود میں آئی ہے۔''(۱)

اردو ہندو مسلمان کے آپسی میل جول کی ضرورت سے وجود میں آئی یہ خالص ہندوستانی زبان ہے یہ یہی پلی، بڑھی اور ترقی کی منزلیں طے کی اردو کے نام اور اس کے وجہ تسمیہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے:

''اردو دراصل ترکی زبان کا لفظ ہے'' حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق اس کے معنی شاہی کیمپ یا لشکر کے ہیں۔ اردو کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے عطا حسین تحسین نے نوطرز مرصع میں استعمال کیا اس کے بعد میر امن نے باغ و بہار اور انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں زبان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ میر جعفر جیٹلی نے ہندی اہل دکن نے دکنی اہل گجرات نے گوجری دہلی پہونچتے پہونچتے ریختی ہو گیا شیخ باجن نے اردو کو زبان دہلی اور ملا وجہی نے سب رس میں زبان ہندوستانی کے نام دیئے ہیں۔ میر تقی میر سے غالب تک یہ لفظ اردو کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اب تک یہی چلا آرہا ہے۔''(۲)

ا۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء ص: ۱۶
۲۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء ص: ۱۶

ڈاکٹر فرمان صاحب نے ''اردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کا قضیہ'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اردو کی ابتدا کب ہوئی کہاں ہوئی اور کس طرح ہوئی اردو ہی کیا کسی بھی زبان کے سلسلے میں اس قسم کے سوالات کا شافی جواب دینا مشکل ہے۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ زبانیں فطری اور غیر محسوس طور پر معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کے تحت وجود میں آتی ہے نہ کوئی خاص شخص اس کا بنانے والا ہے اور نہ ان کے لئے وقت و مقام متعین ہوتے ہیں جس وقت جہاں جیسی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق خود بخود معاشرہ اپنے لئے ایک زبان پیدا کر لیتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب زبان کی شکل وصورت اور اس کی تبدیلیاں عہد بہ عہد اس کے ارتقائی منازل کو سماجی اور معاشرتی زندگی سے قریب خیال کیا ہے۔ الفاظ کے استعمال رائیں اور مثالوں کے ذریعہ گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اردو کی جائے پیدائش اور اہل پیدائش کے مورخوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جنہوں نے زبان کے سلسلے میں کام کیا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے زبان کے ارتقاء پر مورخانہ نظر ڈالی ہے اور سرسری مطالعے سے اردو کی جنم بھومی اور عہد پیدائش کا تعین کر دیا ہے اس میں میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں، انشاء اللہ خاں انشاءؔ نے دریائے لطافت میں، سرسید نے آثار الصنادید میں، امام بخش صہبائی نے انتخاب دواوین کے دیباچے میں، محمد حسین آزاد نے آب حیات میں، عبد الغفور نساخ نے رسالہ تحقیق زبان میں اور ڈاکٹر گلکرسٹ نے ہندوستانی فلالوجی میں اپنی رائیں لکھی ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو زبان کے مطالعہ کے جدید اصولوں سے واقف ہیں اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے دلیل و برہان اور غور و فکر کے ساتھ لکھا ہے، اس میں سب سے پہلے گریرسن نے ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ "Linguistic Survey of India" کے نام سے مرتب کیا تھا جس کی کئی جلدیں ہیں۔ اس کے بعد حافظ محمد شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا مقالہ ''ہندوستانی فونی ٹیکس'' انگریزی میں شائع ہوا اس کے بعد اردو میں ''ہندوستانی لسانیات کے نام سے شائع ہوا ڈاکٹر مسعود حسین خاں

۱۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری طبع دوم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء ص: ۳۲

نے ''مقدمہ تاریخ زبان اردو میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''اردو زبان کا ارتقاء علامہ سلیمان ندوی نے ''نقوش سلیمانی'' سینتی کمار چٹر جی نے ''انڈو آرا ین اور ہندی'' پروفیسر احتشام حسین نے ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے ''کیفیہ'' ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو کا روپ'' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ''ادبی تاریخ کا خاکہ'' میں ان مورخوں اور ادیبوں کے ماخذوں، رایوں اور دلائل پر عالمانہ بحث کرتے ہوئے جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب زبان، رسم الخط کا تعلق، جامعیت وخصوصیت، معترضین اردو، ہندی اور انگریزی رسم الخط، ہم صورت حروف اور املا کی دشواریاں، اردو اور رومن رسم الخط، خط نسخ اور نستعلیق کی خوبیاں اور کمزوریاں، ٹائپ وطباعت کے بعض مسائل کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں اختلاف رائے اور مفکرین تعلیم کے خیالات، ممتاز اساتذہ اور سائنس دانوں کی رایوں کو قلم بند کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ تمام سائنسدانوں، علمی وادبی کام کرنے والوں کی رائے ہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب اردو ذریعہ تعلیم کی جگہ جگہ موافقت کرتے نظر آتے ہیں، اپنے مقالے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''پاکستان کی تحریک اور اس کی جنگ آزادی میں اردو زبان نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ پاکستان بڑی حد تک اردو ہی کے تحفظ کے لئے خود اردو کے دم قدم سے وجود میں آیا۔ قائد اعظم کی مادری زبان اگر چہ اردو نہ تھی لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ پاکستان کے استحکام اور اس کی سالمیت کے لئے پاکستانی مدرسوں میں اردو کی تعلیم ضروری ہے۔ غالبًا انہوں نے اردو کی اسی سیاسی اہمیت کا لحاظ رکھ کر اعلان فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔''(۱)

اسی زبان کی تعصب نے پاکستان بننے پر مجبور کیا اور اس زبان کا تحفظ مسلمانوں کے سر مڑھ دیا گیا۔

۱۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء ص: ۹۹

زبان سماج کا آئینہ ہوتا ہے جو اس کے بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب قومی زبان اور علاقائی زبان و ادب کو اردو میں داخل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

> ''اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبول عام اور اس کے ادب کو پاکستانی ثقافت و قومیت کا متحمل بنانے کے لئے اس میں علاقائی زبان و ادب کی اہم روایت و اقدار کو کیوں نہ داخل کیا جائے۔ مختلف علاقوں کے تاریخی مقامات، تہذیبی مراکز، دریا، پہاڑ، پھول، باغ و راغ، ندی اور جھیل قصے، کہانیاں، رسم و رواج، پیر، فقیر اور صوفی و شاعر سب کو بطور تلمیح و مثال اردو نثر و نظم میں جگہ کیوں نہ دی جائے۔'' (۱)

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''زبان کیا ہے؟ اپنے ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے زبانوں کی ایک بین الاقوامی انجمن ہے۔ اس لئے کہ اس میں شرکت کے دروازے ہر زبان کے الفاظ پر ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اردو میں ایک فقرہ بھی ایسا نہ ملے گا جس میں دو تین زبانوں کے الفاظ شامل نہ ہوں، خصوصاً عربی، فارسی، سنسکرت اور پاک و ہند کی دوسری زبانوں مثلاً ہندی، پنجابی، بلوچی، پشتو، برج بھاشا، راجستھانی وغیرہ کے الفاظ تو اتنی کثرت سے شامل ہیں کہ ان زبانوں سے تعلق رکھنے والے ہر شخص اردو سے ایک طرح کی قربت محسوس کرتا ہے۔ اسی احساس قربت کے سبب ہر علاقے کے لوگوں نے اسے اپنی زبان سمجھا، اس کی ترقی میں حصہ لیا اور پاک و ہند کو لینگو افریقہ قرار دیا۔'' (۲)

۱۔ زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء ص: ۱۱۲

۲۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص: ۲۴

تدریس اردو

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''تدریس اردو'' پہلی بار ۱۹۶۲ء میں کراچی واسلام آباد سے شائع ہوئی جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جو بعد میں مختلف اضافوں کے ساتھ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں زبان اور تدریس زبان کے وہ سارے مباحث ومسائل پر تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے معلمانہ زندگی کے تجربات شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی کتاب ''تدریس اردو'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اردو اپنے علمی وادبی سرمایہ کی بناء پر ایشیائی زبانوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اپنے حلقہ اثر اور قبول عام کے لحاظ سے ممتاز ترین ہے تو بے جا نہ ہوگا۔'' (۱)

فرمان صاحب کا خیال ہے کہ ''سماجی زندگی ہی کے سہارے ہر زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے اور اس کے زیر اثر اس کی صورت ومعنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں:

یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے جس کے ہر باب میں تدریس اردو کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں فلیپ میں لکھتے ہیں:

> ''تدریس اردو، اردو زبان کی تدریس پر پہلی کتاب ہے جو ملکی وقومی تقاضوں اور تعلیم کے جدید اصولوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے کتاب کے شروع میں زبان اور معاشرے کے تعلق، اردو کی پیدائش اور ابتدائی ترقی ساخت و مزاج، اہمیت وافادیت، رسم الخط پر بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث ہر طرح سیر حاصل اور جامع ہے اس کے بعد اردو بولنا، لکھنا اور پڑھنا سکھانے کی نہایت آسان اور قابل عمل تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔'' (۲)

۱۔ تدریس اردو از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۴ء دیباچہ

۲۔ تدریس اردو از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۴ء فلیپ

اس کتاب میں تدریس اردو اور زبان کی اہمیت وافادیت پر جگہ جگہ بحث ملتی ہے۔ کسی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ہیں صرف انہیں کا لحاظ رکھ کر اس لفظ کو لکھا جائے اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق اردو ایک بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے اور اس میں صرف عربی، فارسی، مقامی بولیوں کے الفاظ نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان کے الفاظ کم وبیش شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تدریس اردو میں جگہ جگہ روزمرہ محاوروں اور لفظی صنائع کا استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری فرمان فتح پوری کی تدریسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، تدریس اردو کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''فرمان صاحب اردو کے شیدائیوں میں ہیں اردو کے انشاء پرداز بھی ہیں اور اردو کے استاد بھی، ان کے قلم نے اردو زبان وادب کی آبیاری کی ہے تدریسی مسائل پر بھی وہ ماہرانہ نظر رکھتے ہیں۔ میری نظر میں ان سے بہتر کوئی اور اردو کا استاد یا انشاء پرداز اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔''(۱)

اس کتاب میں ہندی، انگریزی اور فارسی کی ہیئت کا موازنہ اردو زبان سے کیا گیا ہے جس میں جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب اردو کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اردو زبان کی پیدائش اس کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اردو ہندو مسلمان دونوں کی باہمی سماجی ومعاشرتی ضرورت سے وجود میں آئی اور سماجی بیداری وترقی کے ساتھ ساتھ فطری اصول کے تحت آگے بڑھتی رہی ہے۔ بعض ہندوؤں کو یہ خیال ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں نے شعوری طوری پر اس کی تخلیق کی ہے درست نہیں ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ عربی وفارسی جیسی اہم اور وسیع زبانیں لے کر آئے تھے انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ کسی نئی زبان کو دانستہ وجود میں لاتے۔ یہ تو ان کی رواداری تھی کہ جو زبان ان کے محکوم ہندوؤں کی سیاسی ومعاشرتی ضرورتوں اور

۱۔ تدریس اردو از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۲ء فلیپ

مصلحتوں کے ماتحت وجود میں آئی تھی، اسے حاکم مسلمانوں نے فراخدلی سے
اپنالیا اور اس طرح آگے بڑھایا کہ ان کی اپنی اصل زبانیں عربی و فارسی بھی
پیچھے رہ گئی۔"(۱)

اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے تمام ہندو مسلمان ادیبوں اور شاعروں نے مل جل کر حصہ لیا اور ترقی کی منزلیں طے کیں:

"آگے چل کر ڈاکٹر صاحب کے مطابق اردو میں ذریعۂ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو عام فہم ہے اور ملک کی معاشرتی وتمدنی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے دنیا کے سارے مفکرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی قوم کو بہترین تعلیم صرف قومی زبان ہی کے ذریعے دی جاسکتی ہے بقول ڈاکٹر فرمان:

"دنیا کی ہر آزاد اور غیور قوم نے اپنی ہی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا
ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان کے نزدیک ادب، شاعری، علم وفن موسیقی و مصوری جیسے شعبوں کی ترقی میں اردو زبان کا بڑا حصہ ہے اردو اور علاقائی زبانوں کا ہمیشہ سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ اردو اور علاقائی زبانوں کا مرکزی موضوع یہ ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے رشتے کو زیادہ سے زیادہ موثر و مستحکم بنایا جائے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اردو کسی وقت لکھنؤ اور دہلی کی زبان رہی ہوگی لیکن ہمیں اس حقیقت کو
کھلے دل سے تسلیم کرلینا چاہئے کہ وہ اب لکھنؤ یا دہلی کی زبان نہیں رہی۔ یہیں
کے لوگوں نے سے اپنایا ہے یہیں کے لوگ اسے بولتے اور پڑھتے ہیں اور
یہیں کے لوگوں کے زیر اثر اس پر ایک نیا رنگ چڑھے گا۔ یہ رنگ علاقائی
زبانوں اور علاقائی تہذیبوں کا ہوگا۔ یہی رنگ پختہ ہوکر اردوئے معلی بنے گا

۱۔ تدریس اردو از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۴ء ص: ۲۰
۲۔ تدریس اردو از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۴ء ص: ۸۳

اور اردو کا مستند اسلوب کہلائے گا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے معلمانہ زندگی کے عملی تجربے اور اپنی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار پر دیا ہے تدریس اردو میں نہ صرف یہ کہ موضوع کا مکمل احاطہ کرتی ہے بلکہ زبان املا اور رسم الخط کو موضوع بحث بنایا ہے اور ہر موضوع پر ایسی بنیادی معلومات بہم پہونچائی ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے اردو زبان کی تشنگی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

اردو رسم الخط کی جامعیت

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مضمون ''اردو رسم الخط کی جامعیت'' پہلی بار جون ۱۹۵۱ء کے نگار لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اس کے بعد یہی مضمون ڈاکٹر فرمان صاحب کی کتاب ''تحقیق وتنقید'' کے دو ایڈیشنوں ۱۹۶۳ء اور ۱۹۷۰ء مطبوعہ ہندوستان و پاکستان میں شامل ہے۔ ۱۹۶۹ء دہلی میں ''تدریس اردو'' کے متعدد ایڈیشنوں مطبوعہ مکتبہ جامعہ کراچی، قومی زبان اسلام آباد میں چھپا اور یہی مضمون مزید اضافوں کے ساتھ کتاب ''ہندی اردو تنازعہ'' میں بھی شامل ہے۔

شان الحق حقی صاحب نے ترقی اردو بورڈ کراچی کے ترجمان ''اردو نامہ'' میں بھی شایع کیا اس کے بعد جنوری، فروری ۱۹۷۷ء کے نگار پاکستان کراچی میں ''مسائل زبان نمبر'' میں شائع ہوا۔ یہ مضمون متعدد اضافوں، ماخذوں اور حوالوں کے ساتھ اردو املا اور رسم الخط مطبوعہ سنگ میل لاہور مطبوعہ ۱۹۷۸ء میں شامل ہوا۔ اس کے بعد نگار پاکستان، اکتوبر ۱۹۸۸ء میں اس مضمون کا ایک جز پیش کیا ہے۔

یہ مضمون رسم الخط اور اردو رسم الخط کے عنوان سے ''زبان اور اردو زبان'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء اور طبع دوم ۱۹۸۰ء میں بھی شامل ہے۔ اس موضوع سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی ایک اور کتاب ''اردو املا اور قواعد''، ''مسائل ومباحث'' ۱۹۹۰ء میں اسلام آباد سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس کتاب میں جن مضامین کا انتخاب پیش

۱۔ تدریس اردو از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۳ء ص: ۱۱۷

کیا ہے۔ وہ تقریباً انہیں مسائل سے متعلق اور لسانی نقطہ نگاہ سے خاص اہمیت
کے حامل ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کتاب سے پہلے میں، اس کتاب کے مضامین کے متعلق لکھتے ہیں:

"زیرِ نظر کتاب میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ مضامین کا انتخاب
ایک خاص زاویئے سے کیا گیا ہے اور انتخاب کو صرف چند موضوعات تک محدود
رکھا گیا ہے۔"(۲)

اس کتاب میں اردو املا و قواعد کے متعلق ان تمام نامور ادیبوں، اور ناقدوں کے مضامین شامل کئے گئے ہیں جن میں خاص کر خلیق نقوی، جوشؔ ملیح آبادی، غلام رسول، سہیل بخاری، گوپی چند نارگ، گیان چندر، شوکت سبزواری، رشید حسن خاں، شبیر کاظمی، نیّر اقبال، اکرام چغتائی، فرید کوٹی، حامد حسن قادری، قدرت نقوی، نسیم صدیقی، عبدالستار اور خود ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اردو املا کے قواعد و اصول کے متعلق لکھتے ہیں:

"املا کے قواعد و اصول بنیادی طور پر زبان ہی کے قواعد و اصول میں دنیا
کی ساری ترقی یافتہ زبانوں میں املا کے ضابطوں کی سختی سے پابندی کی جاتی
ہے۔ کسی لفظ کا تلفظ اپنے مروج املا سے خواہ کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، لیکن اس
کا جو املا مقرر اور متعین ہے اسی طرح لکھیں گے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا
ہے کہ اردو میں اس کی جانب نہ پہلے کوئی توجہ دی گئی اور نہ خاطر خواہ دی جارہی
ہے۔"(۳)

اسی پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب اس موضوع پر پوری طرح احاطہ کرتی ہے اور ادب کے قارئین اور معلمین کو اردو املا و قواعد کے اصول سے روشناس کراتے ہیں:

۱۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء ص: ۳
۲۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء ص: ۱۰
۳۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء ص: ۳۲۱

''املا کے قواعد و اصول بنیادی طور پر زبان ہی کے قواعد و اصول ہیں، جب تک یہ قواعد و اصول مرتب و مقرر نہ ہوں اور زبان کے رسم الخط یا تحریر میں ان کی پابندی نہ کی جائے، حقیقی معنوں میں نہ تو کوئی زبان ترقی کر سکتی ہے اور نہ اس کا کوئی بلند معیار قائم ہو سکتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو املا اور رسم الخط'' (اصول و مسائل) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا جس میں اردو املا کے اصول، املا کا مفہوم، حروف، اشکال و اعراب و علامت، حروف تہجی کی مختلف شکلوں کا برمحل استعمال، رموز اوقاف کے استعمال کی صورتیں، املا کے سلسلے کی بعض دوسری علامتیں، بعض الفاظ کا صحیح اور غلط املا، اردو رسم الخط، مسائل و مباحث کی روشنی میں، رسم الخط اور زبان کے رشتے، اردو رسم الخط اور اس کے معترفین، اردو رسم الخط میں اصلاح کی تجویزیں اردو رسم الخط کے بعض دوسرے مسائل پر مضامین شامل ہیں۔ اردو املا اور رسم الخط کے مسائل و مباحث میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رسم الخط اور زبان کے متعلق لکھتے ہیں:

''رسم الخط اور زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور جیسے ہی اردو کے رسم الخط میں ترمیم و تنسیخ ہوئی یا اسے فارسی سے ناگری میں بدلا گیا، اردو خود بخود کچھ دنوں میں ختم ہو جائے گی اور ہندی ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ بات یہ ہے کہ ہندی کوئی الگ سے زبان نہ تھی اس کا نحوی ڈھانچہ اور قواعد کے اصول وہی ہیں جو اردو کے۔''(۲)

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر فرمان صاحب زبان اور رسم الخط کے متعلق لکھتے ہیں:

''زبان نام ہے مجموعے الفاظ کا الفاظ مرکب ہیں اصوات سے اصوات نام ہے ان تصاویر، خطوط اور نشاط کا جو ارتقاء کی منزلیں طے کر کے آج حروف کے نام سے ہمارے سامنے ہیں۔ یہی حروف جو تلفظ کی ادا اور معنی کے اظہار

۱۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء ص:۲

۲۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء ص:۱۷

کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اپنی مرکب صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب دیباچے میں کہتے ہیں:

"اردو رسم الخط کے مسئلے پر جتنی توجہ دی گئی ہے اردو املا پر نہیں دی گئی۔ حالانکہ میرے نزدیک اس وقت اردو املا کے سلسلے میں جتنی غور و فکر کی ضرورت ہے اردو رسم الخط کے سلسلے میں نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اردو رسم الخط کے سلسلے کی بحثیں بڑی حد تک تھم گئی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ طے پا گئی ہیں۔ لیکن اردو املا میں آج جس قسم کا مزاج اور انتشار کام کر رہا ہے وہ اردو کے حق میں مہلک ہے اور ہمدردان اردو کی خصوصی توجہ چاہتا ہے یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ املا کے قواعد و اصول بنیادی طور پر زبان ہی کے قواعد و اصول ہیں۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب اردو املا کی ضرورت و اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں:

"زبان کی تدریس کا جدید طریقہ یہ ہے کہ کل سے جزو کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی جملے یا الفاظ کے بعد حروف اور ان کی اشکال کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس لئے کئی فائدے ہیں۔ لیکن بڑا نقصان یہ ہے کہ بچوں کو حروف اور ان کی اشکال میں مہارت حاصل کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ وہ پڑھنا تو جلد سیکھ جاتے ہیں لیکن لکھنا جیسا کہ چاہئے بیشتر کو نہیں آتا۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب اردو رسم الخط کے بنیادی مشکلوں کو رسم الخط کے حوالے سے اردو کو بین الاقوامی زبان کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال سے کسی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ہیں صرف انہیں کا لحاظ رکھ کر اس لفظ کو لکھا جائے اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے۔

۱۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء ص: ۷۵

۲۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء ص

۳۔ اردو املا و قواعد از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء ص

نگار پاکستان کے اکتوبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس شمارہ میں خود ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''اردو رسم الخط کی جامعیت'' اور اسی موضوع پر شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''مجھے کن لوگوں سے چڑھ ہے'' شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی خصوصاً اردو رسم الخط کے حوالے سے، اردو کے ہر بہی خواہ کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''اردو املا اور رسم الخط'' مطبوعہ ۱۹۷۷ء میں اردو رسم الخط کے بارے میں کم وبیش وہ باتیں نرم لہجے میں کہی ہیں۔ جو فاروقی صاحب نے قدرے شدت و مزید دلائل کے ساتھ کہی ہیں۔''(۱)

ان ہی آوازوں کو ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے مضمون اردو رسم الخط کی جامعیت میں لکھتے ہیں:

''اردو رسم الخط کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو میں بولی جانے والی تمام آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب اس پورے مضمون میں ''اردو املا اور رسم الخط'' پر تفصیل سے بیان کیا ہے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اردو میں صرف نو حروف ایسے ہوتے ہیں جن کے لکھنے میں مغالطہ پیدا ہوتا ہے اور انگریزی میں لکھے کچھ جاتے ہیں پڑھے کچھ جاتے ہیں انگریزی کے تلفظ پر قابو پانا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اردو رسم الخط کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے ہیں اپنی مربوط صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر صاحب اس مضمون میں زبان اور رسم الخط اور اس کے تلفظ کو ہندی، اردو اور انگریزی الفاظ کے ذریعہ مثالوں کے ساتھ سمجھایا ہے اور ان حروف کی ادائیگی اور آوازوں کو پڑھنے بولنے اور سمجھنے میں جو

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ملاحظات ص: ۵

۲۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۳۲

۳۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۱۷

دشواریاں درکار ہیں ان تمام رسم الخط اور حروف تہجی کے الفاظ جو عربی فارسی زبان، جو اردو سے قریب ہے شامل کیا ہے۔

فرمان صاحب کے لفظوں میں:

> ''اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کا خمیر مختلف زبانوں اور بولیوں کی مدد سے تیار ہوا ہے۔ اس نے علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے، یہ اثر الفاظ پر بھی ہے اور اصوات یعنی حروف پر بھی اس نے فارسی کے خاص حروف پ، گ، ژ کو عربی کے خاص حروف ث، خ، ذ، ض، ط، ظ، ض، ط، ظ، ع وغیرہ کو اور سنسکرت و ہندی کے خاص حروف ڈ، ڑ، تھ، پھ اور جھ وغیرہ کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا اور اسی جذب و اخذ کی بدولت اسے بین الاقوامی مزاج ملا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب اس پورے مضمون میں اردو رسم الخط اور اردو الفاظ کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ زبان اور رسم الخط کے حروف تہجی کی تعداد اردو میں دیگر زبانوں سے زیادہ ہیں۔ یہ آوازیں، تلفظ کی ادائیگی کا تعین کرتی ہے اور اردو رسم الخط کی جامعیت و ہمہ گیری کی خصوصیت بیان کی ہے اردو رسم الخط کے اعتراضات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ہندی اردو تنازعہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''ہندی اردو تنازعہ'' ہے۔ یہ کتاب کراچی اور اسلام آباد سے ۱۹۷۷ء میں دوسری بار ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیفات میں سے ہے۔ اس کتاب میں ہندو مسلم سیاست پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں حسب ذیل موضوعات ہیں۔

ہزار سالہ ہندو مسلم اتحاد اور ثقافتی فاصلے قومیت اور زبان کا تعلق، ہندی اردو تنازعہ اور جداگانہ قوموں کی داغ بیل، اردو کا تاریخی جائزہ فورٹ ولیم کالج کا قیام، للو لال جی کے کردار کا اصل مقصد، مسلمان

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۸۸ء ص: ۲۵

حکمرانوں کا رعایا سے اچھا سلوک پھر مسلمانوں کا زوال، سرسید احمد خاں کی سیاسی، ثقافتی حیثیت اردو ہندی تنازعہ کے دس سال۔

ڈاکٹر فرمان صاحب ہندی اردو تنازعہ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''میں نے جو بات کہی ہے شواہد کے ساتھ کہی ہے اور جہاں سے جو نقطہ یا خیال ماخوذ کیا ہے۔ حاشیے میں اس کی نشاندہی کردی ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب اردو ہندی تنازعہ ہندو مسلم سیاست پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''ہندو اور مسلمان ہزار اختلاف کے باوجود کئی صدیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنی فراست سے اسی وقت پیشین گوئی کردی تھی کہ اب یہ دونوں قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، انہیں ایک نہ ایک دن الگ ہونا ہوگا۔ ہوا بھی یہی، اردو ہندی کے اختلاف کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں کے درمیان روز بروز فاصلہ بڑھتا گیا، ہندی ہندو قومیت کا۔ اور اردو، مسلم قومیت کا لازمی عنصر بن گئی۔'' (۲)

آخر کار ایک دن یہ فیصلہ ہو ہی گیا اردو کو مسلمانوں کے سر مڑھ دیا گیا جو ہندوستان میں رہنے والے ہندو مسلم کے آپسی ملاپ سے وجود میں آئی تھی۔ زبان کی تعصب سے گاندھی جی بھی گریز نہ کرسکے اور ناگپور کے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ایک اجلاس میں کہہ پڑے:

''اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا، مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔'' (۳)

گاندھی جی کا تعصب یہیں پر ختم نہیں ہوتا کانگریس کے اقتدار میں آجانے کے بعد مسلمانوں کا

۱۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۳

۲۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۳

۳۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۲۹۳

استحصال کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے مذہبی عقائد اور زبان و ثقافت پر ضربیں لگانی شروع کر دی۔ یہی نہیں بنکم چندر کے ناول ''آنند مٹھ کے ایک گانے ''بندے ماترم'' کو کانگریس نے اپنا قومی ترانہ بنایا۔ اس گانے سے مسلمانوں کے دلوں کو بہت ٹھیس پہونچی تھی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''کانگریس نے بندے ماترم کو قومی ترانہ بنانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مرضی و منشاء کے خلاف ایک حیرت انگیز قدم یہ اٹھایا کہ کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو قومی پرچم قرار دے دیا۔ نتیجتاً ہر ایک کے لئے اس کو سلامی دینا ضروری ہو گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ ''ترنگا جھنڈا'' قومی جھنڈا نہیں بلکہ سیاسی جماعت کا جھنڈا تھا۔''(۱)

گاندھی جی اپنی سیاسی چالوں کے سبب پورے ہندوستان میں اپنا لوہا منوالیا۔ ہندوئزم کے ذریعے گاندھی جی نے قوم پرستی اور مسلمان دشمنی کا ثبوت دیا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مسلمان کانگریسی اسے قومی ترانے و قومی پرچم کی طرح مانتے تھے۔

مختار زمن صاحب نے اپنے مضمون میں اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

> ''یہ کوئی ادھ کچری یا معمولی کوشش نہیں بلکہ ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والی کہانی ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ہزارہا صفحے پڑھے ہیں۔ رپورٹوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اردو کے مخالفین اور موافقین دونوں کا نقطہ نظر دیکھا ہے اور اس پر غور کیا ہے۔ اخبارات کی فائلیں کھنگالی تب جا کر یہ کام پورا ہوا۔ ۵۵۵ صفحات کی یہ ہے تو ہندی اردو تنازعہ کے متعلق مگر دراصل یہ اپنے زمانے کی تاریخ بھی ہے۔ مصنف نے شروع ہی میں واضح کر دیا ہے اس تنازعہ کو بھی ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔''(۲)

۱۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۳۷۸

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۹۰

مختار زمن کی رائے ہے کہ اس سے ان کے خیالات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان کا طرز تحریر سامنے آتا ہے۔ اردو دوست تو ہیں ہی لیکن کتاب سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مورخ کو کس طرح بے لاگ ہونا چاہئے۔ مختار زمن لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ کہنا بیجا ہے کہ مسلمان عربی، فارسی اور ترک بولتے ہوئے آئے تھے، برعظیم ہندو پاک میں رہ پڑے۔ اسی کو اپنا گھر بار سمجھنے لگے۔ انہوں نے اپنی مادری زبانیں بھی چھوڑ دیں اور یہاں کے مقامی باشندوں سے مل جل کر اردو زبان ایجاد کی، اسے ترقی دی اور عروج پر پہونچایا۔ گویا یہ زبان دو قوموں کے درمیان ایک پل کی طرح قائم کی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ہندی اردو تنازعہ کو برصغیر کی ثقافتی اور سیاسی تقسیم میں ایک بنیادی عنصر قرار دیا ہے۔

ہندی اردو تنازعہ اردو زبان کے ارتقاء پر نئی روشنی ڈالتی ہے اور برصغیر میں ہندو مسلم تنازعات کی تفہیم کا ایک واضح طور پر نیا راستہ فراہم کرتی ہے۔ یہ تنازعہ ادبی ولسانی نہیں ہے بلکہ سیاسی تھا۔ ہندی اردو تنازعہ برصغیر میں مسلمانوں میں پیدا ہونے والی بےچینی اور بڑھنے والی اضطراب کی کیفیت بیان کرتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی تصنیف دیدہ و باز دیدہ میں کہتے ہیں:

''ہماری علحیدگی کو وقت کی ستم ظریفی پر محمول کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہمارا پہلے بھی یہی دعویٰ تھا اور اب تو خیر یہ دعویٰ تاریخی حقیقت بن چکا ہے کہ ہندو مسلم تہذیبیں دو بہت واضح، طاقتور، منفرد اور جداگانہ تہذیبیں ہیں، ان کے وجود کو نہ پہلے جھٹلایا جاسکا اور نہ آج جھٹلایا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کو تصادم سے بچانا ان آثار کا تحفظ کرنا اور ان کے امکانات کو روشن رکھنا ہمارے آپ کے فریضے میں تھا۔ اس فریضے کو ایک عہدنامے اور ایک تاریخی اعلان کے ساتھ ہم نے اور اسی معاہدے اور اعلان کے تحت اب ہم ایک دوسرے سے ملنا اور ایک

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص:۴۹۱

دوسرے کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔"(۱)

انگریزوں کے آغاز سے قبل ہندوستان میں ہندو مسلم بڑے امن وشانتی کے ماحول میں ساتھ ساتھ رہتے تھے ہندو عام طور پر مسلم حکومت سے مطمئن اور خوش تھے۔

رام گوپال صاحب اپنی کتاب انڈین مسلمس میں رقم طراز ہیں:

"ہندو اور مسلمان نہایت پر امن اور خوشحال ماحول میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ایک دوسرے کے رسوم وآداب کے لئے دل میں جگہ رکھتے تھے اور عقائد واطوار کے امتیاز کی بنا پر باہم اختلاف کی اجازت نہ دیتے تھے۔"

> "انگریزوں کی آمد کے بعد ان کا مقصد ملک میں زیادہ سے زیادہ زبانوں اور بولیوں کو فروغ دے کر ان کے بولنے والوں میں انتشار پیدا کرنا تھا جو آگے چل کر مذہب کی بنیاد بن گئی۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب نے کہا جو چیز اختلاف اور فاصلے کا سبب بنی وہ مذہب نہیں زبان تھی جب تک زبان کا مسئلہ پیدا نہ ہوا تھا دونوں قومی اختلاف مذہب کے باوجود امن وسکون سے رہ رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے مستند حوالوں کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ زبان کے لئے ہندی اور قومیت کے لئے ہندو کا لفظ انیسویں صدی سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا اور اپنے آغاز کے ساتھ ہی اصطلاحیں ہندو مسلم تفریق کی بنیاد بن گئی۔

ڈاکٹر فرمان صاحب ہندی زبان کی تحقیق کے سلسلے میں لفظ ہندو کی غرض وغایت کے متعلق بالفور کا اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہندو کا لفظ موجودہ معنی میں جیسا کہ بالفور نے لکھا ہے۔ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے مضبوط ہوجانے کے بعد سیاسی اغراض کی خاطر دانستہ اپنایا گیا ہے۔اس کے اپنانے کا مقصد ہندوستان کے مختلف طبقات اور قومیت کے لوگوں کو ایک قوم کے نام پر مجتمع کر کے مسلمانوں کے مقابلے میں ایک نئی

۱۔دیدہ وباز دیدہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ ملتان ۱۹۸۳ء ص:۶۷

۲۔انڈین مسلمس از رام گوپال۔ص:۱۱

قوم کو ابھارنا تھا۔ اس کے لئے ۱۷۸۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی تھی شہنشاہ انگلستان اور گورنر جنرل ہند، وارن ہسٹنگز اس کے مربی و سرپرست مقرر ہوئے۔ دوسرے ارکان بھی حکومت کے خطاب یافتہ اور وظیفہ خوار تھے۔ اس انجمن کے سربراہ سرولیم جونس اور بعد کو اس کے جانشیں میکس مولر نے ہندوستان کی آریہ قوم کو دنیا کی مہذب ترین قوم ثابت کر کے قدیم ایرانیوں سے ان کا رشتہ قائم کیا اور زبانوں کے تقابلی مطالعہ کے ذریعے سنسکرت کی قدامت واہمیت پر خاص طور پر زور دیا اور ان کی تحریریں ہندوؤں کو من حیث القوم ابھارنے میں معاون ثابت ہوئی۔''(۱)

آخر کار انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور زبان کے اختلاف نے ہندوؤں مسلمانوں میں نفرت کے جذبات ابھارنے لگے اور یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا یہ خالص ہندوستانی زبان ہے اور یہیں پلی بڑھی اور ترقی کی منزلیں طے کیں۔ جسے ہندو مسلمان اور سکھوں نے مل کر پروان چڑھایا۔

ڈاکٹر فرمان کی تصنیف ''ہندی اردو تنازعہ'' میں اردو زبان کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور برصغیر میں ہندو مسلم تنازعات کی تفہیم کا واضح طور پر ایک نیا راستہ فراہم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ادب، تاریخ اور سیاست کے موضوعات پر معلومات کا خزانہ ہے۔ کوئی فرمان صاحب کے رائے سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ وہ ان کے وسیع مطالعے سے متاثر ضرور ہوگا۔ کیونکہ جو بات کہی گئی ہے اس کے ماخذ کو ظاہر کیا گیا ہے اور حوالہ کتاب کا دیا گیا ہے۔ ایک خصوصیت ڈاکٹر فرمان کی تحریر کی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی رائے کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں اور پورے زور و شور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے مزاج میں نرمی اور رواداری کی صفات ہے۔ مگر اظہار خیال کرتے وقت وہ رورعایت نہیں کرتے۔ وہ ہندی کے مخالف ہرگز نہیں ہیں لیکن ان کا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اردو کا وجود ''ہندی'' کے پہلے ہوا ہے اور ہندی زبان کے فروغ میں ہندو قومیت کے جذبات کارفرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو اور ہندی کی ابتداء کے بارے میں محققین میں اتفاق نہیں ہے۔

ا۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۸ء ص:۴۲

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب میں مختلف نظریہ کو پیش کیا ہے اور اپنی رائے کا بھی واضح اظہار کیا ہے۔ڈاکٹر فرمان صاحب کا نظریہ ہے:

''برعظیم کا تاریخی اور لسانی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جسے آج کل ہندی کہا جاتا ہے اور جسے موجودہ ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا گیا ہے اس کی تاریخ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔''(۱)

نگار پاکستان کے اس خصوصی شمارے میں ڈاکٹر فرمان صاحب کے تین مضامین شامل ہیں۔مسلم قومیت،تحریک پاکستان اور اردو، اردو زبان کا مختصر تاریخی جائزہ، ہندی زبان کا مختصر تاریخی جائزہ۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اردو اپنی ساخت میں ایک مخلوط زبان ہے یعنی اس کی اساس مختلف زبانوں کے الفاظ کے اختلاط پر قائم ہے۔ اس اساس کو ہندو مسلمانوں کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی ضرورتوں نے جنم دیا اور راہیں طے کیں لیکن اردو کو مخلوط زبان کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کی اور زبانیں خالص ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو خالص ہونے کا دعویٰ کر سکے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا نظریہ ہے:

''ہندی کا لفظ ایک جداگانہ زبان کے معنوں میں دراصل فورٹ ولیم کالج کلکتہ (۱۸۰۰ء) کے ارباب حل و عقد کے منشاء و اثر سے مستعمل ہوا۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر تاراچند کی رائے بہت صحیح ہے۔فورٹ ولیم کالج سے قبل ہندی کا

۱۔نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ملاحظات ص:۵

۲۔نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص:۲۳

۳۔نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص:۲۳

> لفظ خاص نہیں، عام تھا۔ یعنی اس کا اطلاق، برج بھاشا اور راجستھانی، بندیلی اور اردو وغیرہ پر ہوتا تھا اور اس بناء پر اردو بھی ایک زمانے میں ہندی کہلاتی تھی۔ مگر وہ ہندی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اس کی پیدائش بہت بعد کو ہوئی۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق موجودہ ہندی کوئی قدیم زبان نہیں ہے۔ اس کو جنم دینے اور اس کی تبلیغ وترقی کا کام ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع ہوا اور پھر یہ کام انگریزوں کی تعلیمی ولسانی پالیسیوں (جن کی بنیاء پر بہر حال سیاسی مقاصد پر رکھی جاتی تھی) کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں جب فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب صدر عدالت دیوانی اور نظامت میں بھی اسے سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی تو بظاہر انگریزی حکومت کا یہ اقدام اردو کے حق میں تھا لیکن اس تبدیلی سے انگریزوں کی نظر بڑے دوررس نتائج پر تھی۔ اور یہ نتائج سراسر حکومت کے مفاد میں تھے۔ فارسی کو ختم کر کے انگریزوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس مضبوط وقدیم ثقافتی رشتے کو کاٹ دیا۔ جس میں ہندوستان کے سارے مسلمان خواہ وہ کسی صوبے اور علاقے کے رہنے والے ہوں، بندھے ہوئے تھے اور جو مسلمانوں کے حق میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور علمی وادبی ہر لحاظ سے زیادہ مفید کار آمد تھا۔ اردو کی مقبولیت اور جامعیت کے سبب اسے کچھ عرصے کے لئے انگریزوں نے فارسی کی جگہ رائج تو کر دیا لیکن اس تبدیلی سے انہیں دہرا فائدہ پہونچا۔ ایک تو یہ کہ انہیں مسلمانوں کی ثقافتی وسماجی شیرازہ بندی کو کمزور کرنے میں آسانی ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ عوام سے رابطہ قائم کرنے اور اس طرح اپنی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا انہیں موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو رواج دینے کے سلسلے میں جو احکامات جاری کئے گئے تھے۔ ان میں ایسی شکلیں بھی موجود تھیں جن کی آڑ لے کر انگریز نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مختلف صوبوں میں مختلف زبانوں کو فروغ دے کر مسلمانوں کے اس ثقافتی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی جو فارسی کے سبب قائم تھا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے آپ متفق ہوں یا نہ ہوں، انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے:

۱۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص: ۴۴

''ہندی نہ صرف یہ کہ ادبی سرمایے بلکہ عوامی مقبولیت، مقامی تہذیبوں
کی وسعت کے لحاظ سے بھی اردو کے مقابلے میں بہت کمتر درجے کی زبان
ہے اور قدامت کے لحاظ سے تو وہ اردو سے بہت ہی کم عمر ہے، اس لئے کہ
ہندی نے ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ یا اس کے کچھ بعد جنم لیا ہے، اس کے برعکس
اردو ایک پختہ زبان کی حیثیت سے کم وبیش چار سو سال پرانی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب مسلم لیگی خیال کے آدمی ہیں یہی مسلم لیگی خیال انہیں پاکستان پہونچا دی اور وہ سرحد کے اس پار بیٹھ کر ہندی زبان کی مزمت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مزمت ہی نہیں کرتے بلکہ بات حوالوں اور شواہد کے ساتھ کرتے ہیں۔

علامہ اقبال اپنے سیاسی نظریات وخیالات کا اظہار اپنے ایک خطبہ صدارت مسلم لیگ الہ آباد میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں
زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کردیا جائے۔ یہ مطالبہ
مسلمانوں کی اس دلی خواہش پرمبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو ونما کا موقع
ملے کیونکہ وحدت قومی کے نظام حکومت میں جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست
اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں ان
کا غلبہ وتسلط ہوجائے اس قسم کے مواقع حاصل ہونا قریب قریب ناممکن ہیں۔
اس مشورے کے بعد انہوں نے اس کا عملی حل بھی پیش کیا اور وہ یہ تھا
کہ: ''پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی
جائے۔''(۲)

یہ ہیں وہ خیالات جن کی بناء پر کہا جاتا ہے کہ قیام پاکستان کے محرک اول علامہ اقبال ہی تھے۔

۱۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص: ۶۳

۲۔ نگار پاکستان دسمبر ۱۹۹۰ء ص: ۶۳

اردو اور ہندی کی قدامت کا تاریخی جائزہ:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو اور ہندی کی قدامت کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ دو قومی نظریئے اور تحریک پاکستان کی اینٹ سر سید احمد خاں کے ہاتھوں اس وقت رکھی گئی جب برعظیم کی مقبول عام زبان اردو کو دیونا گری میں لکھنے اور اسے ہندی کہنے اور کہلوانے پر اصرار کیا گیا اور ہندی کو اردو سے قدیم تر زبان بتایا گیا حالانکہ برعظیم کا تاریخی اور لسانی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جسے آج کل ہندی کہا جاتا ہے اور جسے موجودہ ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا گیا ہے اس کی تاریخ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''پاک و ہند کے مورخین و محققین نے اردو کو اپنے اپنے علاقوں کی زبان سے رشتہ قائم کرنے اور اسے اردو کا پہلا گہوارہ قرار دینے میں ایک طرح کا فخر محسوس کیا ہے۔''(۲)

اردو بھی پاک و ہند کی دوسری زبانوں کی طرح مقامی زبان ہے۔ وہ عرب، ایران یا ترکی سے نہیں آئی یہیں جوان ہوئی اور یہیں ترقی کی ساری منزلیں طے کیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو زبان کے متعلق لکھتے ہیں:

''لسانی اعتبار سے اردو کا تعلق آریائی خاندان کی زبانوں سے ہے۔ اس کی قواعد، مرکبات کے اصول اور جملوں کی ساخت کا سارا ڈھب آریائی زبانوں جیسا ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی وغیرہ کے بھی بے شمار الفاظ شامل ہیں۔''(۳)

۱۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ملاحظات ص:۵

۲۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص:۶۸

۳۔ نگار پاکستان اگست ۱۹۸۸ء ص:۶۹

اردو ہندو مسلمان کے ملاپ کا حاصل اور دونوں کی تہذیبوں کا سنگم ہے ہندو مسلمان میں اتحاد و یگانگت کی جو صورتیں پیدا ہوئیں وہ اسی کی مدد سے پیدا ہوئیں اس کی پیدائش و ترقی اور مقبولیت میں کسی چیز کو دخل نہیں تھا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ ہندو مذہب اور ہندو قومیت کا جذبہ جب سیاسی قوت کی شکل میں ابھرنے لگا تو ہندوؤں کے رویے میں تبدیلی آ گئی اور ہندو قومیت کی احیاء کے لئے ہندی کا پرچار کیا جانے لگا ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اکثر ادیب اور محقق فرمان صاحب کے اس نظریے سے متفق نہیں ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اسی شمارے میں ''ہندی زبان کا مختصر تاریخی جائزہ'' بھی پیش کیا ہے ان کی رائے ہے کہ ''ہندی'' کا لفظ ایک جداگانہ زبان کے معنوں میں دراصل فورٹ ولیم کالج کلکتہ (۱۸۰۰ء) کے ارباب حل وعقد کے منشاء واثر سے مستعمل ہوا۔ اس کالج میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی سربراہی میں مشرقی زبانوں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو کی تعلیم و تدریس کا جو شعبہ قائم کیا گیا۔ اس میں نصابی ضرورت کے لئے مختلف زبانوں کے منتخب کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی گئیں۔ مترجمین و مؤلفین میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے اور خود ڈاکٹر گلکرسٹ کو اس کام سے بہت دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ تقریباً سارے محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ خسرو نے جس زبان کو ''ہندوی'' کہا ہے وہ اردو ہی کا قدیم ترین نام ہے۔

مولوی عبدالحق اردو کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۵۱ء میں ایک خطبہ پڑھا تھا اس میں مولوی صاحب مخالفت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہونچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے ان جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑھے تھے۔ مخالفت در پردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص و استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک سو بسوئے کے کامیاب ہوگی۔ مخالفت نے پاکستان بنایا ورنہ کیا اتنی جلدی بن جاتا اور مخالفت ہی کے طفیل اردو کو ترقی نصیب ہوئی ہے۔'' (۱)

۱۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۴۹، ۱۵۰

مولوی عبدالحق صاحب اپنے خطبے میں اردو کی پیدائش اور اس کی مقبولیت کے متعلق کیسے دلکش پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یہ زبان کی ایک قسم ہے۔ دنیا میں ایسی متعدد زبانیں ہیں۔ اس قسم کی زبان کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب کشور کشائی ہے۔ مسلمان بھی اس ملک میں آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور اہل ملک دیسی زبان ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے معاشرتی، ملکی اور کاروباری ضرورت سے مسلمان بول چال میں دیسی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہندو فارسی الفاظ فاتحوں کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں بہت کم تھی اور اسی لئے وہ اہل ملک کی زبان سیکھنے پر مجبور تھے۔ دو چار نسلوں کے بعد ان کی اولاد ملکی زبان خوب بولنے لگی لیکن فاتح قوم کی زبان کا اثر بھی ملکی زبان پر پڑتا رہا اور اس اختلاط نے ایک گمنام بولی کو جو عوام کی بلکہ دیہات کی بولی تھی ایک شائستہ اور مستقل زبان کے رُتبے تک پہونچا دیا جسے اردو کہئے یا ہندوستانی۔''(۱)

اردو کی پیدائش گاہ کی بحث اردو ادب کی تاریخ میں اختلافی قضیہ پر آگئی ہے۔ لیکن مولوی صاحب اسے اردو کی مقبولیت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ مادری زبان اور قومیت پر مولوی صاحب نے ایک خطبے میں بیان کیا ہے:

''قومیت کے لئے یک رنگی، یک رنگی کے لئے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لئے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنادیتی ہے اردو نے بدرجہ کمال یہ خدمت انجام دی ہے اور

ا۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۵۴،۱۵۴

یہ اس کی بڑی کرامت ہے۔''(۱)

مولوی صاحب قومی زبان کی اہمیت اور اس کی تاریخی اور تہذیبی زبان وقوم اور اس کے مسائل کا حل پیش کیا ہے، جس سے ان کے نظریات وخیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس استدلال اور سادگی سے اپنے خطبے میں بیان کئے ہیں۔

قومی زبان کا مسئلہ:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھاتے ہیں:

''برعظیم پاک و ہند کی تحریک آزادی میں قومی زبان کا مسئلہ شروع ہی سے زیر بحث رہا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دوقومی نظریے اور اردو تحریک پاکستان کا آغاز ہی زبان کی ایشو سے ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوؤں کی طرف سے پہل کیا گیا جو خود بھی ایک مدت سے اردو اور اس کے مروج فارسی رسم الخط کے حامی چلے آرہے تھے تو اس مطالبے پر سر سید احمد خاں کو پہلی بار یہ کہنا پڑا کہ۔

''اب مجھ کو یقین ہوگیا کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی ابھی تو کم ہیں آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور تناؤ ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری سر سید کے اس قول کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''سر سید کہ پیش گوئی لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہوئی جیسے جیسے وقت گذرتا گیا زبان اور رسم الخط کے حوالے سے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ آخرکار مسلمانوں نے مفاہمت کے خاطر یہ کیا

۱۔ تحقیق وتنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۵۶

۲۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۲۹۲

کہ برعظیم کی آئندہ قومی زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کا نام دینے پر رضامند ہو گئے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہندی اردو تنازعہ میں لکھتے ہیں:

"گاندھی جی نے ۱۹۳۵ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس منعقدہ اندور میں ۱۹۲۵ء کی قرارداد کو ہوشیاری سے بدل دیا پہلے قومی زبان کے لئے صرف "ہندوستانی" نام استعمال کیا گیا تھا۔ اب اسے "ہندی ہندوستانی" کر دیا گیا۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ اس کے بعد، محبان اردو چونکے اور ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۹ء کے درمیان لسانی تنازعہ نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ عملاً ہندو مسلمان کی سیاست میں سب سے اہم موضوع گفتگو یہی بن گیا۔ "ہندوستانی کیا ہے؟ یا اسے کیا ہونا چاہئے۔ ان سوالوں پر بار بار بحثیں کی گئیں۔ عالموں اور ادیبوں کی طرف سے بھی اور سیاسی رہنماؤں کی طرف سے بھی۔ اخبارات و رسائل میں بھی مضامین چھاپے گئے اور ریڈیو سے تقریریں نشر کی گئیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے اس بحث میں حصہ لیا اور یوں لگتا تھا جیسے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان زبان کے نکتے پر مستقل سمجھوتہ ہو جائے گا لیکن آگے چل کر کانگریس اور اس کے رہنما اس موقف سے بھی ہٹ گئے اور ہندوستان کو سنسکرت آمیز ایسی ہندی اپنانے پر اسرار کیا جو برعظیم کے عوام الناس کی سمجھ سے باہر تھی اور جس پر ہندوؤں کے سوا کوئی اور طبقہ متفق نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے ثقافتی و تہذیبی درجے اور قومی شخص کے دفاع کے لئے

۱۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۲۹۲

۲۔ ہندی اردو تنازعہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء ص: ۲۹۳

الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ پاکستان کی صدارت میں کانگریس اور ہندوؤں کو آخر کار تسلیم کرنا پڑا اور ۱۹۴۷ء میں قومی زبان کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے پایا گیا۔"(۱)

اس طویل اقتباس کا مقصد صرف یہ ہے کہ واضح ہو جائے کہ فرمان صاحب خود قومی زبان کے مسئلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں مسلم لیگ کے ورکر تھے اور اس سلسلے میں مسلم لیگ کے نظریات سے مکمل اتفاق کرتے تھے جس طرح مسلم لیگ دوقومی نظریے کو مانتی تھی یہ بھی اس نظریہ کو مانتے تھے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کے خیالات ورجحانات سے اتفاق کرنا تو ہندوستان کے ادیبوں اور نقادوں کو بہت دشوار ہے۔ فرمان کانگریس دشمنی کو چھپاتے نہیں وہ کانگریس کو ہندوؤں کی سیاسی انجمن قرار دیتے رہے۔

نگار کے اس خصوصی شمارے میں انہوں نے اپنی رائے بھی لکھ دی اور ڈاکٹر تارہ چند، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور آصف علی خاں کی تقریروں کو بھی دوبارہ شائع کیا۔ یہ تقریریں کتابیں صورت میں مکتبہ جامعہ دہلی نے پہلے چھاپا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو نے ۱۹۳۹ء میں یہ تقریریں نشر کی تھیں۔ فرمان صاحب نے ملاحظات میں لکھا ہے کہ یہ تقریریں برعظیم کی ہندو مسلم سیاست اور اردو زبان کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے اور اس لئے ان کی افادیت بہرحال مسلم ہے۔ ان کا مطالعہ برعظیم کی ہندو مسلم سیاست کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم ثقافت تحریک پاکستان ودوقومی نظریے کے آغاز قیام پاکستان کے سلسلے میں اردو کے سیاسی کردار ہندی اردو کے امتیازات اور دونوں زبانوں کے مزاج خاص سمجھنے میں مدد ملے گی۔

نامور مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"ہندی کے لکھنے والے سنسکرت سے اور اردو کے لکھنے والے عربی سے لفظ ادھار لے رہے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ ہندی اردو میں اتنا فاصلہ بڑھ رہا ہے کہ ایک کے لئے دوسرے کی بات سمجھنا کٹھن ہے۔ اگر رویہ یہی رہا تو اسکولوں،

ا۔ نگار پاکستان، جنوری ۱۹۸۵ء ملاحظات ص: ۴

کالجوں، یونیورسٹیوں، سبھاؤں، سماجوں، دفتروں، کچہریوں میں ایسی دورنگی پھیلے گی کہ سارا کام چوپٹ ہو جائے گا کیونکہ جب تک دیسی بھاشا نچے درجوں میں پڑھائی کا ذریعہ ہے اور باقی کام انگریزی سے نکلتے ہیں تب تک تو جھگڑا کم ہے، لیکن جہاں انگریزی کی جگہ لینی شروع کی اور اندھی تعلیم اور قانونی بحثوں کا کام اٹھایا وہیں سنسکرت بھری ہندی اور عربی بھری اردو کے پجاریوں میں گتھم گتھا شروع ہوئی۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔ یہ دیش کو ایسی بھیانک کشش میں پھنسادے گا کہ جس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔''(۱)

ڈاکٹر تاراچند کی رائے تھی کہ ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کیا جائے تو دیوناگری اور فارسی رسم الخط دونوں لکھی جائے۔ یہی گاندھی جی کی لسانی پالیسی تھی۔ فرمان صاحب اس پالیسی کے خلاف تھے اور خلاف ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی ہندوستانی کی حمایت کی تھی انہوں نے کہا:

''میرا تو خیال ہے کہ شاعر اور ادیب بھی جلد ہی ہندوستانی میں لکھا کریں گے یعنی اس بول چال کی صاف زبان میں جس سے کوئی لفظ اس لئے نہ نکالا جائے گا کہ وہ کہیں اور سے آیا تھا اور جس میں برابر نئے لفظ بھی باہر سے لئے جائیں گے۔ مگر بے میل موٹے موٹے لفظ عربی کے ہوں کہ سنسکرت کے، اس میں یوں ہی نہ ٹھونسے جائیں گے۔ یہ ہندوستانی قوم کے آپسی میل جول کی نشانی ہوگی، ہمارے پچھلے کاموں کی یادگار، ہمارے آگے کے حوصلوں کا آئینہ ہے۔''(۲)

مسٹر آصف علی نے کہا:

''میری ساری رام کہانی کا نچوڑ یہ ہے کہ اردو، ہندی، ہندوستانی تینوں

۱۔ نگار پاکستان جنوری ۱۹۸۵ء ص: ۳۸

۲۔ نگار پاکستان جنوری ۱۹۸۵ء ص: ۳۵

الگ الگ زبانیں ہیں اردو تو بنی بنائی ہے اور ہندی بھی اب بن چکی ہے ان دونوں کے سنجوگ سے جو گنگا جمنی زبان بننے والی ہے وہ ہندوستانی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد پاکستان سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا یہ کتاب کل پندرہ صفحات پر مشتمل ہے جس میں فرمان صاحب کے مضمون کے ساتھ حکیم رشید اشرف ندوی کا بھی مضمون اسی موضوع پر شامل ہے اس کتاب کو کتاب نہ کہہ کر کتابچہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا جو ایک پمفلیٹ کی شکل میں ہے۔

ڈاکٹر صاحب اردو اور علاقائی زبانوں کے باہم رشتے کے متعلق لکھتے ہیں:

"اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون، ایک ہی رنگ ونسل، ایک ہی آسمان، ایک ہی زمین ایک ہی انداز فکر اور ایک ہی طرز ادا کا رشتہ ہے۔ دورِ حاضر سے لے کر قدیم تر زمانے تک سراغ لگاتے چلے جائیں۔ یہ رشتہ پوری طرح واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف ورقیب نہیں بلکہ عزیز ورفیق ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نہ تو اردو نے کسی علاقائی زبان کے پیٹ سے جنم لیا اور نہ کوئی علاقائی زبان اس کے بطن سے پیدا ہوئی لسانی نقطۂ نظر سے ایسا ممکن بھی نہیں ہے زبان سے زبان جنم نہیں لیتی بلکہ سماجی، علاقائی اور معاشرتی ضرورتوں سے کبھی ایک اور کبھی بیک وقت کئی زبانیں وجود میں آجاتی ہیں۔"(۲)

اس مضمون کے آخر میں قومی اور علاقائی زبانوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب قلم طراز ہیں:

"قومی زبان کسی خاص علاقے یا گروہ کی زبان نہیں پوری قوم اور پورے ملک کی زبان ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر پیشاور سے لے کر کراچی تک

۱۔ نگار پاکستان جنوری ۱۹۸۵ء ص: ۴۴

۲۔ قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۶ء ص: ۶

سب کا یکساں حق ہے۔ اردو کا تصادم کسی علاقائی زبان سے نہیں انگریزی زبان سے ہے۔ اس کا حق علاقائی نہیں انگریزی غصب کر رہی ہے۔"(۱)

اردو کی منظوم داستانیں:

اردو کی منظوم داستانیں" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں کراچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ اس مقالہ کو کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ۶۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا انتساب خاندان کے معزز رکن پیر محفوظ علی کے نام کیا ہے۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اس مقالے میں ۱۸۷۰ء تک کی اردو منظوم داستانوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان منظوم داستانوں کی نوعیت واہمیت اور شاعرانہ حسن واثر کا مفصل ذکر تو آئندہ سطور میں ملے گا۔ اس جگہ اس قدر کہنا ہے کہ صرف اردو نہیں بلکہ دنیا کی ہر متمدن قوم اور شائستہ زبان میں شروع سے منظوم داستانوں کو قبول عام حاصل رہا ہے۔ اور آج جسے عالمی کلاسیکل ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں زیادہ حصہ "منظوم داستانوں ہی کا ہے۔"

یہ مقالہ نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے جس میں ۱۸۷۰ء تک کے منظوم داستانوں پر تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو کی منظوم داستانوں کے باب اول میں، منظوم داستانوں کی قدامت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"منظوم داستانوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسانی زندگی ان میں اتنی ہی رنگا رنگی و دلکشی ہے جتنی خود انسانی زندگی انسانی زندگی کے عمرانی و تہذیبی، ارتقاء کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو داستان طرازی اور شعر گوئی سے ازلی مناسبت رہی ہے اور اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ انسان منظوم

۱۔ قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۶ء ص:۱۱

۲۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۱۱

داستانوں کواپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب باب چہارم میں شمالی ہند کے منظوم داستانوں کا آغاز اور سماجی پس منظر اردو شاعری کا آغاز، عہد مغلیہ اور دہلوی شعراء دبستان لکھنؤ اور لکھنؤ میں منظوم داستانوں کے فروغ اور اس کے اسباب پر نظر ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صاحب دہلوی شعراء کے فن داستان کے متعلق لکھتے ہیں:

''فن داستان کی نقطہ نگاہ سے کامل نہ سہی زبان و بیان کے اعتبار سے بہتر طور پر دہلوی شعراء کے مختصر منظوم افسانے ادب کے تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں، ان میں سادگی و صفائی حقیقت پسندی سوز و گداز اور حسن و اثر ساری چیزیں ہیں، دہلوی شعراء شمالی ہند میں منظوم افسانے کی بنا ڈالنے والوں میں ہیں۔''(۲)

اسی باب میں آگے چل کر ایک دوسری جگہ لکھنوی داستان کے متعلق لکھتے ہیں:

''افسانوی مثنوی کے اہم لوازم مثلاً عشقیہ قصوں کے لئے ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب جذبات کی مصوری، واقعہ نگاری و سیرت نگاری، بزم رقص و سرور کی تصویر کشی اور خارجی زندگی کی منظر نگاری کے لئے جو مواد لکھنؤ میں موجود تھا وہ دہلی کی پُر آشوب فضا میں میسر نہ تھا۔ اس لئے لکھنؤ میں منظوم داستانوں کو فنی نقطہ نظر سے عروج کی جس منزل تک پہونچا دیا وہ دہلی سے نہ بن سکا۔''(۳)

ڈاکٹر صاحب باب ششم میں مختصر عشقیہ افسانے شمالی ہند میں سوداؔ اور میرؔ کی منظوم داستانوں پر بحث کی ہے۔ شیخ چاند لکھتے ہیں:

۱۔اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۱۷
۲۔اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۱۴۳
۳۔اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۱۴۸

''چونکہ سودا نے میر سے قبل شاعری شروع کردی تھی یہاں تک کہ جب
اس کی شاعری کی دھوم تھی اور عام شہرت تھی اس وقت میر نے ابتدا کی تھی۔''
(۱) (سودا۔ از شیخ چاند مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر صاحب سودا کے متعلق لکھتے ہیں:

''مثنوی کے میدان میں سودا نے پہلے طبع آزمائی کی ایجاد و تقدم کا فخر
انہیں کو حاصل ہے۔ اس لحاظ سے سودا کی مثنوی ''قصہ در عشق پسر شیشہ گر یہ گر
پسر'' جس میں ایک عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ شمالی ہند کی پہلی منظوم داستان
قرار پاتی ہے۔'' (۲)

باب ہفتم میں ڈاکٹر صاحب غیر زبانوں سے ماخوذ داستانیں اور منظوم ترجمے ۱۸۰۰ء کے بعد فارسی، سنسکرت اور دیگر علاقائی زبانوں سے داستانیں اردو میں منتقل کر لی گئیں۔ خاص کر یہ داستانیں ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کے قیام کے بعد اردو نثر میں باغ و بہار، پدمارت، رامائن، رانی کیتکی کی کہانی، نل و من، لیلیٰ مجنوں، قصہ چہار درویش، ہیر رانجھا، فسانۂ عجائب، الف لیلیٰ، سنگھاسن بتیسی، افسانۂ غم، فسانہ گوپی چند وغیرہ اردو میں منظوم کی گئی جس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

آٹھویں باب میں بعض طویل اور اہم منظوم داستانوں کا تفصیلی مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے جس میں دریائے عشق اور بحر المحبت، منظوم داستانوں میں سحر البیان، گلزار نسیم، طلسم الفت کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعراء کی مثنوی اور اس کی سنہ تصنیف وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب نہم میں ڈاکٹر فرمان صاحب منظوم داستانوں کا عہد عروج و زوال تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ یونانی اطالوی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی، سنسکرت، عربی، فارسی، اردو شاعری پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''منظوم داستانوں کی صنف نہ صرف اردو بلکہ دنیا کہ ہر زبان کے شعراء

۱۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۲۷۹

۲۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۲۷۹

کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان منظوم داستان کے متعلق لکھتے ہیں:

"منظوم داستانیں مشرق کی ہوں یا مغرب کی قدیم یونان کی ہوں یا برصغیر پاک و ہند کی اپنی ساخت، مزاج، مافوق فطرت، عناصر جنسی کشش، شجاعت و محبت، طلسمی ماحول اور ہیرو پرستی کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ساری قوموں اور ملکوں میں منظوم داستانوں کی روایت عام و خاص دونوں میں ہمیشہ سے مقبول رہی ہے۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب اردو کی پہلی منظوم داستانوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"اردو میں بھی اس بیش بہا سرمائے کا سراغ شروع سے ہی ملتا ہے۔ اردو کی پہلی منظوم داستان "کدم راؤ پدم راؤ" دکن میں پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر برابر قائم رہا جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے سودا اور میر ہی کے عہد سے منظوم قصوں کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔"(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب دیباچے میں لکھ دیئے ہیں:

"مقالے کی تیاری میں حتی الوسع، موضوع کے ہر گوشے کی چھان بین اور ہر باب غور کر کے رائے قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے باوجود میں کسی رائے کو حرف آخر سمجھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے سائنس ہو یا ادب آج سے نہیں ہمیشہ سے تحقیق خود تحقیق کی دشمن ثابت ہوئی ہے۔"(۴)

۱۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۶۷۰

۲۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۶۷۱

۳۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۱۴

۴۔ اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۱۴

فرمان صاحب کا تحقیقی مقالہ ''اردو کی منظوم داستانیں'' کے پہلے ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''اردو مثنویاں'' موجود تھیں۔ نارنگ صاحب کی اس کتاب کا ذکر اردو کی منظوم داستانیں'' میں نہیں ہے۔ غالباً اس وقت فرمان صاحب کی نگاہ سے نارنگ صاحب کی کتاب نہ گذری ہو۔

پروفیسر سید جاوید اقبال نے اپنے مضمون اولیات ڈاکٹر فرمان فتح پوری میں یہ دعویٰ کیا ہے:

''اردو کی منظوم داستانیں ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ بھی اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں منظوم داستانوں کی قدامت و اہمیت، فنی لوازم اور داستانوں کے عروج و زوال کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔''(۱)

اردو میں منظوم داستانوں کا موضوع پہلے سے محققین اور نقادوں کو متوجہ کر چکا تھا اس لئے اردو کی منظوم داستانیں، اولیات ڈاکٹر فرمان فتح پوری میں شامل نہیں ہوسکتی۔ اس کے باوجود فرمان صاحب کی تصنیف اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر سید محمد عقیل نے تحقیقی و تنقیدی مطالعے لکھے ہیں۔

فرمان صاحب کی تحقیق کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''ان کی تنقید و تحقیق کی بنیادی خصوصیت منطقی خوش استدلالی ہے۔ منطق، اگر خوش استدلال نہیں ہو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی، صحیح اور امانتدارانہ تحقیق و تنقید کا راستہ خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات فرمان فتح پوری کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''(۲)

رشید حسن خاں تحقیقی مقالات کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہئے اور صفائی الفاظ کی استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہئے۔ اردو تنقید

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۸ء جلد اول، ص: ۳۸۲

۲۔ فورٹ ولیم کالج مرتبہ سید معین الرحمٰن کراچی ص: ۱۲

جس طرح انشاء پردازی کا آرائش کدہ بن کر رہ گئی، وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہئے۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب تحقیق وتنقید کا کام بڑی حسن وخوبی اور فکر وخیال کے ساتھ کرتے ہیں جس کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب تحقیق وتنقید میں اپنا منفرد مقام بنالیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ منظوم داستانیں ایک اہم تنقیدی کارنامہ ہے جو اُن کی محنت وکاوش سے ایک تحقیقی تصنیف ثابت ہوئی جو اردو ادب کے مورخوں خاص کر منظوم داستانوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس موضوع سے سیراب کر رہی ہے اور لوگ اس سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

میر انیسؔ حیات اور شاعری

میر انیسؔ حیات اور شاعری ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری میر انیسؔ کی مرثیے کی تحقیق وتلاش کے بعد ان ماخذوں وحوالوں کو تحقیق کی چھلنی میں چھان کر قارئین کے سامنے اس طرح پیش کر دیا ہے کہ ان کے استفادے کی راہ ہموار ہو جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "میر انیسؔ۔ حیات اور شاعری" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی حالانکہ یہ کتاب ۱۹۷۱ء کے اوائل میں مکمل ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی انیس شناسی کی یوں داد دی ہے:

"اردو شعر وادب کے محققوں اور تنقید نگاروں میں فرمان صاحب کی شخصیت اسی قسم کے امتیازات سے عبارت ہے انہوں نے ہم عصر آوازوں کی بازگشت میں، مرثیے کی تحقیق وتنقید کی ایک الگ راہ تراشی ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنی کتاب "میر انیسؔ حیات وشاعری" میں کتاب سے پہلے میں لکھتے ہیں:

۱۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ از رشید حسن خاں ص: ۱۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۳۲۷

''میر انیسؔ اردو شاعری کے تاریخ میں ایک نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کا شمار'' بگڑا شاعر مرثیہ گو' کے زمرے میں نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے اپنی ذات وصفات سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ایک مرثیہ نگار بھی عظیم شاعر ہوسکتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ میر انیسؔ کو صرف ''مجالس عزا'' اور عشرۂ محرم کا شاعر بنا کر رکھ دیا حالانکہ ان کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ مختلف اصناف پر شاعرانہ عبور رکھتے تھے۔

فرمان صاحب کی یہ کتاب نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں میر انیسؔ کے خاندانی اور ذاتی حالات ہیں جن میں ان کی پیدائش، تاریخ وفات، شجرۂ نسب، لکھنؤ میں انیسؔ کی پہلی آمد اور اس وقت ان کی عمر کا تعین، پہلی مجلس، لکھنؤ سے باہر ان کی مجلس میں شرکت وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے دوسرے باب میں مرثیے کا مفہوم، موضوع اور اجزاء و کردار کی تفصیل ہے۔ تیسرے باب میں میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کے پس منظر اور نوعیت و جامعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم میں مراثی انیسؔ اور محاسن زبان و بیان اور باب پنجم میں مراثی انیس بلحاظ موضوع اور معنوی خصوصیت، مناظر کی تصویر کشی، واقعہ نگاری، جذبات کی عکاسی کردار نگاری، سماجی و معاشرتی زندگی کی ترجمانی میر انیسؔ و دبیرؔ کے بارے میں مختلف ناقدین کی آراء کا جائزہ لے کر دونوں کے امتیازات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ باب ششم میں غزل اور سلام کی روشنی میں میر انیسؔ کا تغزل زیر بحث لایا ہے۔ باب ہفتم میں میر انیسؔ کو بحیثیت رُباعی نگار پیش کیا گیا ہے۔ باب ہشتم میں میر انیسؔ کو تذکروں کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور آخر میں میر انیسؔ کے اولین نقاد کے عنوان سے میر انیسؔ کے بارے میں چند بنیادی ماخذوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

فرمان صاحب کی یہ کتاب اپنے آپ میں ایک انفرادی مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب میں مرثیوں کے محاسن و اکثر ماخذوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

مراثی و مجالس، تاریخ ولادت، وفات اور ماخذوں وغیرہ کے اختلاف رائے کے متعلق تحقیقی بحث کی گئی ہے۔ فرمان صاحب اس کتاب میں انیسؔ کے متعلق لکھنؤ جانے اور انیسؔ تخلص رکھنے کے متعلق اپنے تحقیقی،

۱۔ میر انیسؔ حیات و شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء ص:۱۱

تنقیدی نظریے کو پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میر انیسؔ کے اولین سوانح نگار حکیم امجد علی اشہری جن کی کتاب ''حیاتِ انیسؔ'' کا حوالہ امیر علوی سے لے کر سفارش حسین رضوی تک سبھی نے دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''میر انیسؔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں لکھنؤ گئے میر خلیقؔ نے بیٹے کا تخلص انیس رکھا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔'' میر انیس کم از کم چالیس سال کی عمر میں فیض آباد سے مستقلاً لکھنؤ منتقل ہوئے ان کا تخلص، میر خلیق نے نہیں، ناسخؔ نے تجویز کیا تھا۔ اس طرح کی اور کتنی باتیں ہیں جنہیں میر انیسؔ کے سوانح نگار بغیر کسی ماخوذ اور حوالے کے آج تک نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔''(۱)

زیرِ نظر اس کتاب میں فرمان صاحب نے مرثیہ کے ان تمام ماخوذوں اور حوالوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جو انیس شناس کے متعلق یہ کتاب ادبی مورخ کے لئے ایک راہ ہموار کرے گی۔ اسی سلسلے میں نگار پاکستان کا میر انیسؔ نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۱ء کا ہے جس میں مولانا شبلی، نوبت رائے نظر، پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر حامد حسن قادری، جعفر علی خاں اثرؔ، ڈاکٹر احسن فاروقی، احتشام حسین، پروفیسر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید محمد عقیل، ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر صفدر حسین کی اہم نگارشات کو یکجا کیا ہے۔ اس نمبر میں فرمان صاحب کا بھی ایک تازہ مضمون ''میر انیسؔ کے اولین نقاد'' شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب اس نمبر کے ملاحظات میں میر انیس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میر انیسؔ سے بے اعتنائی کا سبب کچھ بھی ہو لیکن اس میں عام و خاص سبھی شریک ہیں اور ادارہ نگار بھی خود کو اس سے علیحدہ سمجھتا، تاہم یہ بات ہمارے لئے اطمینان کا سبب ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں میر انیسؔ پر جتنے قیمتی مقالات نگار میں شائع ہوئے ہیں کسی اور ادبی پرچے میں شائع نہیں ہوئے نگار کی تاریخ اجراء فروری ۱۹۲۲ء سے لے کر زیر نظر سالنامے تک مرثیہ

۱۔ میر انیسؔ حیات و شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء ص: ۱۵

اور مرثیہ کے ممتاز ترین شاعر، میر انیسؔ کے بارے میں سیکڑوں مضامین نگار میں شائع ہوئے ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نگار کے سالنامے میں میر انیسؔ کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"شاعری اسلوب کی دلکشی کے باوجود ایک طرح کے جنسی چٹخارے، مافوق الفطرت عناصر کے طلسم، نفس کی گمراہی، اخلاق کی تخریب، بے غیرتی و خوشامد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اس کے برعکس میر انیسؔ کا اسلوب مرثیے کے موضوع کے زیر اثر اتنا پاکیزہ ہے کہ اس کی دلکشی لطف سخن کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔"(۲)

میر انیسؔ کی شاعری میں اسلوب کی جامعیت لفظ و معنی کی شاعرانہ اسلوب و انفرادیت کی اہم خصوصیت سمائی ہوئی ہے۔

میر انیسؔ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس وقت ان کے گھر کی فضا بھی شاعرانہ تھی۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ میر انیسؔ کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا۔ آبِ حیات میں لکھتے ہیں:

"ابتداء میں انہیں بھی غزل کا شوق تھا ایک موقع پر کہیں مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ نے خبر سن کر دل میں باغ باغ ہوا۔ مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کل کہاں گئے تھے۔ انہوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی اور فرمایا کہ بھائی اب غزل کو سلام کرو اس شغل میں زورِ طبع کو صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ بیٹے نے اسی دن سے ادھر سے قطع نظر کی۔"(۳)

اس کی تائید فرمان فتح پوری نے بھی کیا ہے کہ انیسؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا تھا ان کا لب و لہجہ بالکل دہلویت جیسا ہے۔ اس سلسلے میں فرمان فتح پوری نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے انیسؔ کی دو

۱۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۷۱ء میر انیسؔ نمبر ص: ۱۹

۲۔ نگار پاکستان اکتوبر ۱۹۷۱ء میر انیسؔ نمبر ص: ۲۱

۳۔ آب حیات محمد حسین آزاد۔ ص: ۵۳۰

غزلوں کو چھان بین کے بعد ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

شہیدِ عشق ہوئے قیس نامور کی طرح	جہاں میں عیب بھی ہم نے ہنر کی طرح
کچھ شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح	ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ	کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یا رب	چھپا مجھے صدفِ قبر میں گہر کی طرح
تجھ ہی کو دیکھوں گا جب تک برقرار آنکھیں	مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح
انیسؔ یوں ہوا حالِ جوانی و پیری	بڑے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

ان چند غزلوں اور شعروں کے کہنے کے بعد میر انیسؔ شفیق باپ کے کہنے پر غزل کو خیرباد کہہ کر سلام اور مرثیہ کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ میر انیسؔ کا سلام غزل قرار پایا۔ میر انیسؔ نے حضرت امام حسین اور ان کے اعزا اور رفقاء کی قربانیوں کو اپنے شاعرانہ کمالِ فن سے کربلا کے دل دوز واقعات کو سلام میں بیان کر دیا۔

سلام کے متعلق مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسامِ سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بناء پر انہوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحریں بھی وہی غزل کی ہوتی ہیں جو غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی بندش سادہ اور صاف۔ مضمون دردانگیز اور پرتاثیر ہو۔ میر انیسؔ کے سلاموں میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔'' (۱)

میر انیسؔ کے ہر ایک شعر میں حسن آفرینی اور زبان کی جادوگری نظر آتی ہے وہ واقعاتِ کربلا کو جگہ جگہ نظم کرتے ہیں مگر ایک بھی جگہ ان کے بیان میں تکرار نہیں پیدا ہوتا۔ مولانا شبلی نے موازنہ انیسؔ و دبیر میں

۱۔ موازنہ انیسؔ و دبیر از علامہ شبلی مطبوعہ آگرہ۔ ۱۹۰۷ء ص: ۲۲۱

میر انیسؔ کے زبان و بیان پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''میر انیسؔ کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انہوں نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجے کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے تاہم ان کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ بہت کم پائے جاتے ہیں۔ میر انیسؔ کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح تر الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔''(۱)

نگار پاکستان انیس نمبر میں پروفیسر کلیم الدین احمد میر انیسؔ کی زبان کے متعلق لکھتے ہیں:

''انیسؔ کی زبان صاف اور دلکش ہے اس کی سلاست اس کی فصاحت و بلاغت مثل روز روشن ہے۔ زبان میں روانی و آبداری برش ذوالفقار کی سی ہے۔ اثر میں تیر و نشتر سے کم نہیں تنوع بھی بہت ہے کبھی سخت درشت ہو جاتی ہے تو کہیں نرم و ملائم کبھی نالا بھی ہے اور کبھی پر جوش آہنگ مختلف اشخاص کی گفتگو کا الگ الگ رنگ ہے لب و لہجہ کا فرق آغاز کی بلند آہنگی و آہستہ روی سمندر کی سی طغیانی اور سکون سب کچھ موجود ہے اس میں شیرینی بھی ہے اور موسیقیت بھی اور پھر شگفتگی و شادابی بھی۔''(۲)

میر انیسؔ کی زبان میں سادگی و صفائی تشبیہات و استعارات سے ان کا کلام پُر ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ، محاورہ، تشبیہ، استعارہ وغیرہ کا ایسا مصرف شامل ہے جس میں میر انیس ہر موقع کے لئے فصیح سے فصیح اور بہتر سے بہتر الفاظ کا استعمال کیا ہے ان کا انتخاب الفاظ بے مثل ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک شعر ہے۔ ؎

۱۔ میر انیسؔ حیات و شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء ص: ۸۵

۲۔ نگار پاکستان ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۱ء میر انیسؔ نمبر ص: ۳۶

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　　　تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی یہی انیسؔ کے انتخاب الفاظ کی خصوصیت ہے مرثیہ کے بارے میں ڈاکٹر فرمان صاحب کہتے ہیں:

''ہماری شاعری کی اصلاح میں مرثیہ صرف ایسی نظم کو کہتے ہیں جو شہدائے کربلا اور ان کے واقعات و تاثرات کے ذکر و افکار پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان خاص معنوں میں مرثیہ کسی زبان میں نہیں پایا جاتا۔''(۱)

میر انیسؔ کے مرثیوں میں مثنوی، قصیدہ، غزل کے علاوہ سلام مکالمہ نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری کے تمام پہلوؤں کو اپنے اشعار میں سمیٹے نظر آتے ہیں۔ میر انیسؔ نے مرثیہ نگاری میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔

میر انیسؔ نے مرثیہ کے علاوہ رُباعی بھی کہی ہیں۔ میر انیسؔ کے اندر مرثیہ کے علاوہ رباعی بھی کہنے کی صلاحیت موجود تھی۔ میر انیسؔ سے پہلے رباعی کا دائرہ تصوف اور عشقیہ مضامین تک محدود تھا۔ انیسؔ نے اس دائرے کو واقعات کربلا کے موثرات کو داخل کر کے بہت وسیع اور اہم بنا دیا۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''میر انیسؔ لکھنوی نے مرثیہ کے ساتھ ساتھ رباعی کو بھی اپنی فنکاری سے وہ بلند مقام عطا کر دیا کہ وہی رباعی جو اس سے پہلے کسی قطار شمار میں نہ تھی اردو کی ایک مقبول صنف سخن اور عام و خاص سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔''(۲)

اردو رباعی کو میر انیسؔ نے خاص و عام سبھی میں مقبولیت کا سبب بنایا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جب میر انیسؔ مرثیہ پڑھتے اس سے پہلے رباعی کے چار مصرعے ضرور پڑھتے یہی خوبی میر انیسؔ کو اردو رباعی کی تاریخ میں منفرد بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے باب ہشتم میں ان تمام تذکرہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جو میر انیسؔ کے تاریخ ولادت و تاریخ وفات اور خاندانی حالات اوائل عمری سے مشاعروں اور مجلسوں میں شرکت کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ میر انیسؔ حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۶ء ص: ۱۸۷

۲۔ میر انیسؔ حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۶ء ص: ۱۸۸

حیات انیس مؤلفہ اشہری اور واقعات انیس مؤلفہ سید مہدی حسن احسن نے اپنے تذکروں میں میر انیسؔ کے مشق سخن کی مدت پچپن چھپن سال بتائی ہے۔ سید محسن علی محسن کا ''سراپا سخن'' اس تذکرے میں میر انیسؔ کا ذکر نہیں ہے بلکہ مونس اور انس کے تراجم شامل ہیں۔

فرمان صاحب نے میر انیسؔ کے اولین نقاد میں محمد حسین آزاد، شبلی اور مولانا الطاف حسین حالیؔ کے مفکرانہ تنقید کا ذکر کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' اردو تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب میر انیسؔ کے اولین نقاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میر انیسؔ کے معاصر نقادوں میں پہلا معتبر نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ آزاد نے میر انیسؔ کا ذکر ''آب حیات'' مؤلفہ ۱۸۸۰ء کے دوسرے ایڈیشن کے آخری صفحات میں کیا ہے۔ یہ ذکر چھ سات صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور میر انیسؔ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں خاصہ اہم ہے۔ آزاد نے اس میں میر انیسؔ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں خاصہ اہم ہے۔ آزاد نے اس میں میر انیسؔ کی تعلیم و تربیت، آغاز شاعری ان کے عہد کی مرثیہ نگاری، لکھنؤ کی شاعرانہ فضا، اس فضا کی معاصرانہ چشمک و ادبی معرکہ مجالس عزا کی کیفیت مرثیہ خوانی کی مقبولیت اور مرثیہ نگاری عروج و زوال سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔''(۱)

محمد حسین آزاد نے انیسؔ و دبیرؔ کے زبان و مکالمہ کو مناظرہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> ''مولانا حالیؔ نے آزاد اور شبلی کی طرح کلام انیسؔ کے لفظی یا معنوی محاسن کا جائزہ تفصیل سے نہیں لیا بلکہ انیسؔ کی خصوصیات شاعرانہ پر اجمالی تبصرہ کر دیا۔''(۲)

۱۔ میر انیسؔ حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۶ء ص:۲۲۵

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ وحید قریشی مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۳ء ص:۲۶۶

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''بہر حال ہم میر انیسؔ کے مرثیہ کی اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کی دل سے داد دیتے ہیں۔ لیکن نئے ذہن کے شاعروں کو ہرگز یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں ان کا یا اور مرثیہ گویوں کا اتباع کرے۔''(۱)

مولانا حالی نے قصیدے اور مرثیے کا فرق یوں بیان کیا ہے:

''فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں:''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب مرثیے اور قصیدے کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فرق صرف اتنا ہے کہ قصیدے میں زندوں کی اور مرثیے میں شہیدوں کی تعریف کی جاتی ہے۔''(۳)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''حالؔی سے لے کر آج تک ہر محقق اور ناقد نے مرثیے کو مُردوں کی تعریف کہا ہے۔ فرمان صاحب پہلے ناقد ہیں۔ جنہوں نے مرثیے کو شہیدوں کی تعریف قرار دیا۔ حالؔی اور دوسرے ناقدوں نے مرثیے کو مردوں کی تعریف کہہ کر ان جذبات کی نمائندگی کی ہے۔ جن سے قنوطیت کا تاثر پیدا ہوتا ہے لیکن فرمان صاحب نے مرثیے کو شہیدوں کی تعریف کہہ کر اس کا رشتہ ان قرآنی آیات سے جوڑ دیا ہے جن میں شہیدوں کو مُردہ نہیں زندہ کہا گیا ہے اور یوں ان کے نزدیک مرثیہ بھی ان زندوں ہی کی تعریف ہے جن کے ساتھ ساتھ

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ وحید قریشی مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۳ء ص: ۲۷۲

۲۔ میر انیسؔ حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۶ء ص: ۲۶۲

۳۔ میر انیسؔ حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۶ء ص: ۲۶۲

> سچائی سرفروشی، بیداری باضمیری، حریت، صداقت اور علم ویقین کی طاقتیں بھی ہر دور میں محو سفر رہتی ہیں۔"(۱)

میر انیس کے اہم ناقدوں میں آزاد، حالی شبلی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری موازنہ انیس و دبیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "موازنہ انیس و دبیر جسے مولانا شبلی نے حیدر آباد کے قیام میں وہاں کی مجالس عزا اور محافل شعر سخن سے متاثر ہوکر مرتب کیا تھا۔ میر انیس پر پہلی جامع کتاب ہے اور اپنے تکمیلہ کے فوراً بعد مطبع مفید عام آگرہ سے سلسلہ آصفیہ کے تحت ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔"(۲)

شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کی اشاعت کے بعد میر انیس کو ہر خاص و عام میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی، میر انیس کو ایک عظیم شاعر تسلیم کیا جانے لگا۔ میر انیس کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف میر انیس حیات اور شاعری خاص اہمیت رکھتی ہے۔

فرمان صاحب اپنی کتاب میں ان تمام حوالوں اور ماخذوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ میر انیس کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب کافی ہے۔

قمر زمانی بیگم

قمر زمانی بیگم ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک تحقیقی کاوش ہے جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی ادارت میں نگار پاکستان کا خاص نمبر "قمر زمانی نمبر" جنوری فروری ۱۹۷۹ء میں شائع کیا تھا اس کے بعد قمر زمانی بیگم کے نام سے کتابی شکل میں اسی سال کراچی سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں قمر زمانی بیگم کی ادبی زندگی کا آغاز و پس منظر اور مدیر 'نقاد' کی داستان معاشقہ اور مدیر نقاد کی زندگی پر ایک نظر شامل ہے۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> "قمر زمانی بیگم کے یہ خطوط جن کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۳۵۴

۲۔ میر انیس حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۶ء ص: ۲۳۵

علامہ نیاز فتح پوری مرحوم کے یار غار ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی مرحوم کے پاس محفوظ تھے۔ نیاز صاحب کراچی آئے تو ہاشمی صاحب نے یہ خطوط نیاز صاحب کے حوالے کئے۔ میں نے نیاز صاحب سے اصرار کیا کہ وہ خطوط کو شائع کردیں۔ چنانچہ وہ اس پر رضامند ہوگئے اور اکتوبر ۱۹۶۳ء کے نگار میں قمر زمانی کی نقاب کشائی کا اشتہار شائع کردیا۔" (۱)

قمر زمانی بیگم اور دلگیر اس داستان کے مرکزی کردار ہیں یہ داستان خط و کتابت کے ذریعے کب اور کیسے شروع ہوئی یہ خط کہاں سے اور کس طرح پوسٹ ہوتے تھے۔ قمر زمانی بیگم اور دلگیر کی ملاقات پردے کی آڑ میں کیسے ہوئی ایک دلچسپ منظر پیش کیا ہے۔ ایک خط کے جواب میں شاہ دلگیر قمر زمانی سے ملنے دہلی روانہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"نیاز صاحب اور ان کے حلقہ احباب کو جب یہ معلوم ہوا کہ دلگیر صاحب واقعی تشریف لائے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوا کہ قمر زمانی کہاں سے پیدا کی جائے۔ آخر کار اس کے لئے بھی ایک صورت نکالی گئی۔ ضیاء عباس ہاشمی کے عزیزوں میں محمد احمد چھریرے بدن کے خوبصورت نوجوان تھے۔ اور زنانہ لباس میں انہیں شناخت کرلینا آسان نہ تھا۔ چنانچہ محمد احمد صاحب کو قمر زمانی کے روپ میں دلگیر صاحب سے ملنے کے لئے بھیجا گیا۔ محمد احمد نے اس ڈر سے کہ کہیں راز فاش نہ ہوجائے اپنے چہرے سے نقاب نہ اٹھایا۔ پردے ہی سے بات چیت کرتے رہے۔ دلگیر نے نقاب الٹ دینے پر اصرار کیا لیکن قمر زمانی تیار نہ ہوئیں۔ اس کا دلگیر کی طبیعت پر کچھ ناخوشگوار اثر ہوا۔ اور وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر چلے گئے۔" (۲)

۱۔ قمر زمانی بیگم از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۹ء ص:۹

۲۔ قمر زمانی بیگم از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۹ء ص:۲۴

شاہ دلگیر اور قمر زمانی بیگم کی معاشقہ مسلسل خط و کتابت کے ذریعہ چلتا رہا۔ شاہ دلگیر کو قمر زمانی کے عورت ہونے کا پورا یقین تھا۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اس کے بارے میں لکھا:

''یہ نیاز فتح پوری کی ایک انوکھی داستانِ معاشقہ ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری تاریخ ادب میں اپنی نوعیت کا پہلا رومان ہے۔'' اسے اگر فرمان صاحب کا تحقیقی کارنامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب میں انہوں نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد قمر زمانی بیگم کے حالات جمع کئے ہیں اور ان کی ادبی زندگی کا آغاز پس منظر بیان کیا ہے اور وہ تمام خطوط سلسلہ وار ترتیب دیئے ہیں جو قمر زمانی بیگم مدیر ''نقاد'' شاہ دلگیر کو اسی صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں ایک عرصے تک لکھتی رہی تھیں۔ قمر زمانی بیگم اور شاہ دلگیر کے درمیان یہی خط و کتابت ایک عشقیہ داستان بن گئی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے:

''قمر زمانی بیگم کے روپ میں نیاز فتح پوری کے یہی مکتوبات اور ان کے جواب میں دلگیر کے یہی خطوط اس وقت میرے سامنے ہیں اور قمر زمانی بیگم و شاہ دلگیر کی عشقیہ داستان کا مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ خطوط ادبی لحاظ سے حد درجہ دلچسپ ہیں اور بیشتر نیاز کی تخلیق ہونے کے سبب اردو ادب و صحافت کی تاریخ میں ایک نایاب اور انمول خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔''(۲)

دلگیر صاحب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''شاہ نظام دلگیر آگرہ کے رہنے والے تھے۔ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کے اوائل میں ''نقاد'' کے نام سے ادبی ماہنامہ جاری کیا اور مدیر کی

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۵۷۱، ۵۷۲

۲۔ قمر زمانی بیگم از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۹ء ص: ۱۰

حیثیت سے ادب کی تاریخ میں گہرا نقش چھوڑ گئے۔ نثر بھی لکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کے علاوہ انٹرنس تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ خوشحال اور زمیندار گھرانے کے فرد تھے۔ کئی سال انگریزی مجسٹریٹ رہے۔ ۱۹۰۸ء سے رسائل و اخبارات کے لئے مضامین و غزلیں لکھنا شروع کیا اور ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا۔ خصوصاً نقاد کے اجراء سے ان کا نام بحیثیت ادیت مستحکم ہوگیا۔"(۱)

فرمان صاحب کا یہ مضمون اور یاران نظر نگار پاکستان جنوری ۱۹۸۶ء میں بھی شائع ہوا تھا۔
نورین فردوس نے فرمان صاحب کے اس تحقیقی کارنامے کی یوں تعریف کی ہے:

"قمر زمانی بیگم" فرمان صاحب کی ایک اور تحقیقی کاوش ہے۔ قمر زمانی بیگم ان خطوط کا مجموعہ ہے جو شاہ دلگیر اور نیاز فتح پوری نے ایک دوسرے کو لکھے۔ فرمان صاحب کی اس کتاب سے پہلے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ قمر زمانی بیگم کون ہیں۔ فرمان صاحب کی اس کتاب سے پہلے مالک رام اور مجنوں گورکھپوری کے مضامین ملتے ہیں۔ جن میں قمر زمانی بیگم کا ذکر کیا گیا تھا لیکن وہ بھی ان کی شخصیت سے مکمل طور پر پردہ نہ اٹھا سکے۔ فرمان صاحب نے اس کتاب کے ذریعے یہ راز کھولا کہ نیاز فتح پوری، قمر زمانی بیگم کا روپ دھار کر شاہ دلگیر کو خط لکھتے تھے۔ فرمان صاحب نے اپنی کتاب میں قمر زمانی بیگم کی شخصیت کے بارے میں تمام معلومات فراہم کی۔ فرمان صاحب وہ سارے رسالے جمع کیے جس میں قمر زمانی بیگم کے مضامین وغیرہ موجود تھے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے قمر زمانی بیگم اور شاہ دلگیر کے درمیان جو خط و کتابت ہوتے تھے اس راز کو فاش کیا جو برسوں سے سربستہ تھا۔ قمر زمانی بیگم کی اس طرح نقاب کشائی کی کہ لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ وہ خط و کتابت جو شاہ دلگیر سے قمر زمانی بیگم کے روپ میں کرتے تھے وہ نیاز فتح پوری تھے۔ قمر زمانی بیگم کی داستاں محبت اور ان کے مکتوبات نیاز فتح پوری کے حوالے سے خاص شہرت رکھتا ہے جو اردو ادب کی تاریخ کا ایک دلچسپی باب ہے۔

۱۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۰ء، ص: ۳۸، ۳۹

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۶۳

بحیثیت مقدمہ نگار

ڈاکٹر فرمان صاحب جس طرح اردو ادب کی مختلف اصناف پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں اور اپنی تحقیقی و تنقیدی آراء سے نوازتے ہیں اسی نوعیت کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی صنف مقدمہ نگاری بھی قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر صاحب اب تک قریب ساٹھ کتابوں کے دیباچے اور مقدمے لکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مقدمہ نگاری کے باب میں ایک نئی ایجاد پیدا کرا سے ''کتاب سے پہلے'' کا نام دیا ہے ڈاکٹر صاحب اپنی تمام تصانیف میں دیباچے یا پیش لفظ کو ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے لکھا ہے۔

> ڈاکٹر صاحب کے مقدمے میں بھی تحقیقی و تنقیدی خیالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مقدمہ نگاری میں مولوی عبدالحق نے خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور مقدمہ نگاری کی روایت کو ایک نئی راہ عطا کی اور اسی راہ پر ڈاکٹر فرمان صاحب نے بھی چلنے کی کوشش کی اور کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس کامیابی کا راز مولوی عبدالحق کے اثرات و مطالعہ ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے مقدمہ نگاری پر اپنے خیالت کا اظہار کرتے ہیں۔
>
> ''مولوی عبدالحق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو مقدمہ نگاری کو ایک بلند معیار اور آبرومند مقام عطا کیا ہے اس سے پہلے اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت بہت بے جان رسمی اور پست تھی۔ مولوی صاحب نے اس کے جسم میں تازہ روح دوڑائی اور اس کی رسمی حیثیت کو ختم کر کے مستقل فن کی حیثیت دے دی۔''(۱)

آج کوئی بھی کتاب لکھی جاتی ہے اس میں مقدمہ پہلے لکھایا جاتا ہے کتاب میں مقدمے کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب ادب کے مختلف اصناف پر لکھی ہوئی کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ مقدمہ

۱۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص: ۱۴۵

نگاری پر قلم اٹھانا آسان نہیں مقدمہ نگاری کا حق اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس کتاب کے مقدمہ نگار کا اس موضوع سے گہری دلچسپی ہو اور اس کا مطالعہ وسیع ہو۔

اردو کی مشہور ناول ''امراؤ جان ادا'' کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ لکھا ہے جو قریب پچاس صفحات میں ہے یہ مقدمہ مقالے کی صورت میں ہے اس میں اپنی تفصیلی رائے کا اظہار کیا ہے جس میں شواہد و حوالے اور ناول کے تاریخی پس منظر کا جائزہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب کے مقدمات بلند پایہ تحقیقی حیثیت کے ہوتے ہیں ڈاکٹر فرمان صاحب نے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی کتاب ''تقابلی جائزے'' کا مقدمہ لکھا ہے۔ یہ کتاب دو ہم عصروں یا مختلف زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کے تقابلی مطالعے پر مبنی ہے۔ڈاکٹر فرمان صاحب مقدمے میں پہلے مصنف کا تعارف کراتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''عبدالعلیم صدیقی اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ وہ پیشاور یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے استاد ہیں، بیرونی ممالک سے بھی انہوں نے ادبیات کے سلسلے کی بعض اسناد حاصل کی ہیں۔مختلف زبانوں کے ادب سے گہرا لگاؤ ہے اور اس لگاؤ کے وسیلے سے وہ محض زبان کے معلم ہی نہیں بلکہ تخلیقی و تنقیدی ادب کے باشعور ناقد بھی ہیں۔''(۱)

تعارف کرانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کتاب پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ان کا خیال ہے:

> ''آج کی تنقید اپنے نقاد سے گہرے سماجی شعور اور وسیع مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے سماجی شعور اور مطالعہ جتنا ہمہ گیر و پختہ ہوگا اور دنیا کی مختلف زبانوں سے جتنا ہم رشتہ ہوگا اسی نسبت سے تنقید کی سطح پر فکر انگیز اور سخن شناسی کی رنگا رنگ تہیں نمودار ہوگی۔''(۲)

اور آخر میں ڈاکٹر صاحب اپنی رائے قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔تقابلی جائزے از عبدالعلیم صدیقی مطبوعہ پیشاور ۱۹۹۰ء ص:۶
۲۔تقابلی جائزے از عبدالعلیم صدیقی مطبوعہ پشاور ۱۹۹۰ء ص:۶

''علیم صدیقی کے تنقیدی مضامین کا زیر نظر مجموعہ اس اعتبار سے خصوصاً قابل توجہ ہے کہ اس میں تقابلی مطالعات کی مدد سے انگریزی اور اردو کے بعض اہم موضوعات و شخصیات کو نہایت دلچسپ اور پرکار انداز میں اجاگر کیا ہے۔''(۱)

پروفیسر عرش صدیقی کی کتاب ''شعور، سائنسی شعور اور ہم'' اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''تخیل وشعور کی ہم دستی وہم آہنگی جو غالبؔ کے یہاں منتشر صورت میں ملتی ہے۔ علامہ اقبالؔ کے یہاں اس طرح منظم و مربوط ہوگئی ہے کہ ارادہ و عمل کی دنیا بھی اس کی دسترس میں آ گئی ہے۔''(۲)

مزید لکھتے ہیں:

''اقبالؔ نے عشق کو یقیناً اپنے فلسفہ حیات میں سب سے طاقتور و عنصر و محرک قرار دیا ہے اور خودی کی تعمیر وقوت تسخیر میں اسے اول و آخر رہنما بنایا ہے۔ لیکن اقبالؔ کا عشق کسی اضطراری کیفیت کا نام نہیں بلکہ عقل وشعور کی ترقی یافتہ صورت ہی کا نام ہے۔''(۳)

''عجائب فرنگ'' کے سفر نامے کے مقدمے میں ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنا زاویہ نظر بھی پیش کیا ہے اور سفر نامے کے متعلق مقدمے میں لکھتے ہیں:

''جو شخص سفر کرتا ہے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے اس کے مشاہدے اور تجربے میں ضرور کچھ ایسی باتیں ہیں جو دریافت وانکشاف یا تازہ اطلاعات و معلومات کا درجہ رکھتی ہیں اور جس جگہ سے یہ شخص پہونچتا ہے اس

۱۔ تقابلی جائزے از عبدالعلیم صدیقی مطبوعہ پیشاور ۱۹۹۰ء ص: ۷

۲۔ شعور اور سائنسی شعور۔ از پروفیسر عرش صدیقی مطبوعہ کراچی ص: ۴

۳۔ شعور اور سائنسی شعور۔ از پروفیسر عرش صدیقی مطبوعہ کراچی ص: ۴

جگہ سے وہ کسی نہ کسی نہج سے ضرور ایک نیا رشتہ استوار کر لیتا ہے یہ رشتہ بظاہر ذاتی ہوتا ہے لیکن جس جگہ سے آدمی سفر کر کے گیا تھا اور جہاں واپس آیا ہے اگر اسے بھی نظر میں رکھیں تو ماننا پڑے گا کہ اس کے انفرادی تجربے میں جلد یا بدیر بہت سے دوسرے لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ آخر یہی شرکت، دو اجنبی قوموں اور ملکوں کے درمیان علم و ادب اور تہذیب و ثقافت سے لے کر صنعت و تجارت اور حکومت و سیاست تک سب کے لئے ایک ایسے اشتراک و اتحاد کی بنیاد بن جاتی ہے جو آئندہ کئی نسلوں تک کے لئے ناآشنا و اجنبی طبقوں کے درمیان خیر سگالی کے جذبات و تعلقات کی استواری کا وسیلہ بن جاتی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے مقدمے میں سفر کی سہولتیں اور پریشانیوں کی افادیت کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں کتاب کے مرتب کو داد دیا ہے۔

محبوب مہتاب کے افسانے کا مجموعہ "پل صراط" کے مقدمے میں ڈاکٹر فرمان صاحب محبوب مہتاب کی فنکاری کے متعلق قلمطراز ہیں:

"فنکار خلوص کے بیج بوتا ہوا پیار کی فصل کاشت کرتا ہے اور جب یہ فصل کسی عورت کے نازک ہاتھوں سے کاشت ہو تو عورت جسے مجسم نور الٰہی نغمہ اور کائنات کا حسین ترین مظہر کہا گیا ہے تو پھر نفرتیں اپنا اعتبار کھو دیتی ہیں۔ فنکاروں میں ایک ایسا ہی نام ماہتاب محبوب کا ہے۔"(۲)

آگے چل کر مجموعہ "پل صراط" کے متعلق لکھتے ہیں:

"ماہتاب کے افسانوں کا مجموعہ ایسے محبت بھرے لب و لہجہ کا غماز ہے جس میں زندگی کے تلخ حقائق کے خلاف احتجاج بھی ملتا ہے اور اسے خوشگوار بنا

۱۔ عجائب فرنگ مرتب ڈاکٹر مظفر عباس کراچی ۱۹۸۹ء ص: ۱۳

۲۔ افسانوی مجموعہ پل صراط محبوب ماہتاب۔ پشاور ۱۹۷۱ء ص: ۷

دینے کی تمنا بھی۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب ماہتاب کے افسانوں کے اسلوب نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ماہتاب محبوب نے اپنے افسانے کی زندہ اور حقیقی کرداروں کولفظوں کے مصنوعی خول میں بند نہیں کیا۔ تصنع اور بناوٹ کی پٹاری میں حقیقتوں کو مسخ نہیں ہونے دیا بلکہ انہیں جیسے اور جس انداز میں محسوس کیا اس طرح بیان کر دیا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر صاحب جس کسی پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورے طور پر حق بھی ادا کر دیتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب اپنے اس مقدمے میں مصنف اور اس کی فنکارانہ صلاحیت و معاشرتی زندگی کو اپنے مقدمے میں اجاگر کیا ہے۔

امین نون کی خودنوشت کتاب ''بازگشت'' کے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے ایک عام کتاب کی اہمیت اور اس کی رفاقت پر گفتگو کی ہے۔اس گفتگو کی چند سطور ملاحظہ ہو:

''کہا جاتا ہے کہ آدمیوں کی طرح کتابیں بھی آدمیون کی رفیق ہوتی ہیں۔لیکن کتابوں کی رفاقت اور آدمیوں کی رفاقت میں فرق ہے۔آدمی کے روپ میں یقیناً بعض اوقات بہت اچھے رفیق مل جاتے ہیں لیکن موت کا ایک بے رحم فرشتہ جلد یا بدیر بہر حال انہیں ہم سے چھین لیتا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''آدمی کو کتابوں کی سی رفاقت و دلنوازی کسی اور ذریعے سے میسر نہیں آسکتی کتابیں اچھے وقت کی ہی نہیں برے وقت کی بھی ساتھی ہیں۔ یاس ناامیدی کی بھیانک راتوں میں جب آنکھوں کی نیند اڑ جاتی ہے وہ ہمیں تنہا

۱۔افسانوی مجموعہ پل صراط محبوب ماہتاب۔پشاور ۱۹۷۱ء ص:۷

۲۔افسانوی مجموعہ پل صراط محبو ماہتاب۔پشاور ۱۹۷۱ء ص:۷

۳۔بازگشت خودنوشت مصنف امین نون مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء ص:۵

نہیں چھوڑتی نفس نفس، نظر نظر ساتھ رہتی ہیں۔ امیدوں کے دیئے جلائے رکھتی ہیں۔ تنہائیوں میں جب کوئی ہمارا دم ساز و ہم کلام نہیں ہوتا وہ ہماری آواز پر آواز دیتی ہے ہمارے دل کی دھڑکنوں کو سنتی ہیں، ہمارے ساتھ روتی اور ہنستی ہیں۔ خلوت اور جلوت اور ناگوار کو گوار بناتی ہیں۔ مصیبت کی گھڑیوں کو خوش آئندہ لمحوں میں بدل دیتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہمارے جذبات کی کیتھارسیس کا سامان فراہم کرتی ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب اس کتاب کے مقدمے میں مصنف اوران کی خود نوشت سوانح عمریوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اوران کے اسلوب کی انفرادیت کی داد بھی دی ہے۔ جہاں ڈاکٹر صاحب کے مقدمے تاریخ، تحقیق و تنقید، سفرنامہ، خودنوشت، افسانہ، ڈرامہ ناول اور شعری مجموعوں کے مقدمے بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو شاعری سے فطری لگاؤ ہے اور وہ اپنے اس ذوق سے دور نہیں رہ پاتے ان کی شاعرانہ ذوق کا اندازہ ان شعری مجموعوں کے مقدمے کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ شاعر لکھنوی کے شعری مجموعے ''زخم ہند'' اور سید محمد جعفری کے کلام ''شوخیٔ تحریر'' کے مقدمے میں وہ صرف شاعر کا تعارف نہیں بلکہ شعر کے حوالے سے اس کے تنقید کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اردو ادب کے مختلف موضوعات پر مقدمات لکھے ہیں۔ تحقیقی وتنقیدی نظریے کی طرح ڈاکٹر صاحب مقدمہ لکھتے وقت بھی مصنف و مرتب اور کتاب کے احوال بیان کرنے کے بعد آخر میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں ان میں تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں اور داد و تحسین سے بھی نوازتے ہیں اور کچھ کتابوں کے مقدمے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اخلاقاً مجبوراً قلم اٹھائے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مقدمے لکھتے وقت روزمرہ اور سادہ رواں عام بول چال کی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ مقدمہ نگاری میں ڈاکٹر صاحب مولوی عبدالحق کی تحریروں کے قریب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کی مقدمہ نگاری میں جہاں مولوی عبدالحق کے مقدمہ نگاری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہی ان کی تحریروں میں میرؔ کی سادگی اور عام بول چال کی زبان کا استعمال اور نیاز فتح پوری کے انداز تحریر کے اثرات بھی قبول کئے ہیں۔

۱۔ بازگشت خودنوشت مصنف امین نون مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء ص: ۵

بحیثیت تذکرہ نگار

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم ترین تصنیف ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف پر جامعہ کراچی نے ان کو ڈی لٹ کی سند تضویض کی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب سے پہلے اسی موضوع پر سید عبداللہ نے ''شعراء اردو کے تذکرے'' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے بعد ''نگار پاکستان'' ۱۹۶۴ء کا سالنامہ ''تذکروں کا تذکرہ نمبر شائع ہوا جسے فرمان فتح پوری نے مرتب کیا تھا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ''نگار پاکستان'' کے سالنامے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''چونکہ میری زندگی بھی تحقیق کی دشت نوردی میں گذری ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ یہ کام کیسا مشکل تھا۔ جو وسائل اور حالات تھے ان میں جوئے شیر لانا اتنا مشکل نہ تھا جتنا تذکروں پر اتنا شاندار نمبر مرتب کرنا ہندوستان کی بیشتر لائبریریوں میں۔ یہ تمام تذکرے موجود ہیں اگر فرمان صاحب ہندوستان میں ہوتے تو یہ کام بہت زیادہ مشکل نہ ہوتا لیکن پاکستان میں اس وقت تک لائبریریوں میں یہ تمام تذکرے موجود نہیں تھے۔ ان کے علاوہ تلاش و جستجو اور بھاگ دوڑ جان لیوا تھا۔ نگار کا یہ سالنامہ بڑے طمطراق سے شائع ہوا اور ہندوستان اور پاکستان کے محققین، ادیبوں اور علم و ادب کے متوالوں نے اس غیر معمولی عظیم الشان کارنامے کی زبردست پذیرائی کی اور کئی یونیورسٹیوں نے اسے ایم اے کے نصاب میں شامل کرلیا۔''(۱)

نگار پاکستان ۱۹۶۴ء کا سالنامہ تذکروں کا تذکرہ نمبر کی اشاعت نے اردو تذکروں کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ فرمان صاحب آگے چل کر اسی موضوع پر ایک کتاب ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' پر لکھی جو کافی مقبول و معروف ہوئی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اس کتاب کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۴۱، ۲۴۲

ہیں:

''اس موضوع پر بلاشبہ اب تک سب سے دقیع اور جامع کام ہے اس میں تذکرہ نگاری کے ارتقاء کا جائزہ بھی تحریر کیا گیا ہے اور آب حیات کی تصنیف تک لکھے جانے والے تقریباً تمام تذکروں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح میر کے ''نکات الشعراء'' سے ''آب حیات'' تک لکھے جانے والے سب ہی اہم اور معلوم تذکروں کے بارے میں تمام ضروری معروضی و موضوع معلومات اس تصنیف میں یکجا ہوگئی ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر محمد انصاراللہ علیگ لکھتے ہیں:

''تذکروں سے متعلق اب تک جو کتابیں سامنے آئی ہیں ان میں سب سے ضخیم اور سب سے جامع کتاب ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی ہے۔ فرمان صاحب ذاتی طور پر نہایت مختی اور نکتہ رس ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ انہوں نے نیاز فتح پوری جیسے صاحب نظر کی محبتوں سے بدرجہ احسن فیض اٹھایا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ادبی کارنامے کی بھرپور داد دیتے ہوئے لکھا ہے:

''سات سو پچاس صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ذریعے ایک طرف تو تقریباً تمام مطبوعہ، غیر مطبوعہ تذکروں کی نشان دہی ہوگئی اور دوسری طرف یہ کتاب تحقیق کی اعلیٰ ترین اور قابل تقلید نمونہ بن گئی۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب کی یہ کتاب ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' دو (۲) ابواب پر منقسم ہے باب اول میں فارسی و اردو میں تذکرہ نگاری کے آغاز وارتقاء پر مفصل بحث ملتی ہے۔ باب دوم میں اردو شعراء کے تذکروں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں سرسٹھ تذکروں پر بحث کی گئی ہے اور ان کی

۱۔ اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش اسلام آباد ۱۹۸۸ء جلد دوم ص: ۲۶۷

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۷۴

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۲۴

تفصیلی معلومات پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں اردو شعراء کے تذکروں سے متعلق فہرست درج ہے۔ یہ کتاب ۵۳ے صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے اشاریہ پروفیسر محمد نصیر شادانی کے مرتب کئے ہوئے ہیں۔ جو جدید طرز پر ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس پر جن دیگر اصحاب نے کام کیا ہے ان کا ذکر ادب واحترام سے کرتے ہیں؛ لکھتے ہیں:

> ''تذکروں کی اس اہمیت کو ہمارے ہاں جن لوگوں نے سب سے پہلے محسوس کیا اور جن کی دلچسپیوں کے نتیجے میں ابتداء اردو تذکروں پر کچھ کام ہوا ان میں حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سید محمد ایم اے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور قاضی عبدالودود کے نام آتے ہیں۔ ان بزرگوں کا کام تقسیم ہند سے پہلے کا ہے۔''(۱)

اس کتاب کی تصنیف سے پہلے فرمان صاحب نے تقریباً چار سو صفحات کا ''نگار پاکستان'' کا سالنامہ بنام ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' مئی، جون ۱۹۶۴ء میں منظر عام پر لے آئے تھے۔ نیاز صاحب نے تعارف میں یہ لکھا تھا۔

> ''یہ فخر مجھے ضرور حاصل ہے کہ سالنامے کے موجودہ موضوع کی طرف میں نے ہی فرمان صاحب کو متوجہ کیا اور انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اس بات کو مان لیا کیونکہ خود اس موضوع پر عرصے سے غور کر رہے تھے اور کافی مواد ان کے پاس جمع تھا۔ یقیناً یہ بالکل خدا ساز بات تھی اور حسن اتفاق ہے۔''(۲)

فرمان صاحب نے اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر ہلتیر و داور شباہت علی خاں کے نام کیا ہے ان کے بارے میں پیش لفظ میں ڈاکٹر فتح پوری نے لکھا:

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۷۲ء پیش لفظ ص: ۲

۲۔ نگار پاکستان مئی جون سالنامہ ۱۹۶۴ء

''میرے عزیز دوست شباہت علی خاں اور ان کی بیگم ڈاکٹر ہلتیر ود خاں جن کے ناموں سے اس کتاب کا انتساب ہے، کئی سال بہ سلسلہ ملازمت و تعلیم و تدریس ایران میں رہے۔ دونوں کا علمی و ادبی مذاق نہایت پاکیزہ اور قابل رشک ہے۔

ڈاکٹر ہیلتیر ود جرمن نژاد ہیں۔ مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں پر مہارت رکھتی ہیں۔ شباہت علی خاں میرے عزیز ہیں۔ ہم ہیں، ہم مدرسہ ہیں، ہم عمر ہیں، ہم ذوق ہیں، ہم خیال ہیں اور لڑکپن کے ساتھی ہیں۔ ان کا لطف خاص مجھ پر یہ رہا کہ ایران میں جو کلاسیکی کتابیں شائع ہوتی رہیں وہ بغیر میری طلب کے مجھے بھیجتے رہے۔ ان میں علم عروض و معنی سے متعلق بھی کتابیں تھیں۔ دواوین بھی تھے اور تذکرے بھی تذکرے میرے لئے بالکل نئے تھے اس لئے خصوصاً میرے مطالعہ میں رہے اور مطالعہ کے نتیجے میں مجھے اس موضوع سے یک گونہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب کی اس کتاب کا پہلا باب جس کا عنوان ہے۔ ''تذکرہ نگاری کا فن اور اس کا ارتقاء'' فرمان صاحب نے سب سے پہلے ''تذکرہ نگاری کا مفہوم'' بتایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''تذکروں کی تالیف میں بیاض اور بیاض نگاری ''بیاض'' کی ترقی یافتہ صورت کا نام تذکرہ ہے۔ لغات اردو فارسی میں بھی ''تذکرہ کے دوسرے متعدد معانی کے ساتھ ساتھ ایک معنی یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ ''ایسی کتاب جس میں شعراء کا حال لکھا جائے'' گویا لغت کی رو سے اصطلاح شعر و ادب میں اشعار اور احوال شعراء سے متعلق کتاب کو تذکرہ کہتے ہیں۔''(۲)

اس کے بعد فرمان صاحب نے ''فارسی تذکروں کی قدامت'' کے بارے میں لکھا ہے اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج فارسی کے زیر اثر ہوا۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات مصنف ۱۸۸۰ء سے قبل تک اردو شعراء کے جتنے تذکرے ہیں ان میں سے اکثر فارسی زبان میں ہیں۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ فارسی میں تذکرہ نگاری

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۱۸

کا آغاز کب ہوا اس کے متعلق وثوق سے کوئی حکم لگانا مشکل ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے ''فارسی شعراء کا پہلا تذکرہ'' کا موضوع اٹھایا۔ ان کی تحقیق کے مطابق فارسی کا پہلا دستیاب تذکرہ لباب الالباب اور پہلا تذکرہ نگار محمد عوفی ہے۔

فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''خزانہ عامرہ کے مؤلف غلام علی آزاد بلگرامی اور شعرالعجم کے مصنف مولانا شبلی دونوں لباب الالباب کو اپنا ماخذ بتاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے ثانوی ذرائع سے لباب الالباب کے تعین متراجم نقل کئے ہیں اور اس سے براہ راست استفادے کا موقع انہیں نہیں ملا۔'' (تنقید شعرالعجم۔ از حافظ محمود شیرانی ص:۴ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۲ء طبع اول)(۱)

فرمان صاحب نے ۶۱۸ھ سے لے کر ۱۱۶۵ھ تک کے فارسی شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں۔ ان میں خاص اہمیت کے تذکروں کی فہرست دی ہے۔ ان تذکروں کی تعداد ۳۴ ہے۔ اس کے بعد فرمان صاحب نے فاری تذکروں کی نوعیت و اہمیت پر روشنی اختصار کے ساتھ ڈالی ہے یہی نہیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''اردو شعراء کے تذکروں کا آغاز'' پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں۔

''اٹھارہویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے طبع اول تک اردو شعراء کے جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ سب استثنائے ''گلشن ہند'' مؤلفہ مرزا علی لطف اور گلدستہ حیدری'' مؤلفہ حیدری، مؤلفہ حیدر بخش حیدری سارے کے سارے فارسی زبان میں ہیں اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور پر ۱۸۸۰ء تک برابر قائم رہتا ہے۔'' (۲)

اس کے بعد اپنی ضخیم کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ''اردو شعراء کے قدیم ترین تذکرے'' کون سے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان سوالوں کی حتمی جواب ذرا مشکل ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۱۹

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۵

''قدیم تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ اردو میں
تذکرہ نگاری کا رواج میر درد کے عہد ہی سے ہوگیا تھا اور بعض معاصرین مثلاً
محمد یار خاں خاکسار، محمد رفیع سودا، سراج الدین علی خاں آرزو اور سید امام
الدین وغیرہ نے شاید اردو شعراء کے تذکرے بھی مرتب کئے تھے لیکن چونکہ یہ
تذکرے آج تک نایاب ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کا وجود بھی مشتبہ ہے اس
لئے ان کے آغاز و انجام یا نوعیت و کیفیت کے متعلق کوئی گفتگو لاحاصل ہے۔
ہاں قدیم ترین دستیاب تذکروں کو سامنے رکھ کر ان کی تقدیم و تاخیر کا تعین کیا
جاسکتا ہے۔''(۱)

فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ اردو کے قدیم ترین تذکروں میں مندرجہ ذیل کے نام لئے جاتے ہیں۔

۱۔	نکات الشعراء	از۔میر تقی میر مؤلفہ	۱۱۶۵ھ
۲۔	گلشن گفتار	از۔حمید اورنگ آبادی مؤلفہ	۱۱۶۵ھ
۳۔	تحفۃ الشعراء	از۔افضل بیگ قاقشال مؤلفہ	۱۱۶۵ھ
۴۔	ریختہ گویان	از فتح علی حسینی گردیزی مؤلفہ	۱۱۶۶ھ
۵۔	مخزن نکات	از قیام الدین قائم مؤلفہ	۱۱۶۸ھ

ڈاکٹر فرمان صاحب نے ''اردو شعراء کا پہلا تذکرہ'' کے عنوان سے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔
انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کا حوالہ دیا ہے۔ جنہوں نے لکھا تھا کہ تحفۃ الشعراء اور گلشن گفتار دکن
سے تعلق رکھتے ہیں اور مخزن نکات اپنے دعوے کے باوجود بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۶۸ھ میں لکھا جاتا ہے
باقی رہا تذکرہ گردیزی سو داخلی شہادتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ گردیزی نے میر کے تذکرہ نکات الشعراء کو ضرور
دیکھا ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر عبداللہ کی رائے تھی کہ تذکرہ میر کو اردو کا پہلا موجود تذکرہ تذکرۂ میر کو قرار دیا جاسکتا
ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا:

۱۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۵

''ان بیانات کی روشنی میں یہ کہنا کہ میر کا تذکرہ گردیزی اور قائم یا حمید اور قاقشال کے تذکروں سے مقدم ہے۔مشکل ہے، بلکہ واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گردیزی، قائم اور حمید نے میر سے بہت پہلے اپنے تذکروں کی بنیاد ڈال دی تھی۔''(۱)

یہ بات درست نہیں معلوم ہوتا۔ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ:

''میر گردیزی اور قائم تینوں نے ایک دوسرے کی معلومات سے کم وبیش استفادہ کیا ہے۔لیکن معاندانہ چشمک یا اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے کسی ایک نے بھی دوسرے کے تذکرے کا نام تک نہیں لیا۔'' (۲)(مقدمہ مخزن نکات۔ص:۳۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب اس نتیجہ پر پہونچے ہیں:

''میری ناچیز رائے میں سردست میر سے تذکرہ نگاری کی اولیت کا شرف چھیننا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔''(۳)

فرمان صاحب کی رائے ہے کہ سال تکمیل کے اعتبار سے نکات الشعراء گردیزی اور قائم کے تذکروں سے مقدم ہو جاتا ہے۔

تذکرہ نگاری کے محرکات:

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مختلف محرکات کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔اپنی یادگار چھوڑنے کا فطری جذبہ۔

۲۔بیاض نگاری اور انتخاب اشعار کا شوق۔

۳۔شعراء کی معاصرانہ چشمک۔

۱۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۶

۲۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۶

۳۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۶

۴۔مشاعروں کا روج۔

۵۔فارسی تذکرہ نگاروں سے مسابقت لے جانے کی کوشش۔

فرمان صاحب نے بیاض نگاری کو تذکرہ نگاری کا اساس قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''انتخاب اشعار کے بڑھتے ہوئے شوق نے بیاض نگاری کی بنیاد ڈالی اور بیاض نگاری نے آگے چل کر تذکرۃ الشعراء کی صورت اختیار کر لی۔ بات یہ ہے کہ مختلف مضامین کی ضروری یادداشت رکھنے کے سلسلے میں پاک و ہند میں بیاض کا رواج عام تھا اور آج بھی کسی صورت میں موجود ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا کہ بیاض ہی کے نوع کی چیز ''سفینہ'' یا ''جنگ'' بھی تھی۔ سفینہ کا لفظ کتاب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اردو شعراء کے تذکروں کی تعداد

فرمان صاحب کے مطابق اردو شعراء کے تذکرہ نگاری کا آغاز تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے اور آب حیات مؤلفہ ۱۸۸۰ء تک برابر قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اردو زبان و ادب کے تقریباً سارے ناقدین آب حیات کو اردو ادب کی پہلی تاریخی و تنقیدی کتاب خیال کرتے ہیں۔ ہم نے اس لئے کتاب میں صرف آب حیات کے سال تصنیف ۱۸۸۰ء تک کو اردو تذکرہ نگاری کا اصل دور قرار دیا ہے اور اس زمانے تک جو تذکرے لکھے گئے ہیں صرف انہیں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔''(۱)

فرمان صاحب نے یہ تسلیم کیا کہ آب حیات کے بعد بھی اردو تذکرے لکھے گئے۔ مثلاً آثار الشعراء

۱۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۳۴

مؤلفہ دیبی پرشاد، جلوۂ خضر صغیر بلگرامی، یادگار ضیغم مؤلفہ ضیغم، آثار الشعراء مؤلفہ ممتاز علی آب و بقاء عبدالجبار خاں، گل رعنا مؤلفہ مولوی عبدالحیٔ، بہار سخن، مؤلفہ شیام سندر لال، بیاض سخن مؤلفہ عبدالشکور رشید انتخاب زریں مؤلفہ سید راس مسعود، قاموس المشاہیر عبدالباری آسی، شعر الہند مؤلفہ عبدالسلام ندوی تذکرۂ ریختی مؤلفہ تمکین کاظمی، ہند شعراء مؤلفہ عبدالرؤف عشرت، خمخانۂ جاوید مؤلفہ لالہ سری رام کاشف الحقائق، مؤلفہ محمد مبین چریا کوٹی اور کاشف الحقائق مؤلفہ امداد امام اثر وغیرہ۔

فرمان صاحب نے لکھا ہے:

> ''ان کی حیثیت قدیم تذکروں کی طرح چنداں اہم بھی نہیں رہی۔ اس لئے ان کو شامل کر کے ہم نے اس کتاب کو بے سبب طول دینا پسند نہیں کیا۔''(۲)

گارسین کی فہرست تذکرات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرانسیسی منشرق گارسین دتاسی کی فہرست تذکرات اور خود ان کے مرتب کئے ہوئے ضخیم تذکرے کا ذکر کیا جس کا نام ''تاریخ ادب ہندوستانی'' ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''پہلی جلد کے تکمیل تک اسے سات قدیم تذکروں سے زیادہ کی خبر نہ تھی سات میں ایک ''گلدستہ نشاط'' ہے۔ یہ تذکرہ نہیں صرف اشعار کا مجموعہ ہے۔''(۳)

فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ بھگت تالا، بجن چرتر، گلدستہ نشاط وغیرہ جو تذکروں کی فہرست میں شامل ہین ان کو خارج کر دینا چاہئے کیونکہ یہ تذکرے نہیں ہیں۔ جن تالیفات کو فرمان صاحب نے خارج کیا ہے ان کی کل تعداد ۳۹ ہے۔ یہ کتابیں تذکرات نہیں کہی جاسکتیں۔

ا۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۴۴،۴۵
۲۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۴۶
۳۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۴۷

فارسین نے پانچویں خطبے میں تذکرۂ اختر لکھنوی کا ذکر کیا تھا اس کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''گارسین نے پانچویں خطبے سے اسے واجد علی شاہ اختر کی تالیف ظاہر کیا ہے۔لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً گارسین کی مراد ''آفتاب عالمتاب'' سے ہے لیکن یہ واجد علی شاہ اختر کی نہیں بلکہ قاضی محمد صادق اختر کی تالیف ہے اور اس کا تعلق اردو شعراء سے نہیں فارسی شعراء سے ہے۔''(۱)

اردو تذکروں سے متعلق کام کا جائزہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو تذکروں سے متعلق جو تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کا جائزہ لیا ہے۔ مثلاً محمد محفوظ الحق کے مضمون پر قاضی عبدالودود نے جو تنقید کی ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔

فرمان صاحب نے حکیم شمس اللہ قادری کی فہرست اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مقدمہ ''دستور الفصاحت'' کا بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد فرمان صاحب نے نگار کے سالنامہ ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس نمبر میں تذکرہ نگاری کے فن اور ارتقاء پر بحث کی گئی ہے اور ۱۱۶۵ھ بمطابق ۱۷۵۲ء سے ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۸۸۰ء تک اردو شعراء کے ۵۴ تذکروں کا تعارف کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نظریہ وہی ہے جو نیاز صاحب کا تھا چنانچہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''شاعری کی اصل روح جذبات کا اظہار ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں داخلی بھی کہتے ہیں لیکن اگر طریقے اظہار ناقص یا پیش افتادہ ہو تو شعر معیار سے گر جائے گا اسی طرح خارجی شاعری کو لے لیجئے جس کا انحصار زیادہ محاکات یا ظاہری نقاشی پر ہے کہ اگر اس کے خطوط اچھے نہ ہوں گے تو وہ بھی پسند نہ کی جائے گی۔ اس لئے میرے نزدیک بنیادی چیز طریق اظہار ہے جس پر محاسن

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۵۴

شعری کا انحصار، خواہ شاعری داخلی ہو یا خارجی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ نکات الشعراء و مخزن نکات سے لے کر شمیم سخن و آب حیات تک تنقیدی شعور و اصول کا ایک ارتقائی سلسلہ ہے جو وقت اور ماحول کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی کی طرف اور ہیئت سے موضوع کی طرف بڑھتا گیا ہے اس کے بعد نیاز فتح پوری، ڈاکٹر سید عبداللہ اور رشید حسن خاں کے حوالے دینے کے بعد لکھا۔

''شعرائے اردو کے تذکروں میں جو تنقیدی اشارات کے اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔ وہ بے وقعت نہیں ہیں، ان کی اہمیت آج بھی مسلم ہے اور اگر کوئی شخص اس نقطہ نگاہ سے قدیم تذکروں کا مطالعہ کرے گا تو صرف یہی نہیں کہ یہ تذکرے اپنے وقت کے مذاق سخن اور طرز تنقید کے نمائندے نظر آئیں گے بلکہ ان کی دائم و قائم تنقیدی اہمیت کا اعتراف بھی کرنا ہوگا۔''(۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی حضرت نیاز فتح پوری کی طرح اپنے تنقید میں زبان و بیان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔

تذکروں کی سوانحی اہمیت

شعراء کی نجی زندگی کے متعلق تذکرہ نگاروں نے ایسے راز افشا کئے تھے جو شاعر کی شخصیت و کلام دونوں کے تفہیم کے لئے ضروری تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''خوش معرکہ زیبا''، ''نکات الشعرا، تذکرہ، گلشن بے خار، گلشن ہند'' وغیرہ سے اقتباسات دیئے اور یوں تبصرہ کیا۔

''میر تقی میر، میر حسن، شیفتہ خود تذکرہ نگار ہیں، لیکن انہوں نے اپنے تذکروں میں اپنے معاشقوں کا سراغ نہیں دیا۔ پھر بھی دوسرے تذکرہ نگاروں نے راز کو راز نہ رہنے دیا اور وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ایک بے لاگ سوانح نگار ہی کہہ سکتا ہے۔''(۱)

۱۔ نگار پاکستان جنوری ۱۹۶۲ء ص: ۹

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۸۵

فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اکثر تذکرہ نگاروں میں جو سوانح خطوط پیش کئے ہیں وہ بنیادی اور اصلی ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے عموماً انہیں شعراء کی تفصیل دی ہے جن سے وہ خود ذاتی طور پر یا کسی دوست کے ذریعے واقف تھے اس کے برعکس جن سے وہ باخبر نہ تھے، ان کے متعلق اپنی لاعلمی کا صاف اظہار کر دیا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ قائم کے بعد میر حسن نے ہر دور کو متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کر کے شعراء کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''گارسین دتاسی چونکہ مستشرق ہے اس لئے اس کا نقطۂ نظر تذکرہ نگاری کے باب میں بہت مختلف ہے۔ وہ تاریخ ادب ہندوستانی کی پہلی جلد میں اردو زبان و ادب کی پیدائش اور ارتقاء پر بحثیں کرتے ہیں اور دیباچے میں اردو شاعری کے مختلف ادوار کا جائزہ لے کر شعراء کے حالات لکھتے ہیں کریم الدین بھی طبقات الشعراء میں گارسین کے پابند نظر آتے ہیں اور اردو شعری و ادب کو تاریخی حیثیت سے موضوع بحث بناتے ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب اس بحث کا ماحصل یوں بیان کرتے ہیں:

''ہر تذکرے سے اس کے اپنے عہد کی شاعرانہ فضا ابھرتی ہے اور ادبی ذوق کی نمائش ہوتی ہے۔''(۴)

میر تقی میر بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ تذکرہ نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے میر کے تذکرہ کی عظمت کا خوب خوب اعتراف کیا ہے لکھتے ہیں:

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۸۹

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۸۷

۳۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۹۱

۴۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۹۲

> ''نکات الشعراء، تنقید اور سوانح دونوں لحاظ سے اردو شعر و ادب کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ میر اور ان کے معاصرین اور ماحول کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں، جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھیں۔''(۱)

اس تذکرہ میں میر نے اک سو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رایوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ میر تقی میر پہلے تذکرہ نگار ہونے کے مدعی تھے۔ نکات الشعراء کا ایک صاف ستھرا قلمی نسخہ مولوی عبدالحق کے ہاتھ لگا تھا جس کو انہوں نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں شائع کرایا تھا۔ انہوں نے مزید لکھا کہ اس سے پہلے نکات الشعراء کا ایک ایڈیشن محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں شائع کرایا تھا۔

گلشن گفتار:۔ گلشن گفتار حمید اورنگ آبادی کا فارسی میں لکھا ہوا تذکرہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ بعض دکنی شعراء سے ان کی ملاقات تھی اور بعض سے گہرے روابط تھے۔ دیباچے میں جو قطعہ تاریخ حمید اورنگ آبادی کا درج ہے اس سے سال تصنیف ۱۱۶۵ھ نکلتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے سید محمد کا مرتب کیا ہوا نسخہ اور ''تذکرہ گلشن گفتار'' مرتبہ ایم کے فاطمی مطبوعہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۳ء کا ذکر کیا ہے اور یوں تبصرہ کیا:

> ''یہ اردو شعراء کا مختصر ترین تذکرہ ہے۔ اس میں صرف تیس شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے اسلوب مقفی اور مسجع نہیں بلکہ صاف اور سادہ ہے۔ اس کی اہمیت دو خاص سبب سے ہے۔ اول یہ کہ اردو شعراء کے قدیم ترین تذکروں میں سے ایک ہے اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ شمالی ہند کی طرح دکن میں بھی تذکرہ نگاری کی رسم بارھویں صدی ہجری کے

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۱۰۰

وسط میں پڑ گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ دکنی شعراء کے متعلق بہت سی ایسی معلومات
حاصل ہوتی ہیں جن سے شمالی ہند کے تذکرہ نگار اس سے پہلے ناواقف
تھے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ تحسین سروری کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ مضمون احمد آبادی اور شرف الدین مضمون دونوں الگ الگ شاعر ہیں۔ فرمان صاحب نے ایم کے فاطمی کی رائے سے اتفاق کیا ہے کہ دونوں دراصل ایک ہی ہیں۔

تحفۃ الشعراء: مرزا افضل بیگ قاقشال کا لکھا ہوا فارسی زبان میں تذکرہ ہے جس کا نام تحفۃ الشعراء ہے اس میں صرف ۶۲ شعراء کے تراجم شامل ہیں میر کے "نکات الشعراء" اور حمید الدین کے "گلشن گفتار" کے ساتھ ساتھ ۱۱۶۵ھ میں "تحفۃ الشعراء" کی تصنیف ہوئی تھی۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

"حفیظ قتیل نے اس کے قلمی نسخوں کا سراغ دیا ہے" کتب خانہ آصفیہ
حیدر آباد میں اور ایک کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔ حفیظ قتیل نے تینوں
نسخوں کی مدد سے مطبوعہ نسخے کا متن تیار کیا ہے اور جہاں ان نسخوں میں نمایاں
اختلاف ہے وہ حاشیے پر درج کردیا ہے۔ یہ مطبوعہ نسخہ کتب خانوں میں عموماً
دستیاب ہے۔"(۲)

تذکرۂ ریختہ گویاں: -سید فتح علی حسینی گردیزی کے "تذکرہ ریختہ گویاں" کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں یہ تذکرہ
انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع ہوا اور یہی دستیاب ہے۔"(۱)

فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ "تذکرہ ریختہ گویاں" میں صرف ۹۷ شاعروں کا ذکر بہ لحاظ حروف تہجی آیا

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۰۷
۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۱۱

ہے۔

مخزن نکات :-محمد قیام الدین کے تذکرے کا نام ''مخزن نکات'' ہے۔ان کی عرفیت محمد قائم تھی اور قائم تخلص تھا ان کی وفات ۱۲۰۸ھ بمطابق ۱۷۹۳ء میں ہوئی، ان کی پیدائش چاند پور ضلع بجنور میں ہوئی۔ ڈاکٹر فرمان صاحب قائم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شعر سخن کا ذوق طبعی تھا۔ پہلے شاہ ہدایت اور خواجہ میر درد کو غزلیں دکھائیں۔ پھر سودا کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور ایک دن وہ آیا وہ خود صنف اول کے شاعر بن گئے اور ان کا نام درد، میر اور سودا کے ساتھ لیا جانے لگا۔قائم کا ذکر اکثر تذکروں میں آیا ہے۔''(۲)

لکھنؤ اور آگرہ یونیورسٹی میں قائم کی زندگی اور فن پر جو کام ہوا ہے اس کا ذکر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔مولوی عبدالحق صاحب نے ''مخزن نکات'' کو سب سے پہلے اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آبادی کی جانب سے ۱۹۲۹ء میں شائع کرایا تھا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ کہ مولوی عبدالحق صاحب نے ایک تاجر کتب کے لیتھو میں چھپوائے ہوئے مطبوعہ نسخہ کو خرید کر انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھپوا دیا تھا ''مخزن نکات'' کی دوسری اشاعت مجلس ترقی ادب لاہور کے ذریعے ۱۹۶۶ء میں ہوئی جس کا اقتداء حسن نے ترتیب دیا تھا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''مخزن نکات اردو شعراء کے قدیم ترین تذکروں میں سے ایک ہے۔یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۱۲۸ر شعراء کے تراجم شامل ہیں۔قائم نے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ مخزن نکات شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب کی رائے ہے کہ قائم نے اپنے تذکرے میں میر کے تذکرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے خواجہ عنایت اللہ فتوت کے تذکرہ ریاض حسنی، لکشمی نرائن شفیق کے تذکرہ

۱۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۱۱۵

۲۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۱۲۱

۳۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۱۲۵

'چمنستان شعراء، نصرت اللہ شوق کے تذکرہ 'طبقات الشعراء' کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ ان فارسی تذکروں کے بارے میں جن ادیبوں نے تحقیقی کام کئے ہیں ان کی ادبی خدمات کی کھل کر داد دی ہے۔

تذکرۂ شعرائے اردو:- یہ میر حسن دہلوی کا فارسی میں لکھا ہوا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''میر حسن کا تذکرہ پہلی بار ۱۹۲۱ء میں اور دوسری بار ۱۹۴۰ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ مطبوعہ نسخے بھی اگرچہ کامیاب ہیں پھر بھی دستیاب ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ جن کے متعلق خیال ہے کہ خود مصنف کے ہاتھ کا ہے۔ کتاب خانہ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کی تفصیلات عرشی صاحب نے دستور الفصاحت کے مقدمے میں دے دی ہیں۔''(۱)

تذکرۂ شورش یا رموز الشعراء:- یہ سید غلام حسین شورش کا تذکرہ ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ڈاکٹر محمود الٰہی کے تحقیقی کام کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمود الٰہی نے آکسفورڈ اور جونپور کے نسخوں سے بعض شعراء کے تراجم ایک دوسرے کے مقابل کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ آکسفورڈ کا نسخہ بعد کا ہے اور اس میں شورش کے کسی عقیدت مند نے تحریف سے کام لیا ہے۔ شورش کے بعض بیانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میر کا تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے گذرا تھا اور غالباً اس سے متاثر ہو کر انہیں 'رموز الشعراء' کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا تھا۔''(۲)

بہار خزاں:- میر بہاء الدین حسین خاں عروج اورنگ آبادی کے تذکرے کا نام 'بہار و خزاں' ہے عروج نے فارسی شاعری کا تذکرہ بھی اسی نام سے لکھا ہے۔

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۵۶

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۶۳

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے:

''تذکرہ بہار و خزاں کی تالیف ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۹۰ھ کے مابین معلوم ہوتی ہے۔''(۱)

گل عجائب:- اسد علی خاں تمنا کا تذکرہ ''گل عجائب'' کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

''یہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۴ھ کے درمیانی عرصے میں لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک خستہ خراب قلمی نسخہ کتاب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ تھا اسے مولوی عبدالحق صاحب نے بکمال عرق ریزی مرتب کیا اور اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے ۱۹۳۶ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہی تذکرہ کتب خانوں میں ملتا ہے اور یہی میرے سامنے ہے۔''(۲)

سرت افزاء:- ابوالحسن امیر الدین احمد امراللہ کا تذکرہ سرت فزاء ہے ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اس تذکرے سے بعض شعراء کے سوانح حیات کے سلسلے میں کئی ایسی اہم اور نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اس سے پہلے کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ بقول قاضی عبدالودود صاحب، بعد کے کئی تذکرہ نگاروں مثلاً مصحفی اور محسن نے اپنے تذکروں میں اس سے مدد لی ہے۔ میر تقی میرؔ کے ترجمے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل نکات الشعراء نے مصنف کو سرت افزاء کی تالیف پر اُکسایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ سرت افزاء کے سلسلے میں کئی مقالے شائع ہوئے ہیں لیکن سب سے اہم دقیع اور کارآمد مقالہ قاضی عبدالودود صاحب کا ہے۔

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۶۶

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۷۲

۳۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۷۶

قاضی صاحب نے اس مقابلے میں صاحب تذکرہ کے حالات زندگی، تذکرے کے زمانہ تصنیف، اس کے ماخذ خصوصیات ومحاسن سب کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

گلشن سخن:- مبتلا کا فارسی میں لکھا ہوا تذکرہ 'گلشن سخن' ہے اس کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۳۲۱ شاعروں کا ذکر ہے مع حالات منتخب کلام شاعروں کے حالات کم اور کلام کا انتخاب زیادہ ہے۔ تصنیف کا سبب محض ادبی ذوق وشوق کی تسکین ہے۔'' (۱)

گلزار ابراہیم:- علی ابراہیم خلیل کا تذکرہ 'گلزار ابراہیم' ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''گلزار ابراہیم اردو شعراء سے متعلق نہایت اہم تذکرہ ہے۔ مواد کی فراہمی میں جو وسائل اور ذرائع علی ابراہیم کو حاصل تھے وہ اس سے پہلے کے تذکرہ نگاروں کو حاصل نہ تھے۔ علاوہ ازیں خلیل نے اس کے مواد کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کی کوشش کی ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ ''یہ تذکرہ کئی وجوہ سے دوسرے تذکروں پر فوقیت رکھتا ہے۔

تذکرۂ عیار الشعراء:- خوب چند ذکا کا تذکرہ عیار الشعراء شعراء ے اردو کا ایک قدیم اور اہم تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ اس تذکرے کا آغاز ۱۲۱۳ھ میں ہوا تھا اور اس کا تکمیلہ ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۴۸ھ کے درمیان ۳۵ رسال کے عرصے میں ہوا ہے۔

لکھتے ہیں:

''عیار الشعراء، کا اولین مسودہ ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۲۶ھ کے درمیان ہر طرح مکمل ہو گیا تھا جہاں تہاں اضافے البتہ اس کے بعد ہوتے رہے۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تذکرہ جو فارسی میں ہے اس میں کل ۹۴۹ شعراء کا ذکر آیا ہے۔

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۹۰
۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۱۹۳

گارسین دتاسی نے اپنے خطبے میں لکھا تھا کہ عیار الشعراء میں ۱۵۰۰ رشاعروں کا ذکر ہے۔

تذکرۂ عشقی :- شیخ محمد وجیہہ الدین عشقی کے تذکرے کا نام ''تذکرۂ عشقی'' ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ عشقی نے اپنا تذکرہ ۱۲۱۱ھ میں مکمل کیا تھا اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے اور ایک قاضی عبدالودود صاحب کے قطب خانے میں ہے انہوں نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ کے نسخے کے کچھ اوراق غائب ہیں اور پروفیسر کلیم الدین احمد نے ان دونوں کی مدد سے اسے مرتب کیا اور تذکرہ شورش کے ساتھ بہ عنوان دو تذکرے اس کا دو جلدوں میں مختصر مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا۔ پہلی جلد ۱۹۵۹ء میں اور دوسری جلد ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی یہی جلدیں ڈاکٹر فرمان صاحب کی پیش نظر تھیں جب انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

گلشن ہند :- مرزا علی خاں لطف کا تذکرہ 'گلشن ہند' ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ لطف کا اصل وطن دہلی تھا لیکن ان کا قیام حیدر آباد، لکھنؤ، مرشد آباد اور عظیم آباد میں رہا ہے اور یہ کہ ان کی پیدائش کا سال معلوم نہیں ہے۔ وفات کا سال ۱۲۲۸ھ بمطابق ۱۸۱۳ھ ہے ان کی دو کتابیں شہرت رکھتی ہیں۔ ایک مثنوی عشقی اور دوسری تذکرہ گلشن ہند ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ اس تذکرے کو پہلے پہل عبداللہ خاں نے رفاہ عام پریس میں چھپوا کر حیدر آباد دکن سے ۱۹۰۶ء میں شائع کیا اور اس میں مولانا شبلی کے حاشیائی نوٹ اور مولوی عبدالحق کا بسیط مقدمہ شامل ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ گلشن ہند اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جو اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ گلدستہ حیدری بھی اس کے ساتھ کی تصنیف ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ گلشن ہند طبع زاد تذکرہ نہیں بلکہ گلزار ابراہیم، مؤلفہ علی ابراہیم خلیل کا ترجمہ ہے۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں لکھا گیا ہے اور اس میں ۹۹۶ شاعروں کا ذکر ہے۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ صحیح تعداد ۱۰۰۵ ہے۔

تذکرۂ حیدری :- سید حیدر بخش حیدری کا تذکرہ ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ حیدری کے حالات زندگی 'طبقات الشعراء، مؤلفہ کریم الدین، سخن شعراء، مؤلفہ نساخ، یادگار شعراء مترجمہ طفیل احمد اور

ا۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۲۰۰

ریاض الوفاق، مؤلفہ ذوالفقار علی مست وغیرہ میں ملتے ہیں اور مولانا حامد حسن قادری، سید محمد، محمد عتیق صدیقی، ڈاکٹر عبارت بریلوی، ڈاکٹر اقتداء حسن اور ڈاکٹر مختار الدین احمد وغیرہ نے تذکروں سے استفادہ کر کے حیدر کے حالات زندگی تفصیل سے لکھ دیئے ہیں۔

عمدۂ منتخبہ:- میر محمد خاں سرورؔ نے تذکرہ لکھا جس کا نام 'عمدۂ منتخبہ' ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ اس تذکرے کے چار قلمی نسخوں کا سراغ اب تک ملا ہے ایک پیرس کے کتب خانے میں ہے دوسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔ تیسرا نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ اس تذکرے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سرور کا اصلاح شدہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''عمدۂ منتخبہ پہلے پہل ۱۹۶۱ء میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا اور اسے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے لندن کے نسخے کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔

انجمن ترقی اردو کراچی اور نیشنل میوزیم کراچی کے مخطوطے ڈاکٹر فاروقی کی نظر سے نہیں گذرے۔ یہی مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے۔'' (۱)

مجمع الانتخاب:- شاہ محمد کمال کے غیر مطبوعہ تذکرہ کا نام مجمع الانتخاب ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''کمال تخلص کرتے تھے آبائی وطن کڑا مانک پور تھا۔ شاعری میں قائم کے شاگرد تھے۔ ان کے والد قادر نواز خاں عہد مغلیہ میں صاحب منصب و جاگیردار تھے۔ عہد محمد شاہی میں بنگال گئے اور نواب بنگال کے ملازم ہو گئے۔ آخر کار دہلی آئے اور شاہ محمد تقی جیلانی کے مرید خلیفہ ہوئے۔ اس کے بعد ترک دنیا کر کے عظیم آباد کے ایک ویرانے کو محی الدین پور کے نام سے آباد کیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔'' (۱)

ابتدائی زمانے میں شاہ محمد کمال فیض آباد و لکھنؤ بھی گئے اور وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد حیدر آباد چلے

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۲۱۷

گئے اور وہیں اپنا تذکرہ مجمع الانتخاب مکمل کیا۔ مجمع الانتخاب فارسی میں لکھا ہوا شاہ محمد مانک پوری کا اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک اس تذکرہ کی اشاعت نہیں ہوسکی ہے۔ شاہ محمد کمال مانک پوری کا ذکر شاہ عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں بھی کیا ہے۔

ریاض الفصحا:- غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرہ کا نام ریاض الفصحا ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ اس تذکرے کا آغاز ۱۲۲۱ھ میں ہوا تھا مگر اس کا تکمیلہ ۱۲۳۶ھ میں ہوا۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ اس تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ رام پور میں اور دوسرا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۹۳۵ء میں خدا بخش لائبریری کے نسخے کی بنیاد پر مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا اور یہی نسخہ ڈاکٹر فرمان صاحب کے سامنے تھا۔

یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور پہلے تذکرے سے ضخیم ہے، ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ اس میں تین سو اکیس شاعروں کا ذکر ہے جو پہلے تذکرہ میں ہونے سے رہ گئے تھے۔

مجموعہ نغز:- قدرت اللہ قاسم کے تذکرے کا نام مجموعہ نغز ہے۔ جو فارسی زبان میں ہے ڈاکٹر فرمان صاحب اس تذکرے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ مولانا محمد حسین آزاد ذخیرۂ کتب مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق یہ نسخہ قدیم ترین ہے اور خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مجموعہ نغز کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے حافظ محمود شیرانی نے دونوں قلمی نسخوں کے متن کی مدد سے اس تذکرے کو مرتب کیا ہے۔ اب یہی مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے اور یہی میرے سامنے ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے:

> ''مجموعہ نغز میں بہت سی باتیں ہیں جو آب حیات میں مذکورہ ہیں اور محمد

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۲۶۶

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۲۳۷

حسین آزاد سے منسوب چلی آرہی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کا ماخذ دراصل قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ نغز ہے۔ آزاد نے بعض جگہ اس کا سراغ دیا ہے اور اکثر جگہ محذوف کر گئے ہیں۔"(۱)

گلشن بے خار:-محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرے کا نام 'گلشن بے خار' ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

"شیفتہ نے ۱۲۴۸ھ بمطابق ۱۸۳۳ء میں شروع کیا۔ ۱۲۵۰ھ بمطابق ۱۸۳۴ء میں تذکرے کو مکمل کرلیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔"(۲)

گلشن بے خار نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے ۱۸۳۸ء میں مولوی باقر نے مطبع دہلی اردو اخبار سے شائع کیا تھا۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔

تاریخ ادب ہندوستانی:-ممتاز مستشرق گارسین دتاسی اس کتاب کے مصنف ہیں، ان کے کارنامے ایک دو نہیں درجنوں ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے لکھا ہے:

"اردو کی تعلیم انہوں نے انگلستان میں حاصل کی ۱۸۲۸ء میں ان کی کوششوں سے پیرس کے ادارۂ السنۂ شرقیہ میں اردو کا شعبہ قائم ہوا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس سے منسلک ہوگئے۔"(۳)

تاریخ ادب ہندوستانی فرانسیسی زبان میں ہے اور تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب میں تقریباً تین ہزار شعراء و مصنفین کا ذکر آیا ہے جس میں دو ہزار آٹھ سو مصنفین و شعراء اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔

آبِ حیات:-ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے 'آب حیات' کے بارے میں لکھا:

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۴۰

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۲۹۰

۳۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص:۳۰۳

''آب حیات اردو کی پہلی تصنیف ہے جسے 'تذکرۃ الشعراء' کے ساتھ ساتھ ہم اردو میں ادبی تاریخ، ادبی سوانح، ادبی تنقید اور لسانی تحقیق کا اولین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ایسی تخلیقی شان اور ایسی ادبی رعنائی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کے باوصف آج بھی بڑے چاؤ سے پڑھی جاتی ہے۔ آزاد نے اس کتاب کی تالیف کے لئے ہر ممکن ذریعے سے مواد فراہم کیا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں سے مراسلت و ملاقات کے علاوہ قدیم تذکروں سے بھی انہوں نے مدد لی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے بعض ماخذوں کا سراغ انہوں نے دیا ہے۔ بعض کو چھپا گئے ہیں یا حوالہ دینے کو بھول گئے ہیں۔''(۱)

آب حیات کے مختلف ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ جو لوگ آزاد کی تنقید کو چنداں اہمیت نہیں دیتے وہ بھی آزاد کی مرقع نگاری کے قائل ہیں اور آب حیات کو اپنے عہد کی شاعرانہ فضا کی آئینہ دار خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس سلسلے میں ڈاکٹر کلیم الدین احمد، مولوی عبدالباری آسی، حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے جو گراں قدر مضامین محمد حسین آزاد کے تذکرے کے بارے میں لکھا ہے ان کا اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ ان مضامین کی روشنی میں آب حیات کا تازہ ایڈیشن ضروری حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو بجائے خود ایک اہم ادبی خدمت ہوگی۔ چونکہ آزاد زندگی اور ادبی کارناموں کے متعلق سیکڑوں مضامین اور درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں اسی لئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مزید تفصیل میں جانے سے گریز کیا ہے۔

آزاد نے لکھا تھا کہ ''ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔'' اس کی بابت ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''آزاد کا یہ بیان نیا نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگار ایسی باتیں کہہ چکے تھے۔ خصوصاً صاحب شمیم سخن کے

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص: ۶۱۰

یہاں بھی ابتدائی جملہ اسی انداز کا ملتا ہے ان کا بیان ہے:

''واضح ہو کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔''

لیکن آزاد نے اپنے اس دعوے پر جس انداز سے گفتگو کی ہے اور بھاشا کی تفصیلات میں جا کر فارسی، اردو اور سنسکرت کے متحد الاصل الفاظ پر جس عالمانہ طریقے سے بحث کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' اپنے موضوع پر ایک جامع اور تحقیقی کام ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ان تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کا بڑی تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تذکرہ نگاری کے باب میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔

۱۔اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء،ص:۶۱۴

بحیثیت ایڈیٹر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری زندگی کی ہر راہ میں مسلسل محنت کرتے رہے اس محنت ولگن اور صلاحیتوں کی بناء پر ہی نیاز فتح پوری نے اپنے رسالہ نگار کی سرپرستی آپ کے سر رکھا، وہ جانتے تھے کہ اس بھاری پتھر کو کون اٹھا سکتا ہے۔ اس پتھر کراٹھانا ایسا کارنامہ ہے جیسے ڈوبتی نیا کو سنبھالنا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کی ادارت میں اب تک مختلف نمبر اور سالنامے شائع ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحب نے نا قابل رسائی اور گمنام کتابوں کو نگار میں جگہ دے کر عام قاری کو اس سے مستفید کرایا۔

نومبر ۱۹۶۲ء سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''نگار پاکستان کی ادارت میں شامل ہوئے۔ اسی سال نیاز فتح پوری لکھنؤ سے ہجرت کر کراچی پاکستان چلے گئے اور نگار کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں سے نگار کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور کراچی میں اس رسالے کی ادارت وہ اپنی نگرانی میں فرمان فتح پوری کے سپرد کیا اگر چہ خود اس کے مدیر اعلیٰ رہے مگر اس کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری فرمان فتح پوری بخوبی نبھاتے تھے۔ نگار پاکستان کو فرمان صاحب نیاز فتح پوری کی سرپرستی اور نگرانی میں ایڈٹ کرتے رہے۔ نیاز صاحب کے انتقال کے بعد اس رسالے کی تمام تر ذمہ داری فرمان صاحب کے کاندھے پر آپڑی اور وہ یہ ذمہ داری آج تک قائم ہے ڈاکٹر صاحب کی صحافتی زندگی کا محور ''نگار'' پاکستان ہے۔ جو تسلسل ہے نیاز فتح پوری کے نگار کا بلکہ نگار پاکستان انہیں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے آج تک زندہ ہے۔

نیاز و نگار اور ڈاکٹر فرمان صاحب کا ساتھ عمر بھر کا ہے وفا کے اس بندھن کو انہوں نے کبھی دنیاداری کو مجبوریوں اور اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو حائل نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ نگار ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہورہا ہے۔ ادبی صحافت کے میدان میں کوئی ڈاکٹر فرمان سے آگے نہیں ہے فرمان صاحب نقاد بھی ہیں، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ نگار پاکستان کے مدیر ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نیاز و نگار کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی تحریک ایک ہی مکتبہ فکر اور ایک ہی رجحان کے دو نام ہیں جنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا

جاسکتا۔"(۱)

جوان پر اور ان کی ادارت میں شائع ہونے والے نگار پاکستان پر صادق آتا ہے۔

حکیم نثار احمد علوی فرمان فتح پوری کی تحریروں کے متعلق لکھتے ہیں:

"فرمان کی تحریروں اور نگار پاکستان کے ضخیم نمبروں کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہونچا کہ تحریر کا کمال یہ نہیں ہے کہ صرف خیالات میں ندرت ہو بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ قاری اس کو محویت اور دلچسپی سے پڑھے اور وہ افکار و نظریات پر اثر انداز ہو، ایسا نہ ہو کہ سر سے گذر جائے۔"(۲)

فرمان صاحب کی تحریروں میں یہ بات اکثر ملتی ہے کہ پڑھنے والا اس سے تاثر ضرور حاصل کرتا ہے تحریر کی خشکی سے پڑھنے کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا ان کے مضامین میں کہیں تکرار مضامین بھی ملتی ہے۔لیکن تکرار عیب نہیں ہے بلکہ خوبی کی حامل ہوتی ہے کیونکہ یہ تو اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اپنی بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو نیاز فتح پوری سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔یہی وجہ ہے کہ نگار پاکستان آج تک بند نہیں ہوا۔وہ نیاز صاحب کے معتقد ہوتے ہوئے بھی ان کے مقلد کبھی نہیں رہے۔انہوں نے نگار پاکستان کی ادارت سنبھالتے ہی اپنی راہ الگ نکالی۔دھیرے دھیرے رسالے کو ایک نیا موڑ دیا اور اسے نئے جہات و عباد سے روشناس کرایا اور ہر سال اہتمام کے ساتھ اس کے خاص نمبر بھی نکالتے رہے۔نگار پاکستان لحظہ بہ لحظہ ترقی کی جانب گامزن ہے۔اردو زبان و ادب کی اتنی طویل مدت تک اور ایسی بے مثل خدمت اردو کے شاید ہی کسی رسالے نے انجام دی ہو۔نیاز فتح پوری کے انتقال ۱۹۶۶ء کے بعد بھی یہ رسالہ اپنی آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے نیاز فتح پوری کے بعد فرمان فتح پوری جیسا لائق مدیر ملا ہے۔نگار پاکستان کی ترتیب کی ذمہ داری نبھانے کے دوسرے ہی سال فرمان صاحب نے اس کا نیاز فتح پوری نمبر ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں شائع کیا یہ خاص نمبر نیاز فتح پوری کی حیات و شخصیت اور فکر و فن سے لے

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص:۵۸۳

۲۔نیاز شناسی۔از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی۔۱۹۷۰ء۔ص:۷

کران کی علمی وادبی خدمات کے ہر پہلو کا جائزہ پیش کیا ہے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار پاکستان کا ایک اور خاص نمبر "تذکروں کا تذکرہ نمبر" شائع کیا۔ آگے چل کر تذکرہ نگاری پر ایک کتاب مرتب کیا جس پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔ یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی جنوری، فروری ۱۹۸۱ء میں افسانہ اور افسانہ نمبر نکالا۔ جسے بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ۱۹۶۶ء میں اصناف ادب نمبر شائع کیا جس میں ناول، ناولٹ، افسانہ، رپورتاژ وغیرہ پر نثری ادب کی تمام اصناف پر مضامین شامل ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اصناف شاعری نمبر شائع کیا جس میں اردو شاعری پر مضامین شامل ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں مسائل ادب نمبر، اس نمبر میں شعر وادب کے نئے اسالیب ور جحانات پر مضامین شامل ہیں۔ عہد حاضر کے ادبی مسائل کی تفہیم میں یہ نمبر خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۹۶۹ء میں اکبر آلہ آبادی نمبر شائع کیا جس میں ہندو پاک کے معتبر اہل قلم نے اکبر الہ آبادی کی شاعری اور طنز مزاح پر مضامین کو جگہ دی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں سرسید نمبر جو دو حصوں میں شائع ہوا۔ اس میں سرسید کے علمی وادبی، شخصیت شعور فکر اور تعلیمی مسائل اور ان کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں میر انیس نمبر، ۷۳۔ ۱۹۷۴ء میں مولانا حسرت موہانی نمبر حصہ اول دوم، ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر محمود حسین نمبر، ۱۹۷۶ء قائد اعظم نمبر، ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال نمبر، ۱۹۷۸ء میں مولانا محمد علی جوہر نمبر، ۱۹۷۹ء قمر زمانی بیگم نمبر، ۱۹۸۰ء میں مسائل زبان نمبر، ۱۹۸۱ء میں افسانہ اور افسانہ نگار نمبر، ۱۹۸۲ء میں فن تاریخ گوئی نمبر اور خطبات محمود نمبر، ۱۹۸۳ء جشن طلائی نمبر، ۱۹۸۴ء نیاز صدی نمبر، ۱۹۸۵ء میں فن عروج نمبر اور مکتوبات نیاز نمبر، ۱۹۸۶ء میں تنقید غزل نمبر، ۱۹۸۷ء میں غالب نگاہ نیاز نمبر، ۱۹۸۹ء میں اردو شاعری کا فنی ارتقاء نمبر اور اردو نثر کا فنی ارتقاء نمبر، ۱۹۹۰ء میں اقبال بنگاہ نیاز نمبر، ۱۹۹۱ء میں نقد شعر نمبر، ۱۹۹۲ء میں عورت فنون لطیفہ نمبر، ۱۹۹۳ء خدا نمبر۔ سالنامہ دسمبر ۱۹۹۵ء کا خصوصی شمارہ انتقادیات حصہ اول دوم کو مکمل طور پر شائع کیا ہے۔ جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے یہ سالنامہ ۳۸۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

نگار جون ۱۹۹۵ء کا شمارہ مظفر حنفی کی دو نئی کتابوں پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ملاحظات میں لکھتے ہیں۔

"روح غزل" (اردو غزل کا پچاس سالہ انتخاب) یہ ادب کے تازہ مقالوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔"

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ روح غزل جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے بیسویں صدی کی اردو غزل گوئی کا عطر ہے۔ یہ ضخیم کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں تقریباً سو غزل گو شعراء کی غزلوں کے نمونے شامل ہیں۔ ان چار نمونوں کو چار خاص ادوار میں تقسیم کر کے بلحاظ حروف تہجی شعراء کے ناموں کا اندراج کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں ان شعراء کا کلام ہے جو ۱۹۴۰ء تک خاصے نمایاں ہو چکے ہیں۔ دوسرے دور میں ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیانی عہد کے شعراء تیسرے دور میں ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۵ء اور چوتھے دور میں ۱۹۷۶ء تا ۱۹۹۱ء کے شعراء شامل کیے گئے ہیں یہ سالنامہ اہم اور خاص ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار پاکستان میں ہر شمارہ خصوصی شمارہ کا سلسلہ شروع کیا جس میں مولوی عبدالحق کے تبصرے ن۔ م۔ راشد، حیات اللہ انصاری افادی ادب، اختر انصاری، اقبال کی نظری و علمی شعریات، ڈاکٹر مسعود حسین، اردو ناول میں طنز و مزاح، بہادر شاہ ظفر نمبر، کلیم الدین احمد کی خود نوشت میری بہترین نظم، مرتبہ محمد حسن عسکری، اویس احمد ادیب کی تصنیف، ولی دکنی۔ غالب کی فارسی غزل۔ خیام کی رباعیات کا اولین ترجمہ۔ جامع اردو ادیب کا جشن زریں نمبر، ڈاکٹر گیان چندر کتابیات تحقیق، مشاطر سخن از صفدر مرزا پوری۔ مولوی عبدالحق۔ باغ و بہار، مرتبہ سید رشید حسن خاں۔ بی اماں اور بیگم، حسرت موہانی۔ دوہا نگاری اور اس کا فن۔ بیاد مجنوں گورکھپوری۔ پریم چند، کچھ نہیں مباحث مانک ٹالا۔ اپریل ۱۹۸۹ء کا خصوصی شمارہ جگر مرادآبادی کے نام کیا ہے جس میں مختلف ادیبوں کے مضامین شامل کیے ہیں۔ مارچ ۱۹۹۵ء کا شمارہ زبان اور مسائل زبان پر مشتمل ہے جو کتابی شکل میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء کا شمارہ زبان اور مسائل زبان پر مشتمل ہے جو کتابی شکل میں پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ ستمبر ۱۹۹۵ء کا شمارہ زبان اور اردو زبان پر مضامین شامل ہیں۔ ان خصوصی سالناموں اور نمبروں میں نادر و نایاب تذکروں، تنقیدی کتابوں، مقالات، مثنویات، رباعیات، تحقیقات و تاریخی کتابوں کو اردو ادب کے قارئین کی نذر کیا ہے۔ ان شماروں میں ڈاکٹر فرمان صاحب نے ملاحظات لکھے ہیں۔ ان کے ذریعے انہوں نے ایک اچھے ایڈیٹر کا رول بخوبی ادا کیا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری نے نگار میں ملاحظات کے عنوان سے بڑی پابندی کے ساتھ لکھتے تھے ان کے ملاحظات کا موضوع کوئی علمی، ادبی، کسی مذہبی مسئلہ پر اور حالات حاضرہ کے کسی نہ کسی سماجی و سیاسی مسئلہ پر

ہوتا تھا۔ اسی طرز پر ڈاکٹر فرمان صاحب بھی ۱۹۶۶ء سے اب تک مسلسل نگار کے لئے 'ملاحظات' لکھتے رہے ہیں۔ وقت کی تنگی و دیگر مصروفیات کے باوجود وہ بڑی پابندی سے نگار کے لئے ملاحظات لکھتے رہے۔ سماجی اور سیاسی مسائل پر ان کا قلم رواں رہا۔ ۱۹۶۶ء کے جنوری شمارہ میں ان کا شجرہ، پاکستان کا دفعہ اور اردو۔ فروری کے شمارہ میں مسئلہ کشمیر معاہدہ تاشقند پر روشنی ڈالی ہے۔ جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۶۶ء کے ملاحظات میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز صاحب مرحوم اور کراچی کے عنوان سے لکھے، جن میں ان کی کراچی آمد قیام اور دیگر کوائف تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ نیاز صاحب کی پہلی برسی ۱۹۶۷ء کے موقع پر نگار پاکستان کا ایک شمارہ فرمان صاحب نے ان کے نام وقف کیا اور ملاحظات میں نیاز صاحب مرحوم کے تعلق سے دل کو چھو لینے والی باتیں لکھیں۔

مارچ ۱۹۶۷ء کے نگار کے ملاحظات میں ایک بار پھر ڈاکٹر فرمان صاحب نے اردو کے مسئلے اور نفاذ پر حکومت پاکستان کی ناکامی پر شدید احتجاجی لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۷ء کے شمارہ کے ملاحظات میں انہوں نے امریکی حکومت کے مشرقی ممالک کے بارے میں اور پاکستان کے حوالے سے معاہدانہ رویے اور پالیسی پر کھل کر لکھا اور سخت الفاظ میں اس روش پر امریکی حکومت کی مذمت کی۔ جنوری، فروری ۱۹۶۸ء کے مشترکہ شمارہ کے ملاحظات میں انہوں نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پاکستان میں لسانی تنازعہ اور پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کو نوک قلم پہ دھرا اور پوری بیباکی کے ساتھ لکھا ہے۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں پاکستان کے یوم آزادی اگست کے حوالے سے انہوں نے قائد اعظم اور علامہ اقبال کے پاکستان ساز نظریات اور عزائم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اہل اقتدار کی ان سے غفلت شعاری اور نتیجتاً قوم میں لاأبالی پن اور عدم وابستگی کے جذبات پیدا ہو جانے پر تشویشناک صورت حال کا اظہار کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء کے شمارہ کے ملاحظات میں ایوب خاں کے خلاف عوامی ابھار کی فضا میں پاکستان کے دانشوروں اور ادیبوں کو کچھ تو کہئے کے عنوان سے ان کی خاموشی اور عدم دلچسپی پر جھنجھوڑا۔ دسمبر ۱۹۶۸ء کے ملاحظات میں ایک بار پھر ملک کی بگڑی ہوئی سیاسی صورت حال پر اہل سیاست اور ارباب وطن کو متوجہ کیا۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بھی ملکی سیاست اور ایوب خاں کے خلاف احتجاج کی حمایت میں دانشوروں کو متوجہ کیا۔ جنوری ۱۹۷۰ء کے ملاحظات میں نئے ہونے والے انتخابات، جمہوریت کی جلد بحالی اور کراچی صوبہ کے مطالبہ کے حوالے سے لکھا۔

فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۷۰ء کے ملاحظات میں ڈھاکہ کے سیاسی ہنگاموں اور ملک کی سیاسی صورت پر لکھا ہے۔ مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دشمن کے عنوان سے جہاں ملک کے اندران عناصر کی نشاندہی کی وہیں خارجی دشمنوں یعنی امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان کے سیاسی رویوں اور ان کی سیاسی حکمت عملی پر لکھا ہے۔ جولائی، اگست ۱۹۷۱ء کے مشترکہ شمارہ کے ملاحظات کا موضوع پاکستان اور برطانوی پریس و نیز چین اور امریکہ کے تعلقات کا جائزہ لیا ہے۔ نومبر، دسمبر ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں عالمی بڑی طاقتیں اور پاکستان پر ہندوستانی جارحیت کے عنوان سے بڑے دردمندانہ لب ولہجہ پر اداریہ لکھا ہے۔ اپریل ۱۹۸۴ء کے ملاحظات میں جدیدیت پسندی کے مظالطے پر قلم اٹھایا ہے۔ نگار پاکستان کے ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ کو چیکوسلواکیہ کے مشہور مصنف میلان کیندیرا سے متعلق ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب ملاحظات میں لکھتے ہیں:

> ''جدید فکشن خصوصاً ناول کے حوالے سے چیکوسلواکیہ کے مشہور مصنف میلان کندیرا کا نام اردو لکھنے اور پڑھنے والوں میں اسی تواتر و اہتمام سے لیا جاتا رہا ہے جیسے اس سے کچھ پہلے سارتر اور ٹی ایس ایلیٹ کا نام لیا جاتا تھا۔ لیکن اندازہ یہ ہوا کہ ابھی کندیرا کے بارے میں اردو والوں کی واقفیت اجنبی سی ہے۔ ایسے میں ضروری معلوم ہوا کہ کندیرا سے اردو والوں کو مزید متعارف کرایا جائے۔''(۱)

فرمان صاحب نے کسی طرح قارئین کو میلان کندیرا سے ہی نہیں حیدرآباد دکن کے مجلّہ ''شعر و حکمت'' سے متعارف کرادیا ہے۔ اس طرح کی اشاعت سے قاری کو نہ صرف چیکوسلواکیہ کے نامور مصنف کی تحریر سے دلچسپی رکھنے کی ترغیب کی گئی ہے بلکہ انہیں جدید فکشن کو سمجھنے کی صلاح دی گئی ہے۔

اس شمارے میں دو اہم مضامین ہیں۔ ایک آئیزک سکویرا کا ہے جس کا ترجمہ مفتی نسیم نے کیا ہے۔ (میلان کندیرا اور مابعد جدیدیت ناول) اور دوسرا میلان کندیرا ہے جسے محمد عمر میمن نے ترجمہ کیا ہے۔ (گرانڈ مارچ)

ا۔ نگار پاکستان ستمبر ۱۹۹۰ء ملاحظات۔ ص: ۲

نگار پاکستان کے جون ۱۹۹۱ء کے شمارہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے خیام کی رباعیات کا اولین ترجمہ شائع کیا ملاحظات میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے مترجم راجہ مکھن لال ہیں اور یہ ترجمہ انہوں نے ۱۲۶۰ھ میں کیا تھا جسے ڈاکٹر محمد تقی الدین احمد نے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار اپنے مقدمے کے ساتھ صرف پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا۔ فرمان صاحب نے لکھا ہے:

''یہ منظوم ترجمہ قدیم ترین ترجموں میں سے ایک ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خیام کی ۳۲۳ ر رباعیات شامل ہیں۔ جو بہ اعتبار تعداد اب تک کے سارے دستیاب تراجم سے زیادہ ہیں۔''(۱)

مزید لکھا ہے:

''مرتب کا مقدمہ جامع ہے اور اس میں راجہ مکھن لال اور عمر خیام دونوں کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ رباعیات وزن و ایجاد کے بارے میں بھی مرتب نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس میں کئی باتیں محلّ نظر ہیں اور غلط محض ہیں۔''(۲)

اس طرح فرمان صاحب نے ایک نایاب و کمیاب کتاب کو نگار پاکستان کے قارئین کو نذر کیا۔ یہ کارنامہ کم نہیں ہے۔ اردو ادب کی بہترین خدمت ہے۔

نگار پاکستان کے فروری ۱۹۹۱ء کے خصوصی شمارے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے مقدمے کے ساتھ مولانا احسن مارہروی کی مرتبہ ''کلیات ولی'' کے اقتباسات شائع کئے ہیں۔

فرمان صاحب نے ''ملاحظات'' میں لکھا ہے:

''یہ کتاب شعبہ اردو حلیم مسلم کالج کانپور کے سابق صدر و پروفیسر اویس احمد ادیب کی تصنیف ولی کے اولین تنقیدی ماخذوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ افسوس کہ ۱۹۴۰ء کے بعد اردو ادب میں ولی پر جو تحقیقی و تنقیدی کام

۱۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء ملاحظات۔ ص:۳

۲۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۱ء ملاحظات۔ ص:۳

ہوا ہے اس میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب ناقدین و محققین کی نظر سے نہ گذری ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے اس سے فیض اٹھانے کے باوصف حوالہ دینا ضروری نہ جانا ہو۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں عام طور پر بڑے اور بہت ممتاز و مشہور اہل قلم کے کمزور سے کمزور حوالوں کو تو تحریر کی زینت بنالیا جاتا ہے لیکن کم مشہور لکھنے والوں کی قیمتی سے قیمتی اور اہم سے اہم تحریر کو بھی استفادہ کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ تحقیق و تنقید دونوں زاویوں سے اس میں ایسا مواد موجود ہے جس کا حوالہ ۱۹۴۰ء کے بعد کی تحریروں میں آنا چاہئے تھا۔'' (۱)

اس کے علاوہ ڈاکٹر فرمان صاحب ادب کے مختلف موضوعات و مسائل پر ملاحظات لکھے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ملاحظات مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ چنانچہ سیر و سیاحت بھی ان کے ملاحظات کا موضوع رہا ہے۔ فرمان صاحب نے ۱۹۸۰ء میں بھارت کی سیر کی تھی اور یہاں ایک ماہ چند روز قیام کیا تھا۔ اس سفر کے حالات اور تاثرات انہوں نے 'نگار پاکستان' کے ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں ملاحظات کے تحت 'بھارت میں ایک مہینے تین دن' کے عنوان سے بالاقساط شائع کئے۔ اس سفر کے بعد نگار پاکستان کے دسمبر ۱۹۸۱ء کے ملاحظات میں جموں و کشمیر کا سفر نامہ خطہ بے نظیر نظر کی، آزاد جموں و کشمیر کے عنوان سے قلم بند کیا اور اپنے تاثرات بڑے دلنشیں انداز میں بیان کئے ہیں۔ جنوری، فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۹۶ء کا ملاحظات امراؤ طارق صاحب لکھے ہیں مگر مئی کا شمارہ میں ڈاکٹر صاحب حسرت و نیاز کے ملاحظات لکھ کر اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دینے سے نہیں چوکتے اب اکثر گاہے بگاہے نگار کے ملاحظات امراؤ طارق لکھتے ہیں اس رسالے کی تدوین و ترتیب میں امراؤ کا بڑا ہاتھ رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس رسالے کی باگ ڈور ان کے کاندھوں پر ہوگا ان سے بہتر اس رسالے کو اور کون سنوار سکتا ہے۔

☆☆☆

۱۔ نگار پاکستان فروری ۱۹۹۱ء ملاحظات۔ ص: ۶

باب پنجم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شعر گوئی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شعر گوئی

ایک زمانے سے ہمارے ادیب شاعر و مفکر شاعری کی اہمیت اور دلکشی کو محسوس کرتے آرہے ہیں اور اپنے اپنے انداز اور تخیل کی پرواز سے شاعری کی قدر و قیمت کو الفاظ کا جامہ پہناتے آتے ہیں۔ جو بھی صاحب علم وفن ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ فرمان نے بھی اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا مگر بہت جلد نثر کی طرف مائل ہو گئے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا ابتدائی عمر سے ہی ڈاکٹر فرمان صاحب شعر کہنے لگے تھے۔ ''بچپن اور لڑکپن کی کچھ یادیں'' میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''پرائمری اور مڈل اسکول میں بلکہ اپنے گاؤں اور قصبے میں لڑکوں اور طالب علموں کے درمیان مختلف وجوہ سے گروہ بندی رہتی تھی۔ اس گروہ بندی کے نتیجے میں کسی خاص لڑکے کا بائیکاٹ کر دیا جاتا تھا۔ یعنی اس کے ساتھ بول چال بند رہتی تھی اور اس پر طرح طرح سے فقرے اور آواز کسے جاتے تھے۔ ایسے مواقع پر میں شاعری سے بھی کام لیتا تھا۔ چنانچہ رما شنکر نام کے ایک ہندو لڑکے کے بائیکاٹ پر میں نے یہ شعر کہا:

ایک لڑکا گاؤں کا عرصے سے بائیکاٹ ہے
نام اس کا 'ر' سے ہے چغلی میں موٹر کار ہے(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بچپن سے ہی شعر کہنے لگے تھے جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے۔

سید دلدار علی کا نام فرمان کیسے پڑا، سید دلدار علی کے بچپن کا ایک عزیز دوست جس کا نام سید فرمان علی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد فرمان صاحب نے اپنے نام کے ساتھ بطور تخلص فرمان رکھ لیا اور آج ادبی دنیا میں اسی نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب اپنے بچپن کے دوست کا حال خود بیان کرتے ہیں:

''چھٹی جماعت کا ایک اہم واقعہ یاد آ گیا اور شاید میرے لڑکپن کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ پرائمری

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ دہلی ۱۹۹۱ء کتاب نما خصوصی شمارہ۔ ص: ۱۵

اسکول سے مڈل اسکول تک میرے دو چچازاد بھائی بھی میرے ہم جماعت رہے ان میں ملک سید فرمان علی تھے جن سے میری پکی دوستی تھی۔ اتنی پکی کہ ہم لوگوں نے جب سے ہوش سنبھالا تقریباً ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ مڈل اسکول گھر سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ میرے پاس سائیکل تھی ہم دونوں اسی پر جاتے تھے۔

ایک دن صبح سویرے جب میں فرمان کے دروازے پر پہونچا اور اسکول چلنے کے لئے آواز دی تو چچی جان نے بتایا۔

''ابھی وہ بڑے تالاب سے نہا کر آئے تھے بہت تیز بخار چڑھ گیا ہے بخار اتر گیا تو وہ کسی کے ساتھ آجائیں گے۔ تم جاؤ ماسٹر صاحب سے حال بتا دینا اور فرمان نہ پہونچیں تو چھٹی کی درخواست لگا دینا۔''

مجھے اسکول پہونچے ہوئے مشکل سے دو گھنٹے گذرے تھے کہ گاؤں کا ایک پاسی ہانپتا کانپتا یہ منحوس خبر لایا کہ فرمان میاں کا انتقال ہوگیا۔ اس اچانک خبر سے سارے عزیزوں اور دوستوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ فرمان میرے عزیز ترین دوست تھے۔ لنگوٹیا یار تھے۔ بچپن ہی سے ہر جگہ اور ہر دکھ سکھ میں ہم دونوں ساتھ رہتے تھے۔ میرے لئے ان کی وفات بڑی جان لیوا تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ الٹی سیدھی شاعری تو کر ہی لیتا تھا۔ اس لئے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ایک نظم کہی لیکن اب یاد نہیں رہی۔ البتہ میں نے یہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ ان کے نام کو تخلص کے طور پر لگا لیا۔ گویا میرا تخلص فرمان ہوگیا۔ اچھے برے جتنے اشعار کہتا تھا سب میں فرمآن کو بطور تخلص استعمال کر کے دل خوش کرتا تھا۔ پھر مضامین وغیرہ میں بھی اس نام کو استعمال کرنے لگا۔ ۱۹۳۸ء میں یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت سے فرمآن میرے نام کا جزو بن گیا لوگ میرا اصل نام بھول گئے اور سب اسی نام سے پکارنے لگے۔ میں خوش ہوں کہ میرے ساتھ ساتھ میرا دوست بھی زندہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے اب صرف

وہی زندہ ہے۔ میرا نام تو کوئی جانتا بھی نہیں۔"(۱)

ڈاکٹر اسلم فرخی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شعر گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فرمان صاحب صرف صاحب تخلص نہیں، صاحب سخن بھی ہیں۔ اگر چہ انہوں نے اس امر کا اقرار نہیں کیا، تاہم میرا خیال یہ ہے کہ ان کی ادبیت کی ابتداء شاعری ہی سے ہوئی ہوگی۔ شعبہ اردو کی بعض محفلوں میں انہوں نے اپنا کلام سنایا ہے مگر نثر کی طرف توجہ ہونے کے بعد شاید انہوں نے شاعری کو پورا وقت نہیں دیا۔ بہر حال وہ شاعر ہیں زور شور کے نہ سہی لیکن ہیں شاعر۔"(۲)

برکت علی خاں اپنے مضمون میں فرمان فتح پوری کی اردو فارسی سے رغبت اور ابتدائی دور کی شاعری قیام فتح پوری کے مشاعروں میں پڑھی ہوئی نظموں کو نقل کیا ہے جو اپنے دوست شباہت علی کے متعلق کہے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

ہے دعا خرم شہر سے شاد و خرم آؤ تم

برکت علی خاں فرمان صاحب کے علمی و ادبی دلچسپی اور شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"دلدار ماموں کو شاعری سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ وہ اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے بطور شاعر مقامی طور پر مشہور ہو چکے تھے۔ اسکول کے طلباء اور اساتذہ کے ساتھ ساتھ شہر اور گرد و نواح کے باذوق لوگ ان کو بطور شاعر جانتے پہچانتے تھے۔ دلدار ماموں کو فتح شہر اور اس کے قصبات و دیہات کے شعراء سے خاص لگاؤ تھا۔ دلدار ماموں کو اپنے ضلع کے شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے منتخب کو یکجا کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔"(۳)

قیام فتح پور کی اسی یاد میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب "مشاہیر فتح پور ہسوہ" ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۹۱ء کتاب نما خصوصی شمارہ ص: ۱۵

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص: ۴۱، ۴۲

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد سوم۔ ص: ۱۵۸

ہے اس کتاب میں فتح پور کے ان تمام شعراء، وکلاء اور ادبی شخصیات کا ذکر کیا ہے۔

برکت علی خاں آزادی کے بعد ایک مشاعرہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''تقسیم ہند کے فوراً بعد کی بات ہے کہ ایک رات ٹاؤن ہال میں جشن آزادی کے سلسلے میں مشاعرہ تھا۔ صدارت کے فرائض گرجا شنکر صاحب، ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر، ادا کر رہے تھے۔ ملک نیا نیا آزاد ہو تھا دلدار ماموں نے اپنی تازہ نظم ''آزادی'' پڑھی تھی یہ مسدس کی صورت میں تین چار بند کی نظم تھی۔ بہت پسند کی گئی تھی جس کا پہلا شعر تھا۔

اے رشک پری اے حور جناں اے حسن کی دیوی آزادی
اس دل کی شکستہ بستی میں مدت میں رچائی ہے شادی (۳)

برکت علی خاں نے اپنے مضمون میں ایک اور آل انڈیا مشاعرے کا ذکر کیا ہے جس میں فرمان صاحب نے ایک غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ اس غزل پر بہت داد ملی تھی جس کا پہلا شعر تھا:

مآل بے خودئ شوق ہیں مرے سجدے
مجھے جبیں کی خبر ہے نہ آستانے کی

ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری نے اپنے دوست شباہت علی کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ایک نظم فارسی میں کہی تھی جسے برکت علی خاں نے اپنے مضمون میں اس نظم کو پیش کیا ہے۔

نامۂ تہنیت و تبریک

۱ دبیات چند برنگ تہنیت و تبریک بتقریب شادی دکتور متنبہ خاں سلمہا دختر دکتور دولتر ودہ و شباہت علی خاں ہمراہ دکتور جین فرانسو راموں سلمہ بتاریخ ۲۷/ اگست ۱۹۸۸ء میلادی مطابق ۱۴/ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ بمقام فرانس بروز ہفتہ۔

دختر   ماد   خراہر احسان
قرۃ   العین   ہلترود   خان

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص: ۱۶۱، ۱۶۲

باعث نازش شباہت ہم
جان و دل را پیام راحت ہم
دور مالش زہند تا ایماں
یورپ و ایشیا شد نہ یک جاں
رشتہ ہم بہ کشور پاک است
چوں مئے ناب در رگ تاک است
نام معروف او متنہ است
ہمتیش یک در شمنیہ است
دست در دست راموں داد بدل
ہر دو دکتور و نازش دوران
نافع فکر و شافع درمان
چوں ادیب و طبیب یکجا اند
آدمی را چہ باک و خوف گزند
زندگانی را ہم سفر چیدہ
سوئے راہ خرامیدہ
راہ تازہ و منزل تازہ
گامزن بر رہ حیات نو
درنگہ داشتہ جہات نو
تازہ تم تازہ کار و تازہ خیال
اہل فن اہل علم و اہل کمال
رہرواں را سفر مبارک باد
مہرباں باز موسم گل شد

ہر صراحی صراحی مل شد

در محرم نظارہ عید است

جشن امروز لائق دیر است

غنچۂ دل شگفت و گلشن شد

در زمیں دانہ رفت و خرمن شد

چو و زیدہ صبائے مے آشام

گشت پا بستہ گردش ایام

ڈاکٹر فرمان صاحب کے عزیز دوست ڈاکٹر شباہت علی خاں اپنے مضمون میں اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''معلوم نہیں آپ کے ڈاکٹر صاحب اب شعر کہتے ہیں یا نہیں۔ لیکن چند سال پہلے تک ضرور کہتے تھے۔ اس لئے کہ مجھے انہوں نے کچھ نظمیں بھیجی تھیں۔ ایک زمانے میں تو وہ کثرت سے شعر کہتے تھے۔''(۱)

اسی مضمون میں شباہت علی خاں نے لکھا ہے:

''فرمان صاحب اصلاً شاعر تھے اور ان کا اول ذوق اردو شاعری ہی سے شروع ہوا تھا۔ جب بھی کسی کی شادی ہو تو فرمان صاحب کا کہا ہوا سہرا پڑھا جاتا تھا۔ جب بھی منظوم سپاس نامہ یا خراج عقیدت کا موقع ہو تو شعر گوئی کے لئے فرمان صاحب کی خوشامد کی جاتی تھی۔ میرے سوا شاید کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس دور کے مشہور مقامی شعراء انہیں سے اصلاح لیتے تھے۔ اور ایک گلے باز شاعر جو مشاعرہ لوٹ لیتے صرف فرمان صاحب ہی کی غزل اپنے نام سے پڑھتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی اردو کا مشاعرہ یا ہندی کا کوی سمیلن فتح پور میں ہوتا اس وقت لوگوں کا تانتا فرمان صاحب کے گھر پر لگا رہتا اور فرمان صاحب سب کے لئے طرحی یا غیر طرحی غزل تیار کر دیتے تھے۔''(۲)

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص: ۶۰

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص: ۵۰

ڈاکٹر شباہت علی خاں نے اپنے مضمون میں مزید لکھا:

''مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کے لئے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے ایک بڑا مشاعرہ فتح پور کے خاموش ہال میں ہوا تھا۔ اس میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈر شریک ہوئے تھے۔ شاعروں میں جگر مرادآبادی اور حسرت موہانی خاص طور سے یاد ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اس مشاعرے کی صدارت کی تھی فرمان صاحب نے پہلے پر جوش تقریر کی تھی پھر شعر سنائے تھے۔ غرضیکہ ادیب و ناقد بننے سے پہلے فرمان صاحب کی شعر و شاعری کا ہمارے شہر میں ہر طرف چرچا تھا، ان کے بعض اشعار اب تک مجھے یاد ہیں اس وقت جو یاد آرہے ہیں سن لیجئے۔ چند شعر ملاحظہ ہو:

نہ میں شکوہ سنج قسمت نہ میں شاکیِ زمانہ
مجھے غم کے پاس لایا میرا شوق والہانہ
وہی ایک جذب صادق وہی ایک عزم کامل
جو قفس کی تیلیوں سے بھی بنالے آشیانہ
نشیمن پھونکنے والو! چمن کو پھونک دینا تھا
ابھی امید تعمیر نشیمن پائی جاتی ہے
طبیعت انجمن کے نام سے گھبرائی جاتی ہے
کسی کی یاد وہ ظالم کہ پیہم آہی جاتی ہے(۱)

ایک دفعہ فرمان صاحب سخت بیمار پڑے بیماری کے فوراً بعد ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ اس میں انہوں نے جو طرحی غزل سنائی اس کے بعض اشعار یہ تھے:

وہ تسکین دیتے جاتے ہیں مگر تسکین نہیں ہوتی
محبت میں کسی شئے کی کمی معلوم ہوتی ہے
وہ دن بھی یاد ہیں جب ہچکیاں لے لے کر روتے تھے
مگر رہ رہ کے اب اکثر ہنسی معلوم ہوتی ہے

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص:۶۱

شباہت صاحب لکھتے ہیں اس غزل کے مقطع میں انہوں نے میرا نام بھی اس طور سے شامل کر دیا تھا کہ

خدا ناخواستہ فرمان کی دنیا سے رخصت ہے
شباہت خاں کی آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے

ڈاکٹر فرمان صاحب شاعری کے متعلق خود لکھتے ہیں:

''شاعری خواں اس کا موضوع کچھ بھی ہو شاعر سے جذبے کی شدت اور پاکیزگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذبے کی شدت اور پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے موضوع سے مخلص ہو، گہرا لگاؤ رکھتا ہو اور اپنی لگن میں سچا ہو، جس نسبت سے اس کی شاعری بچی موثر اور گہری ہوگی، یوں سمجھ لیجئے کہ جذباتی صداقت کے بغیر صرف منطقی یا علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری جنم نہیں لے سکتی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب، خاں ظفر افغانی کو ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ میں نے شاعری کیوں ترک کر دی:

''میں نے شاعری اس لئے ترک کر دی کہ میرا مطالعہ نثر کے مقابلے شاعری میں بہت زیادہ ہے۔ دیوان غالب پورا بچپن ہی میں یاد ہو گیا تھا۔ شعور شاعری کے معیار مقرر کر دیتا ہے۔ اب بھی نظمیں غزلیں کہتا ہوں لیکن سب بیکار ہے۔ میں انہیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ چھاپوں۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب بتاتے ہیں:

''علامہ نیاز نے بھی مجھے مشورہ دیا کہ میں شاعری ترک کر کے مضامین لکھوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود علامہ نیاز بھی شاعری ترک

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ ص:۶۲

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۶۹۸

کر چکے تھے۔''(۱)

ڈاکٹر اشرف فرمان صاحب کے خصوصی دوستوں میں سے ایک ہیں۔ڈاکٹر اشرف صاحب فرمان فتح پوری کی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''شعر گوئی کا ذوق انہیں اس ماحول سے ملا جس میں ان کی تربیت و پرداخت ہوئی ان کا مزاج لڑکپن سے شاعرانہ تھا اور اس میں ان کا گھر اور گھر سے باہر کی فضا کو بڑا دخل تھا۔ان کے بڑے بھائی شمشاد علی تنہا تخلص کرتے تھے اور خوبصورت شعر کہتے تھے۔ ان کے چچا صدیق حسن فارسی اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں مشق سخن رکھتے تھے۔ گویا شاعرانہ ذوق ان کو بچپن سے قدرت کی طرف سے ملا تھا اور ماحول نے بھی ان کی آبیاری کی تھی۔ اور پھر فضائے شاعرانہ سے انہوں نے کسب فیض کیا اور بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ابتدائی دور میں زیادہ تر ظریفانہ اور مزاحیہ شعر کہتے رہے۔''(۲)

ایک شعر بطور مثال ملاحظہ ہو:

واہ رہے محبوب کتنی دلکش کانے میں ہے
دونوں عالم کی حقیقت ایک پیانے میں ہے(۳)

ڈاکٹر فرمان صاحب کی شاعری میں طنز وظرافت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اسی سلسلے کی فرمان صاحب کی کتاب ''اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے'' شائع ہو چکی ہے۔

امراؤ طارق لکھتے ہیں:

''۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی درمیانی دہائی میں ان کی بعض نظمیں اور غزلیں دہلی کے مشہور اخبار ''وحدت'' اور ''الامان'' میں شائع ہوئی تھی۔''(۴)

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۷۵
۲۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۷۳۶
۳۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۷۳۶
۴۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۸۳

ڈاکٹر نسیم فاطمہ نے اپنے مضمون کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب بھی ہے، میں لکھتی ہیں:

''لغت نویسی کا کام ایک نہایت خشک اور حد درجہ محنت طلب کام ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ فرمان صاحب اس کام کی بے کیفی کو دور کرنے کی راہ نکالے ہوئے ہیں۔ خاموشی سے شعر کہتے رہتے ہیں۔ گنگناتے رہتے ہیں اور دوسروں کے نام سے اپنے شعر سناتے رہتے ہیں۔

میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے اس چھپے ہوئے شاعر کو فرمان صاحب کے روپ میں دیکھا ہے گاہے گاہے ان سے شعر سنے ہیں اور اس کی بعض غزلیں اور نظمیں مطبوعہ صورت میں بھی دیکھی ہیں۔''(۱)

امراؤ طارق نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی فی البدیہہ شعر گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب کو فی البدیہہ شعر کہنے میں ایسا ملکہ ہے کہ شاید بہت سے پر گو شعراء بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ لیکن اس خوبی کا اظہار کبھی کبھی ہوتا ہے ایک مرتبہ میں اور ڈاکٹر صاحب گارڈن کے دفتر سے سبیلہ ہوتے ہوئے ناظم آباد جارہے تھے اور ڈاکٹر صاحب اپنی پری فیکٹ گاڑی خود ڈرائیو کر رہے تھے کہ شعر و شاعری کا ذکر چھڑ گیا اور ڈاکٹر صاحب نے سبیلہ سے غالب لائبریری تک اشعار کی بھرمار کر دی۔ میں مصرعہ دیتا وہ شعر کہہ دیتے یا گرہ لگا دیتے۔ میں موضوع دیتا وہ گاڑی کا گیئر بدلتے اور خیال کی رو تیز ہو جاتی اور اشعار کا نزول شروع ہو جاتا۔ اس دن اس مختصر سے فاصلے اور وقفے کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے دس بارہ اشعار ضرور کہے ہوں گے اور لطف یہ ہے کہ کوئی اشعار فضول یا بے جان نہ تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر وہ کسی طرح محفوظ کر سکتا تو صحیح اندازہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کے اندر کتنا خوبصورت اور پر گو شاعر چھپا ہوا ہے۔''(۲)

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۸۳

۲۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول۔ص:۱۱۱

ڈاکٹر فرمان صاحب کی فی البدیہہ شعر گوئی ان کی زندہ دلی کا ثبوت ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے کو بہت پہلے ہی پہچان لیا تھا وہ سمجھ گئے تھے کہ قدرت نے انہیں نثر نگاری کے لئے چن لیا ہے اور شاعری ان کا کام نہیں ہے اور نہ ان کے لئے عزت کا وسیلہ۔ اسی لئے فرمان صاحب نے اپنا کوئی مجموعۂ کلام مرتب نہیں کیا اور نہ اسے شائع کرنے کا خیال ان کے ذہن میں آیا جو حال ڈاکٹر صاحب کا ہے وہی دوسرے نامور نقادوں اور محققین کا بھی ہوا ہے۔ انہوں نے شعر گوئی سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا لیکن جلد ہی تنقید و تحقیق کی طرف متوجہ ہو گئے۔

منشی پریم چند نے شعر گوئی سے ابتداء کی تھی لیکن جلد ہی کہانی اور ناول لکھنے لگے اور دنیا انہیں شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار و ناول نگار کی حیثیت سے جانتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو حضرت نیاز فتح پوری کی نیاز مندی پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ مولانا نیاز صاحب بھی قومی نظمیں اور رومانی نظمیں لکھ رہے تھے لیکن بعد میں ادبی صحافت کے میدان میں اتر آئے اور اسی میں نام پیدا کیا۔ ڈاکٹر فرمان نے جو مقام ادب میں حاصل کیا ہے وہ اپنی ادبی صحافت کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ انہوں نے نگار پاکستان کو شان کے ساتھ ادارت کی ہے اور ادب کی خدمت کی ہے لیکن فرمان صاحب کے تنقیدی اور تحقیقی کارنامے اور نعت نویسی ان کو دور جدید کے اہم ترین ادبی شخصیتوں کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔

ڈاکٹر اشرف فرمان فتح پوری کے فن و شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

''فرمان فتح پوری محض مختلف الحیثیات عالم ہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت فنکار، صاحب احساس تخلیق کار اور متاثر کرنے والے شاعر بھی ہیں۔''(۱)

ان کی نظموں اور غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تھکے تھکے سے اجالے بجھے بجھے سے چراغ
کوئی نشان دل و جاں نہ زندگی کا سراغ
یہ صبح نو ہے تو اس صبح نو کو میرا سلام

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص: ۷۴۰

نہ تازگی کی علامت نہ روشنی کا سراغ
ابھی نہ ڈھونڈ چمن میں خرام کبک و دری
اچک رہے ہیں ابھی قمریوں کے بھیس میں زاغ

ڈاکٹر فرمان صاحب پیانِ وفا ۱۴/اگست کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی اس کے چند مصرعے دیکھئے جو پاکستان کے وجود میں آنے کی جھلکیاں نظر آتی ہے۔ فرمان صاحب کا حساس دل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

اے سرزمینِ پاک ما
اے یوم پاکستان ما
اے جانِ ما اے جانِ جا
دن یاد ہوں گے ابھی
جب میں نے تجھ کو خواب میں دیکھا تھا
تیرے نام سے باندھا تھا پیان وفا پہلے پہل
میں کیا کہوں، کیونکر کہوں تو خود بتا
اے جان ما اے جان جاں

نظم عناصر اربعہ کی بغاوت کے چند آخری اشعار دیکھئے۔

اپنے ذاتی کمالات سے منحرف ہوگئے
خود کو جھٹلا گئے اپنے قالب کو بے آسرا، بے آماں کر گئے
اب یہ عالم ہے کہ روح
بے گھر ہے، بے یار ہے، بے مددگار ہے
ڈھونڈتی پھر رہی ہے
کرایہ کا گھر
پی سی ایچ ایس میں، گلشن میں اور ناظم آباد میں

فرمان صاحب نظموں کے علاوہ غزلیں بھی بہت سی کہی ہیں، ان غزلوں کے چند اشعار دیکھئے۔

آستیں میں بت، بغل میں بت، نگاہ و دل میں بت
پوجنے والا بتوں کا، بت کا بیوپاری لگے
میرے جسم جاں کو جس کی تپش پگھلا گئی
کاش! اس پتھر بدن کو بھی وہ بیماری لگے

اس غزل کا آخری مصرعہ ہے:

اب کے شہر درد کے موسم کی تبدیلی نہ پوچھو
مختصر یہ ہے کہ دن بھی رات سے بھاری لگے

ایک غزل کا مصرعہ ملاحظہ ہو:

اب مارِ آستیں کی ضرورت نہیں رہی
ہر شخص اپنے آپ کو ڈستا لگے مجھے
باتوں میں اس کے زہر بھی امرت کے ساتھ ساتھ
قاتل کبھی، کبھی وہ مسیحا لگے مجھے
فرمانؔ اپنے ذوق سخن کو یہ کیا ہوا
تازہ سے تازہ شعر پرانا لگے مجھے

ڈاکٹر فرمانؔ صاحب اپنی شاعری کے متعلق خود لکھتے ہیں:

''اپنی شاعری پہ کبھی اتنا اعتماد پیدا نہیں ہوا کہ انہیں طباعت کے لئے بھی قبول کر لیتا۔ میں نے صرف تسکین ذوق کے لئے شعر کہے ہیں۔...... میں دوسروں کو نظمیں لکھ کے تو دے دیتا تھا۔ لیکن اپنے نام سے کبھی نہیں چھپوایا۔ دہلی سے ''وحدت'' اور ''الامان'' نکلتے تھے، ان میں مسلم لیگ کے سلسلے میں ایک آدھ نظم چھپتی تھی۔ غرض یہ کہ شاعری گھٹی میں پڑی تھی۔ آٹھویں جماعت تک مجھے سارے بڑے شاعروں کا کلام زبانی یاد ہو چکا تھا۔''(۱)

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک جہت نما صاحب قلم۔ از سلیم اختر مطبوعہ دہلی ۲۰۰۵ء، ص: ۱۵۷

ڈاکٹر فرمان صاحب کی شاعری میں بلا کی سادگی وحسن آفریں نظر آتی ہے ان کی نظمیں سیاسی، سماجی حالات میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسرت موہانی کی غزلوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جن کا ان کی زندگی پر گہرا اثر ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے ''میں شخصیتوں سے نہیں انکے کلام سے اثر قبول کرتا ہوں۔ میں نے حسرت کو دیکھا۔ ان کی شخصیت اور کام دونوں سے متاثر ہوا۔ عملاً میں شوخی اور شگفتگی کا قائل ہوں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کہتے ہیں:

> ''میں نے اپنے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، اب میں شعر کہتا ہوں، یہ بات شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ میں بہت تیز شعر لکھتا ہوں، کسی بھی موضوع پر ابھی نظم لکھ سکتا ہوں.... شاعری میرا ذاتی معاملہ ہے اس لئے میں صرف خوش ہوتا ہوں، اپنی خوشی کی تکمیل تو شعر لکھ کر ہو جاتی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شاعری کا بہت مختصر سا ذخیرہ میری نظر کے سامنے ہے جو زیادہ تر ابتدائی دور میں کہی ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق میں کوئی ایسی رائے دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن اسکا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا جب فرمان صاحب کی شاعری کا مجموعۂ کلام شائع ہو کر منظر عام پر آتی تا کہ نقادفن کو ان کے اس پہلو کو بھی جانچنے کا موقع ملتا۔

☆☆☆

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۷۰۹)

باب ششم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ادبی وتنقیدی نظریات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام تحقیق اور تنقید کے حوالوں سے بہت اہمیت کا حامل ہے، ان کی تحریروں میں خیالات، مشاہدات اور تدریسی تجربے شامل ہیں۔ تحقیق وتنقید ادب وفن کے دو الگ الگ شعبے ضرور ہیں۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ ہر اسکالر ان شعبوں میں فاصلہ قائم رکھے۔ فرمان صاحب کی تحقیق وتنقید میں عالمانہ آمیزش ہے۔ تنقید میں وہ شخص اور اس کے فن کو کسی طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں دیکھتے شخص اور اس کی تحریروں کا مطالعہ بھی کسی ایک طے شدہ یا مخصوص زاویے یا کسی ایک دبستان تنقید یا مکتبہ فکر کے حوالے سے نہیں کرتے بلکہ ادب اور ادیب کو شخصیت اور اس کی تحریر وتخلیق کو ایک زاویے میں رکھنے اور پرکھنے کے بعد کرتے ہیں۔ اردو تنقید کے ابتدائی ادوار میں عموماً یہ طریقۂ کار رائج نہیں تھا بلکہ شخص اور اس کی تنقید وتحقیق اور تخلیق کو ایک ساتھ اور ہر پہلو سے پڑھنے اور پرکھنے کی روایت مستحکم تھی ادب کی مختلف اصناف اور ادبی مسائل کے بارے میں ان کی نوعیت بھی عموماً تحقیقی اور تنقیدی رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تنقیدی نظریات کو طویل علمی وادبی زندگی کا تجربہ خیال اور لفظ کو تخلیقی سطح پر برتنے کے بعد ہی اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔

فرمان فتح پوری نے ادب کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن سب سے زیادہ مقبولیت فرمان کو تحقیق وتنقید کے میدان میں ملی باقاعدہ اپنے ادبی سفر کے آغاز سے پہلے مضامین ونظمیں غزلیں لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ لیکن ادبی تنقید کے متعلق ان کا پہلا اہم مضمون غالب کے کلام میں استفہام ۱۹۵۲ء کے نگار میں شائع ہوا تھا جس سے ان کے نظریات وافکار کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ سوچتے ہیں اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس کے بارے میں اپنا ایک نقطہ نظر بھی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے تنقید کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے کچھ قلم کار پہلے ہی آ چکے تھے۔ لیکن ان کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے تنقید میں نمایاں خدمات انجام دیں ان میں سرسید، حالی، آزاد اور شبلی خاص ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک ایسے نقاد ہیں جنہوں نے تنقید کے شاید ہی کسی پہلو پر اظہار خیال نہ کیا ہو انہوں نے ان بنیادی چیزوں پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے جسے نظریاتی تنقید کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تنقیدی نظریات کو تحقیق کی سطح سے جانچنے پرکھنے کے بعد بہت آسان ودلچسپ بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب سب سے پہلے کتاب کے موضوع پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تحقیق وتنقید ساتھ

ساتھ ملتے ہیں، وہ تنقید کے کسی بھی پہلو کو اٹھائیں جب تک اس صنف پر ناقدانہ نظر نہیں ڈال لیتے تب تک اس صنف پر قلم نہیں اٹھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تحقیق وتنقید کی آمیزش نظر آتی ہے۔

فرمان صاحب کی تنقیدی تحریروں کی اثر پذیری میں ان کے انداز بیان اور اسلوب کو بھی خاص دخل ہے وہ اپنی تنقید میں زبان و بیان کو مختلف سطحوں سے استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں کوئی خاص زاویہ نظر نہیں رکھتے۔ وہ اپنے مقالات میں نظریات کو زیر بحث لاتے ہیں بلکہ عملی تنقید میں نظریہ تحریر کو اس طرح پیوست کر دیتے ہیں کہ وہ تنقیدی تحریر نظر آنے لگتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی لکھی ہوئی کوئی باقاعدہ تنقیدی خیالات کی تصنیف نہیں ہے۔ براہ راست ادب کے نظریاتی مسائل پر یقیناً انہوں نے بہت کم لکھا ہے۔ عملی تنقید کے ذریعے ان کے نظریات کو جانا جا سکتا ہے۔ وہ دور حاضر کے نامور نقاد ہیں اور ان کی تنقیدی رائیں ادب میں حوالہ کی چیز بن گئی ہیں۔

ڈاکٹر عقیلہ شاہین نے بجاطور پر لکھا ہے:

> ''جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش تو نکالی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے متعدد جگہ ماضی کے اور اپنے عہد کے مختلف ناقدین کی تنقیدی آراء سے وقار و اعتماد کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور اختلاف کو مدلل و معنی افروز اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ قاری کو ان کا ہم خیال ہو جانا پڑتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری عملی و نظری تنقید کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عملی تنقید کا کام نظری تنقید کے مقابلے میں نسبتاً مشکل ہے وجہ یہ ہے کہ نظری تنقید عموماً دوسروں کے اقوال و افکار اور خیالات و نظریات یا خارجی مصادر و ماخذ کو رہنما بنا کر آگے بڑھتی ہے۔ اور بسا اوقات دیکھا یہ گیا ہے کہ اس طرز عمل سے بات سلجھنے کے بجائے مزید الجھاؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔''(۲)

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص:۴۱۰

۲۔عملی تنقیدیں۔از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۲۰۰۱ء ص:۷

ڈاکٹر فرمان کے نظریہ کے مطابق اچھی شاعری شاعر سے جذبے کی شدت و پاکیزگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جس سے شاعری میں ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''جب تک کسی شاعر کے افکار، محسوسات خیالات اور جذبات میں کسی قسم کی ندرت نہ ہو، محض حسن الفاظ یا دل آویز پیکر کی مدد سے وہ زیادہ دیر تک ہمیں اپنا اثیر نہیں رکھ سکتا۔'' (۱)

شاعر یا ادیب جب اپنے تاثرات کو تخلیقی ادب کے سانچے میں ڈھال کر کوئی بات کہتا ہے تو وہ ایک ذات سے نکل کر سماج کی چیز ہو جاتی ہے اسی طرح ادب میں اگر صالح اور ہمہ گیر عناصر موجود ہوں تو وہ ایک قوم ایک ملک کی بندشوں سے آزاد ہو کر ہر قوم اور ہر ملک کی چیز معلوم ہونے لگتی تھی ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں مشاہدات اور وسعت تجربات پر بہت زور ملتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''شاعری خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو شاعر سے جذبے کی شدت اور پاکیزگی کا مطالبہ کرتی ہے جذبے کی شدت اور پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے موضوع سے مخلص ہو، گہرا لگاؤ رکھتا ہو اور اپنی لگن میں سچا ہو، جس نسبت سے شاعر کے جذبات سچے اور گہرے ہوں گے اسی نسبت سے اس کی شاعری سچی، موثر اور گہری ہوگی یوں سمجھ لیجئے کہ جذباتی صداقت کے بغیر صرف منطقی یا علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری جنم نہیں لے سکتی۔'' (۲)

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ جب تک فنکار خود اپنے جذبے، اپنے تجربے اور اپنے موضوع سے متاثر نہ ہوگا وہ اپنے فن سے دوسروں کو متاثر نہ کر سکے گا۔ یہ ضروری ہے کہ جو بات کہی جائے احساس و جذبے کی سچائی اور گہرائی کے ساتھ کہیں جائے ورنہ وہ بے اثر اور بے معنی ہوگی۔

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص: ۴۱۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ ص: ۴۱۲

ڈاکٹر فرمان صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے نقادوں کی طرح وہ باہر سے درآمد شدہ نظریات سے اپنی تنقیدی نگارشات کو اسیر نہیں کرتے وہ قاری سے اپنے زاویہ نظر کو زبردستی منوانے کی کوشش نہیں کرتے وہ عملی تنقید میں اپنے نظریات کو اس طرح سمو دیتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنی شگفتگی کی وجہ سے اپنا ہمنوا بنا لے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تنقیدی نظریات واضح ہیں، ان میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کا خیال ہے کہ تخلیق کار میں موضوع کے برتنے کا سلیقہ ہونا چاہئے۔ اسی لئے ادب میں اسلوب اور انداز بیان کی اہمیت ہے۔ یہ فنی صلاحیت کے لئے زبان سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کسی تحریر کی تنقید کرتے وقت انتہائی غور و خوض اور مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد بے لاگ اور انداز میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں اور دوٹوک انداز میں خود اعتمادی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ فرمان کے اس تنقیدی تجزیہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سائنٹفک سوچ و فکر کے مقابلے تاثراتی رنگ و آہنگ کہیں زیادہ غالب ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> ''میرا ذاتی تاثر آپ کی نظر میں چنداں اہمیت نہ رکھتا ہو، لیکن میری مشکل یہ ہے کہ میں ادبی تنقید کو خواہ اس کا تعلق بہ اعتبار فکر و نظر کسی نوع کی تنقید سے ہو، تاثر سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔ سائنس اور فلسفہ اور بعض دوسرے نظری علوم کی بحث، تنقید میں ذاتی تاثر کا دخل یقیناً عیب کہلائے گا لیکن تخلیقی ادب کی تنقید خواہ کہنے کے لئے وہ کتنی ہی معروضی کیوں نہ ہو، تاثیر کی آمیزش سے خالی نہیں ہو سکتی۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری تاثرات کے اس نظریہ سے نہ صرف اتفاق رکھتے ہیں بلکہ ادب اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں اسی نظریہ کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے تنقیدی مضامین میں تنقیدی اور تحقیقی عناصر پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انہوں نے نثر و نظم دونوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے موضوع و مواد کا تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک کسی نثر پارے یا شعر کی تخلیق کے بارے

۱۔ عملی تنقیدیں۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۲۰۰۱ء۔ ص: ۷

میں وثوق سے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب، کیسے کن حالات میں اور کن محرکات کے تحت وجود میں آئی ہے، اس پر تنقید کا عمل مناسب وکارگر نہیں ہوسکتا۔

مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان کے تنقیدی و ادبی افکار و خیالات و نظریات کھل کر منظر عام پر نظر آتے ہیں، ان کے ایک ایک نظریات کا جوہر مشاہدات پر مبنی ہے۔ ان کے تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے جہاں پر کلاسیکی شعراء مثلاً ولی، میر، درد، غالب، حالی اور اقبال وغیرہ کی شاعری پر قلم اٹھایا ہے۔ وہیں انہوں نے دور حاضر کے شعراء و ادباء پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

میرؔ کی تین مثنویاں معاملات عشق، جوش عشق اور خواب و خیال کے مطالعہ سے ان کے عشق و عاشقی سے آگہی اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری میر کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک عظیم غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز مثنوی نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی بیشتر مثنویاں حسن و بیان اور تاثر کے لحاظ سے غزل جیسی ہیں۔ بلکہ ان مثنویوں میں ایک وصف ایسا ہے جو انہیں غزلوں سے زیادہ اہم بنا دیتا ہے اس وصف کا تعلق میرؔ کی سیرت و شخصیت کے اس پہلو سے جو غزلوں میں اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ مثنویوں میں ہے۔'' (۱)

دردؔ کی شخصیت تصوف اور شاعری بھی فرمان صاحب کے تنقیدی نظریہ کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اس مضمون میں دردؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ان کے مختصر دیوان نے غالبؔ اور بعد کے شعراء کو یہ تنقیدی نکتہ بھی سمجھایا کہ شاعر کی عظمت کا مدار اس کے دیوان کی ضخامت یا اس کی کثرت گوئی پر نہیں بلکہ کلام کے معیار پر ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک تنقیدی مضمون ''فراقؔ ایک رجائی غزل گو'' کے متعلق فراقؔ کی شاعری کا

۱۔ میر کو سمجھنے کے لئے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۹ء۔ ص: ۴۷

۲۔ شخصیت و تنقید و تمثیل نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء ص: ۳۴، ۳۵

نئے انداز سے جائزہ لیا گیا ہے۔

فرمان صاحب فراقؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فراقؔ نے کہنے کے لئے تو نظمیں، مثنویاں، رباعیاں اور نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ فراقؔ کی شاعرانہ انفرادی شخصیت کی ضامن صرف ان کی غزلیں ہیں۔ اگر ان کے شاعرانہ جبثہ سے اس رگ کو کاٹ دیا جائے تو بحیثیت شاعر فراقؔ کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔''(۱)

منٹو کے افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''منٹو کتنا بڑا باغی اور انقلابی تھا۔ اس کے سینے میں برطانوی سامراج کے خلاف کیسا لاوا ابل رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی استحصال سے اسے کتنی نفرت تھی غربت اور افلاس کے خاتمے کے لئے اس کے ذہن میں کیسے کیسے منصوبے تھے۔ معاشی آزادی کا ایک عاشق اور انسانیت کا وہ کتنا بڑا دوست تھا۔ اس کا اندازہ فی الواقع منٹو کے ابتدائی افسانوں سے ہوتا ہے ان کے اندر واقعی ایک بھگت سنگھ چھپا ہوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بھگت سنگھ انقلاب اور بغاوت کے جرم میں ایک ہی دفعہ میں سولی پر چڑھا دیئے گئے، سعادت حسن منٹو عمر بھر سولی پر لٹکا رہا۔''(۲)

اردو دوہا نگاری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اردو میں دوہے کا سلسلہ بہت قدیم ہے اور امیر خسرو سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے عہد تک نظر آتا ہے۔ اس کے باوصف اردو دوہا نہ تو اردو کی شعری روایت و تاریخ کا حصہ بن سکا اور نہ اسے وہ قبول عام حاصل ہو سکا جو برج اور اودھی کے دوہا نگار شعراء یعنی ملک محمد جائسی، کبیر، بہاری لال، رحمٰن، تلسی داس

۱۔ شخصیت و تنقید و تمثیل نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء ص: ۹۲

۲۔ اردو کا افسانوی ادب۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء ص: ۱۲۵

اور میرا بائی وغیرہ کو میسر آتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب عالی کی دوہا نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''عالی کے دوہے اودھی اور برج کے دوہوں کی طرح پریم بانی کی ساری رنگینیاں اپنے اندر رکھتے ہیں ان میں درد، ہجر اور نشاط وصال کے وہ سارے روپ نظر آئیں گے جو اردو ہندی کی کلاسیکی شاعری میں ملتے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو غزل کے متعلق اپنے نظریات کو غزل کے سانچے میں ڈھال کر پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''غزل ہماری شاعری کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے اس کی بدولت اردو شاعری میں عظمت و وقعت کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور اسی کی بدولت وہ اس کی اہل ہوئی کہ دوسری زبانوں کے شعری ادب سے آنکھ ملا سکے۔ جو چیز غزل میں اساسی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بغیر غزل، غزل نہیں رہ سکتی وہ اس کا رومانی رکھ رکھاؤ اور اس کے لب ولہجہ کی ایمانیت و رمزیت ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نیاز فتح پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی عیسوی کے ہر باشعور اور بالغ ذہن سے نیازیات کا مطالعہ کرنے اور ان کے متعلق سوچنے پر خود کو مجبور پایا ہے۔''(۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری حسرت کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس دنیا کے بہت سے گوشے بہت سے پہلو اور بہت سے رخ ہنوز ایسے ہیں جو انسانی مشاہدے اور تجربے کی گرفت میں آئے ہیں۔ یوں بھی حسن

۱۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۰ء ص: ۶۳

۲۔ نگار پاکستان جون ۱۹۹۰ء ص: ۶۵

۳۔ غزل اردو کی شعری روایت۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص: ۶

۴۔ نگار پاکستان مئی ۱۹۹۰ء ص: ۸

عشق کی دنیا، ہر فرد کی ذاتی تجربوں کی توسط سے ایک نئی دنیا ہوتی ہے۔ چونکہ
دوسرے فرد کے لئے یہ دنیا اجنبی ہوتی ہے اس لئے اس کی آگاہی اس فرد کے
لئے غیر معمولی نشاط و استعجاب کا سبب بن جاتی ہے۔ حسرت کے عشق کی دنیا
بھی دوسروں سے الگ ان کی اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا کے تجربے ان کے
انفرادی اور ذاتی تجربے ہیں اس لئے ہم سب کو چونکاتے اور مسرت بخشتے
ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پوری طرح حق ادا کر دیتے ہیں۔
آج بھی ان کا قلم بڑی روانی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب علم و ادب کے اتنے مختلف
النوع موضوعات پر قلم اٹھائے ہیں کہ ان کے موضوعات کی کثرت رنگارنگی اور وسعت مطالعہ قابل ستائش
ہے فرمان صاحب خوش نصیب ہیں کہ ان کے ہم عصروں نے بھی انہیں بڑی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے
اور پڑھتے ہیں اور ہر ایک نے ان کی تحریروں کو سراہا ہے۔ فرمان صاحب ہر صنف ادب کے مرد میداں ہیں۔
ڈاکٹر فرمان صاحب جمالیت پسند نقاد ہیں اور شعر و ادب کو پرکھنے کا ان کا یہی بنیادی نظریہ ہے۔ وہ نظریاتی
اعتبار سے تنگ نظر نہیں ہیں، وہ اگر تنگ نظر اور کٹر نقاد ہوتے تو ایک مخصوص ادبی نظریہ اور حلقے کے علم بردار
ہو کر رہ گئے ہوتے۔ ان کی تنقیدوں میں انسان دوستی کی بنیادی قدریں کبھی اوجھل نہیں ہونے پاتیں۔
بنیادی طور پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری سیاست یا نظریہ کے اسیر نہیں ہیں۔ وہ علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات اور
شاعری کے مداح ہیں۔ مگر اشتراکیت اور ترقی پسند فنکاروں کی تخلیقات کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اقبال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال فکر سخن کے ابتدائی دور میں فارسی اور اردو شاعری کے زیر اثر اس
خیال سے متفق نظر آتے ہیں کہ قدرتی مناظر یا فطری کائنات کا حسن قائم
بالذات اور تحسین کے لائق ہے۔ یہی وہ حسن ہے جسے حسن ازل کہا جاتا ہے

۱۔ ادب یا شخصیات از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء ص ۱۷

اور جس سے روحانی ہم آہنگی پیدا کر کے خود کو اس میں گم کر دینا کمال انسانیت ہے۔"(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالبؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان کا تجدد پسند ذہن کبھی ان سے سرسید جیسے جدید ذہن رکھنے والے دوستوں کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے اور کبھی مقلدوں کی نزاع میں امتناع مثل و نظیر کے مسئلے میں مولانا فضل خیر آبادی جیسے مخلص و محسن صاحب ذوق کی رائے سے اتفاق کرنے کے بجائے ان کے موقوف سے گریز کی صورت نکال لیتا ہے۔ غالبؔ کی فکر کا یہ خاص پہلو جس کا تعلق کبھی نہ ختم ہونے والے غالب کی آرزومندی سے ہے اور قدیم و جدید کو لبیک کہنے سے ہے۔"(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ان تحریروں اور ان کی عملی کوششوں سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ فرمان نے نہ صرف رجحان طبع سے مجبور ہو کر تخلیق و تنقید کے کارنامے انجام دیئے بلکہ ہمیشہ وہ اردو ادب کے دامن کو وسیع تر بنا کر پیش کیا ہے۔

بہار الہ آبادی لکھتے ہیں:

"موجودہ دور میں آل احمد سرور، محمد حسن فاروقی، کلیم الدین احمد، ممتاز شیریں اور اسلوب احمد انصاری تو یقیناً انگریزی ادب کے اسکالر رہے ہیں اور اسی لئے ان کی تنقیدوں میں انگریزی تاثر حاوی ہے۔ لیکن ہمارے دوسرے تنقید نگار جیسے احتشام حسین، محمد حسن، جی سی نارنگ، وزیر آغا، گیان چند، اختر اورینوی، قمر رئیس، وقار عظیم، عبارت بریلوی، فرمان فتح پوری وغیرہ تو بنیادی طور پر اردو کی ہی شخصیتیں ہیں لیکن ان کی تنقید پر بھی انگریزی تنقید کا ہی تاثر حاوی ہے۔"(۳)

۱۔ اقبالؔ سب کے لئے۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۵

۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۲۳

۳۔ شخصیت و تنقید و تمثیل نگاری۔ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء ص: ۷

فرمان صاحب کے تنقیدی مضامین میں انگریزی ادب کے نقادوں یا فلسفیوں کا حوالہ برائے نام ملتا ہے۔ ان کی نظریہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بہت کم لکھا ہے مگر پھر بھی متعدد مضامین ایسے ہیں جو نظریے ہی کے متعلق کہے جاسکتے ہیں جیسے نیا اور پرانا ادب، ادب کی نئی اور پرانی قدریں ادب میں اختلاف رائے کی اہمیت، ادب اور جدید حسیت، ادب اور ادب کی افادیت، ادب اور ادبیات پر مضامین ملتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''ادبی تنقید کی اچھی تحریر وہی ہوتی ہے جو کہ بیک وقت تاثراتی، جمالیاتی، سائنسی ترقی پسند ہوتی ہے۔ محض تاثراتی محض ترقی پسند محض جمالیاتی محض سائنسی ہوتو وہ تنقید نہیں ہوتی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ان مندرجہ بالا اقتباسات سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ تخلیق و تنقید کے جو کارنامے فرمان فتح پوری نے انجام دیئے ہیں اسے اردو ادب فراموش نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

۱۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم۔ص:۶۹۸، ۶۹۹

باب ہفتم

ڈاکٹر فتح پوری کی ادبی خدمات کا مجموعی تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو ادب کے صف اول کے محقق اور نقاد ہیں آپ کے تنقیدی اور تحقیقی کام کو ملک میں اور بیرون ملک میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ جامعہ کراچی میں ایک طویل اور شاندار تدریس خدمات کے بعد آپ کو اردو ڈکشنری بورڈ کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد سے اب تک آپ معروف جریدہ ''نگار'' کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ آپ نے ۱۹۵۰ء میں مختلف ادبی مجلوں کے لئے تحقیقی مقالے لکھنے شروع کئے اور گذشتہ چند عشروں میں ادبی دنیا کی ایک سربرآوردہ شخصیت بن گئے۔ آپ کی مطبوعات میں اردو ادب وتنقید پر سولہ کتابیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے متوازن نقطہ نظر اور ناقدانہ فراست کی وجہ سے اردو ادب میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی تالیفات میں اردو نظم ونثر کے تمام اسالیب کا احاطہ کیا ہے آپ کی فکر اتنی برجستہ اور تحریر پر آپ کو اتنی قدرت حاصل ہے کہ پرانی منظوم داستانوں، تذکروں اور تحقیق وتنقید کے مجرد اصولوں جیسے مشکل موضوعات سے اقبالیات پر عام فہم انداز میں مضمون نگاری کی طرف آنے میں آپ کو ذراسی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی۔

آپ کی محققانہ مہارت اردو ڈکشنری جیسے موثر منصوبہ پر بہت مفید طریقہ سے بروئے کار آرہی ہے اور یہ اردو ادب کے مستقبل کے لئے ایک بہت ہی نیک فال ہے۔ اردو ادب میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ''ستارہ امتیاز'' کا اعزاز عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں اور انہیں بحیثیت ممتاز محقق، ناقد اور ایڈیٹر ادبی جریدہ نگار پاکستان بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی وادبی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اتنے وسیع پیمانے پر اردو ادب کی خدمت کی ہے کہ انہیں بابائے اردو کا نقش ثانی تصور کیا جا سکتا ہے۔

مگر اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بابائے اردو کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی ہے۔ بابائے اردو کے خوابوں میں اردو لغت (کلاں) کا منصوبہ بھی تھا۔ حکومت پاکستان نے ۱۹۵۸ء میں اس کا منصوبہ بنایا اور اس کے مدیر اعلیٰ مولوی عبدالحق مقرر ہوئے۔ انہیں لغت نگاری کا وسیع تجربہ تھا اور ان کے سامنے انگریزی کی آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کا نمونہ موجود تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق ضعیف العمری کی وجہ

سے اردو لغت کی ایک سال کے عرصے سے زیادہ خدمت نہ کر سکے۔ اسی سبب سے اس کی ابتدائی چھ جلدوں کو مرتب کرنے کی ذمہ داری دوسرے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو ادا کرنی پڑی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس حیثیت سے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک کام کیا۔ ترقی اردو بورڈ کا قیام پاکستان کی مرکزی وزارت تعلیم نے ایک قرارداد کے ذریعہ ۱۹۵۸ء میں کیا تھا۔ جناب شان الحق حقی بورڈ کے سکریٹری اور رکن رہے اور انہوں نے تقریباً اٹھارہ سال اس حیثیت سے کام کر کے اعزازی خدمت کی مثال قائم کی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں حقی صاحب نے بورڈ کے سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا تقرر مدیر اعلیٰ اور سکریٹری کی حیثیت سے ہوا تھا۔ وہ دس سال بورڈ کے سکریٹری رہے۔ ان کے زمانے میں لغت کا شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں بورڈ مستقل عمارت واقع گلشن اقبال کراچی میں منتقل ہو گیا۔ ۱۹۸۵ء میں جب ڈاکٹر فرمان صاحب بورڈ کے کل وقتی سکریٹری اور مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے تو انہوں نے شعبہ ادارت میں بیس افراد کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے اردو لغت کی تیاری میں پوری لگن سے کام کیا اور دوسروں سے بھی کام لیا آخر اردو ڈکشنری اکیس جلدوں میں تیار ہوئی اور شائع ہوگئی یہ لغت ان کا اہم ترین ادبی کارنامہ ہے جس پر پاکستان اور دنیا کے ادب کو فخر حاصل ہے۔ ایک ایک جلد ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اردو، فارسی، عربی اور ہندی کے قواعد کی بخوبی جانکاری تھی اس کی وجہ سے وہ لغت کے ترتیب دینے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے علاقائی زبانوں اور بولیوں کے الفاظ اور محاورے کو بھی اس لغت میں شمار کئے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب اس کو جانتے تھے کہ اردو کا ارتقاء پاکستان میں علاقائی زبانوں کی مرہون منت ہے۔ اردو نظم و نثر پر علاقائی زبانوں کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اردو ایک بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے اور اس میں صرف ہندی اور سنسکرت کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ اس کی صحت کی جانب بھی ان کی توجہ رہی ہے۔ حالانکہ انہوں نے بھی سنسکرت استحقاق کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا ہے۔ اور اکثر جگہ صرف پراکرت کی شکل ''ڈپلیٹس'' سے لے کر دے دی ہے۔

اس کے لئے انہیں براہ راست سنسکرت کی لغات سے رجوع کرنا چاہئے تھا۔"

الفاظ کے معنوں کے تعین میں بھی انہوں نے بعض اوقات اس سہل پسندی کو روا رکھا ہے جو لغت کی ابتدائی جلدوں میں ملتی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنی "جامعہ اللغات" جیسی غیر مستند لغت یا پلیٹس جیسی ہندی اردو لغات کو محیط لغت سے دے کر چھٹکارا پالیا گیا ہے۔

جامع اللغات کے بارے میں مدیر اعلیٰ موصوف کو لغت کے پہلے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رائے جان لینا ضروری تھا اور پلیٹس کی گرانبار لغت سے معنی اخذ کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری تھا کہ یہ لغت بہت سے ایسے الفاظ کا احاطہ کرتی ہے۔ جو ہندی سے مختلف ہیں اور جنہیں اردو کے مستند ادیبوں نے اپنی تحریروں میں کبھی بھی استعمال نہیں کیا ہے۔ اس طرح بہت سے الفاظ بغیر اردو کے حوالوں کے داخلِ لغت ہو گئے ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر مسعود حسین نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"لغت نویسی ایک پنچایتی کام ہے اس پنچایت کا ہر فرد اپنی جگہ ہر مشین کے ایک پرزے کی طرح کام کرتا ہے کسی بھی مرحلے میں ذرا سی چوک مشین کی پوری کارگذاری پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔"(۲)

اردو لغت کی تدوین میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے علاوہ دیگر ماہرین زبان نے بھی حصہ لیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے اس عظیم منصوبہ کو تکمیل تک پہونچایا۔ ڈاکٹر فرمان نے اس علمی مہم کا سب سے زیادہ حصہ سرانجام دیا ہے۔ یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا شمار دنیا کے عظیم ترین لغت نویسوں میں کیا جانا چاہئے۔ اس اردو لغت سے زیادہ کوئی دوسری اردو لغت صحیح نہیں ہے لیکن اعلیٰ معیار کی وجہ سے بھی اس کو دوسری اردو ڈکشنریوں پر فوقیت

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۶۳، ۴۶۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد دوم ص: ۴۶۵

حاصل ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ لغت کی تدوین ایک پنچایتی کام ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کی نگرانی میں اتنی جلدیں اردو لغت کی تیار ہوئیں یہ بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ اس منصوبہ کی کامیابی کا سہرا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے سر باندھا جانا چاہئے حالانکہ ابتدائی چھ جلدیں دوسری سر برآوردہ ادبی شخصیتوں کی مرہون منت ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو نگار پاکستان کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ نگار پاکستان فرمان صاحب کی پہچان ہے۔ یہ کارنامہ کم نہیں ہے کہ ۱۹۶۲ء سے آج تک وہ اس ادبی جریدے کو پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔ مولانا نیاز فتح پوری کی جانشینی کا انہوں نے پوری طرح حق ادا کر دیا ہے۔ نیاز صاحب کی طرح انہوں نے بعض اہم نمبر شائع کئے۔ بعض نمبر تو پورے کے پورے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لکھے ہوئے ہیں۔ فرمان صاحب کے شائع کئے گئے نمبروں کی تعداد بہت زیادہ ہیں ان میں جدید شاعری نمبر، تذکروں کا تذکرہ نمبر نیاز فتح پوری نمبر، اصناف ادب نمبر، اکبرالہ آبادی نمبر، میرؔ انیس نمبر، ڈاکٹر محمود حسین نمبر، مولانا حسرت نمبر، قاعد اعظم نمبر، مسائل ادب نمبر، اصناف شاعری نمبر اور جوہر نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سرسید احمد خاں نمبر اور جوہر نمبر دو دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ نگار پاکستان نے نایاب کتابچوں کی دوبارہ اشاعت کی اور اس ادبی خدمت کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ فرمان صاحب نے ایک تنظیم ''حلقہ نیاز و نگار' قائم کی جو ہر سال نیاز فتح پوری پر بین الاقوامی سیمینار کا اہتمام کرتی رہی۔ نگار کے تذکرہ نمبر کے بارے میں رشید حسن خاں نے لکھا:

> ''میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں اور باتوں کے علاوہ اس میں بہت کچھ دخل اس بات کو بھی ہے کہ ادب کے مطالعے میں وہ مجہول قناعت پسندی کے قائل نہیں۔ ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ نیاز صاحب کی فرمائش پر انہوں نے رسالہ نگار کا ایک خاص نمبر مرتب کیا تھا، تذکروں سے متعلق یہ واقعی ناتمام کام تھا ان کی نظر سے یہ بات پنہاں نہیں تھی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ناتمامی کی خلش کارفرما رہی۔ مناسب وقفے کے بعد انہوں نے اس کو پھر سے مرتب کیا اور اسے کتابی صورت میں پیش کیا جن لوگوں نے نگار کے اس خاص نمبر اور اس کتاب، دونوں کو پڑھا ہے، وہ بہ آسانی بخوبی

بتا سکتے ہیں کہ دونوں میں اندھیرے اجالے کا ربط ٹوٹتا جا رہا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بلند پایہ محقق ہیں۔ ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی شاہکار ہے۔ یہ ۶۵۷ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں تذکرہ نگاری کے آغاز وارتقاء اور اس کی تاریخی وادبی اہمیت کا آج تک کی تحقیق وتنقید کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر تذکرے پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں مؤلف کے حالات زندگی، تذکرے کا سال تالیف طباعت اور اس کے اوصاف ونقائص سبھی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ ہر تذکرے کے متعدد تراجم، خصوصاً شروع اور آخر کے بطور نمونہ نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ہر تذکرے کی خصوصیت اور اس کے ماخذ، نیز اس سے مستفید تذکروں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس عمل میں حسب ضرورت دوسرے تذکروں سے مقابلہ وموازنہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اس تصنیف پر جامعہ کراچی نے ڈی لٹ کی سند ان کو عطا کی۔ اس موضوع پر اب تک سب سے دقیع اور جامع کتاب ہے۔ اس میں میر تقی میر کے ''نکات الشعراء'' سے ''آب حیات'' تک لکھے جانے والے سب ہی اہم اور معلوم تذکروں کے بارے میں تمام معروضی وموضوعی معلومات یکجا ہوگئی ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت نومبر ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔

نورین فردوس نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

> ''فرمان صاحب کی تحقیق کو ہم دو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں ایک قسم کی تحقیق تو وہ ہے جو انہوں نے ان موضوعات پر کی ہے جن پر ان سے پہلے بہت کم لکھا گیا۔''
>
> دوسری قسم کی تحقیق وہ جس میں ایسے موضوعات کو منتخب کیا ہے جن پر پہلے لکھا جا چکا ہے اور فرمان صاحب نے ان محققین کا جائزہ لیتے ہوئے اسے نو دریافت مسلّم حقائق کی روشنی میں دیکھا ہے یا نئے ماخذ کی روشنی میں پرکھا۔''(۲)

فرمان صاحب کے نگار کے تذکروں کا تذکرہ نمبر سے پہلے اس موضوع پر بہت کم لوگوں نے لکھا تھا

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات وخدمات۔ مرتبہ امراؤ طارق مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء جلد اول ص: ۲۳۱

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ خلیق انجم۔ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۹۲ء ص: ۶۳

لیکن فرمان صاحب نے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا اور اس نمبر کی اشاعت کے بعد جو کمی تھی وہ کتاب ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' سے پوری ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کے تصانیف علمی اور تحقیقی ہوتے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پوری طرح حق ادا کردیتے ہیں یہی ان کی تحریروں کی نمایاں وصف ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایسے شخص ہیں جن کی ہمدردی اور شفقت دوسروں کا دل موہ لیتی ہے اور نا آسودہ دلوں کے لئے سکون وقرار کا باعث بنتی ہے۔ آپ اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں دور جدید کے ممتاز ترین غالب شناسوں اور اقبال شناسوں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثنوی غزل، نعت، رباعی، تاریخ گوئی ہر ایک صنف سخن پر ان کی تحقیق بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نیاز فتح پوری حسرت موہانی اور محمد علی جوہر کے پرستار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نگارشات کو بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہے۔ ان کو بہت سے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کی ادبی خدمات کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو نظم ونثر کے باب میں ایک کثیر الجہات ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرمان صاحب نے بحیثیت تنقید نگار، محقق، مقدمہ نگار، تذکرہ نویس، مدیر اور مرتب کے اردو ادب کے دامن کو وسیع تر بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک فرد ایک انجمن ایک تحریک ہیں، اُن کی قدر ومنزلت ان کے ہر فن پارے میں تراشیدے ہیرے کے مانند ہیں۔ ایسی ہمہ گیر بلند و بالا شخصیت کی ادبی خدمات کو اردو زبان و ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ان کی ادبی خدمات کا طلسم زماں ومکاں کے حدود کو توڑتا ہوا مسلسل وپیہم رواں دواں ہیں۔

☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف/مرتب	ادارہ مطبع	سنہ اشاعت
۱	اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مکتبہ عالیہ لاہو	۱۹۶۲
۲	تحقیق و تنقید	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	صاعقہ بک ڈپو	۱۹۶۹
۳	تدریس اردو	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	اسلام آباد	۱۹۶۸
۴	مولانا محمد علی جوہر، حیات اور کارنامے	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	اظہار سنتہ لاہور	۱۹۷۰
۵	غالب شاعر امروز فردا	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۷۱
۶	اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۷۱
۷	نواب مرزا شوق کی مثنویاں	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۷۲
۸	دریا کے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۷۲
۹	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	قمر کتاب گھر طبع دوم کراچی	۱۹۸۰
۱۰	زبان اور اردو زبان	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	آئینہ ادب لاہور	۱۹۷۴
۱۱	اردو کی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	آئینہ ادب لاہور	۱۹۷۴
۱۲	نیا اور پرانا ادب	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	قمر کتاب گھر کراچی	۱۹۷۴
۱۳	قمر زمانی بیگم	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۹
۱۴	ارمغان گوکل پرشاد	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۷۶
۱۵	میر انیس حیات اور شاعری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۶
۱۶	ہندی اردو تنازع	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	کراچی	۱۹۸۸
۱۷	اردو املا اور رسم الخط	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	سنگل میل پبلی کیشنز	۱۹۷۷
۱۸	اقبال سب کے لئے	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل بک ھاؤس دہلی	۲۰۰۴
۱۹	اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۲
۲۰	دیدہ و باز دیدہ (سفرنامہ)	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ملتان	۱۹۸۳
۲۱	فن تاریخ گوئی اور اسکی روایت	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۸۴
۲۲	تاویل و تعبیر	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	نذر سنز لاہور	۱۹۸۴
۲۳	نیاز فتحپوری، شخصیت اور فن	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۸۴
۲۴	اردو کا افسانوی ادب	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	عالمین پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۸
۲۵	نیاز فتحپوری دیدہ و شنیدہ	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۸۹
۲۶	اردو املا اور قواعد	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۰
۲۷	اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۹۳

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف/مرتب	ادارہ مطبع	سنہ اشاعت
۲۸	اردو کی بہترین مثنویاں	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۹۳
۲۹	ادبیات وشخصیات	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	پروگریسو پریس لاہور	۱۹۹۳
۳۰	قائد اعظم اور اور تحریک پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۷۶
۳۱	خطبات محمود	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	یونیورسل بکس لاہور	۱۹۸۳
۳۲	اردو نثر کا فنی ارتقاء طبع دوم	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل پبلشنگ ھاؤس دہلی	۲۰۰۱
۳۳	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل پبلیشنگ ھاؤس دہلی	۱۹۹۸
۳۴	مولانا حسرت موہانی شخصیت اور فن	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۷۷
۳۵	قومی یکجہتی ارو پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۹۲
۳۶	سری پرکاش اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور	۱۹۹۳
۳۷	غزل اردو کی شعری روایت	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل کرچی	۱۹۹۵
۳۸	ادب اور ادب کی افادیت	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	کراچی	۱۹۹۶
۳۹	ادا جعفری، شخصیت اور فن	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۸۹
۴۰	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	عاکف بک ڈپو دہلی	۲۰۰۴
۴۱	میر کو سمجھنے کے لئے	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	کراچی	۱۹۹۹
۴۲	ادب اور ادبیات	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مکتبہ عالیہ لاہور	۲۰۰۱
۴۳	عملی تنقیدیں	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مکتبہ عالیہ لاہو	۲۰۰۱
۴۴	تعبیرات غالب	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ادارہ یادگار غالب کراچی	۲۰۰۰
۴۵	شرح ومتن غزلیات غالب	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	بیکن بکس ملتان	۲۰۰۰
۴۶	ایک عظیم وقدیم تہذیبی گہوارہ			
۴۷	مشاہیر فتحپور (ہسوہ)	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	بیکن بکس ملتان	۲۰۰۲
۴۸	قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۶
۴۹	اردو کی ظریفانہ شاعری اور اسکے نمائندے	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل بک ھاؤس دہلی	۲۰۰۴
۵۰	خودنوشت اور تنقید خودنوشت	ڈاکٹر فرمان فتحپوری/ مراؤ طارق		۱۹۸۴
۵۱	شخصیت وتنقید وتمثیل نگاری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	صاعقہ بک ڈپو دہلی	۱۹۷۲
۵۲	علامہ نیاز یادگاری خطبات	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	وقار پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۸
۵۳	انتخاب، مقالات علامہ نیاز فتحپوری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری / مراؤ طرق	وقار پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۸

نمبر شمار　نام کتاب　نام مصنف/مرتب　ادارہ مطبع　سنہ اشاعت

۵۴　اردو لغت تاریخی اصول پر -- اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی دو جلدوں میں

۵۵　شروع کی چھ جلدوں کے علاوہ مدیر اعلیٰ　ڈاکٹر فرمان فتحپوری

۵۶　ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدیر اعلیٰ　۱۹۵۸تا۱۹۶۱ء

۵۷　ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مدیر اعلیٰ　۱۹۷۶تا۱۹۸۴

۵۸　ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ مدیر اعلیٰ　۱۹۸۵تا۲۰۰۷

رسالہ نگار

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ سنہ	نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ سنہ
۱	نگار پاکستان	دسمبر ۱۹۹۰	۲۳	نگار پاکستان	اکتوبر ۱۳،
۲	نگار پاکستان	نومبر ۱۹۸۶	۲۴	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۸۹
۳	نگار پاکستان	اگست ۱۹۸۸	۲۵	نگار پاکستان	جون ۱۹۹۲
۴	نگار پاکستان	اکتوبر ۱۹۸۸	۲۶	نگار پاکستان	ستمبر اکتوبر ۱۹۷
۵	نگار پاکستان	جنوری ۱۹۸۵	۲۷	نگار پاکستان	جنوری فروری ۹.
۶	نگار پاکستان	مئی ۱۹۹۰	۲۸	نگار پاکستان	جون ۱۹۸۸
۷	نگار پاکستان	مئی ۱۹۹۲	۲۹	نگار پاکستان	جولائی ۱۹۹۲
۸	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۹۰	۳۰	نگار پاکستان	مارچ ۱۹۸۹
۹	نگار پاکستان	جون ۱۹۹۱	۳۱	نگار پاکستان	اگست ۱۹۸۵
۱۰	نگار پاکستان	فروری ۱۹۹۱	۳۲	نگار پاکستان	اپریل ۸۹
۱۱	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۸۴	۳۳	نگار پاکستان	مارچ ۹۹۵
۱۲	نگار پاکستان	مئی ۱۹۸۸	۳۴	نگار پاکستان	اکتوبر ۹۹۵
۱۳	نگار پاکستان	نومبر ۱۹۷۶	۳۵	نگار پاکستان	ستمبر ۹۹۵
۱۴	نگار پاکستان	مئی ۱۹۸۳	۳۶	نگار پاکستان	دسمبر ۹۹۵
۱۵	نگار پاکستان	مئی ۱۹۸۵	۳۷	نگار پاکستان	جنوری ۱۶
۱۶	نگار پاکستان	مئی ۱۹۸۷	۳۸	نگار پاکستان	فروری ۱۶
۱۷	نگار پاکستان	مئی ۱۹۹۱	۳۹	نگار پاکستان	مارچ ۹۹۶
۱۸	نگار پاکستان	مئی ۱۹۹۲	۴۰	نگار پاکستان	اپریل ۹۶
۱۹	نگار پاکستان	مئی ۱۹۸۴	۴۱	نگار پاکستان	مئی ۱۹۶
۲۰	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۸۶	۴۲	نگار پاکستان	جون ۱۹۹۵
۲۱	نگار پاکستان	جنوری ۱۹۶۴	۴۳	نگار پاکستان	مارچ ۸۵
۲۲	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۸۸	۴۴	نگار پاکستان	جون ۹۹۰

رسالہ نگار

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ سنہ
۴۵	نگار پاکستان	دسمبر ۱۹۸۴
۴۶	نگار پاکستان	مارچ ۱۹۹۰
۴۷	نگار پاکستان	جولائی ۱۹۹۰
۴۸	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۹۱
۴۹	نگار پاکستان	جولائی ۱۹۸۹
۵۰	نگار پاکستان	ستمبر ۱۹۸۸
۵۱	نگار پاکستان	جون ۱۹۸۵
۵۲	نگار پاکستان	نومبر ۱۹۸۶
۵۳	نگار پاکستان	فروری ۱۹۸۵

نمبر شمار	نام کتاب ورسائل	نام مصنف/مرتب	ادارہ مطبع	سنہ اشاعت
۱	ڈاکٹر فرمان فتحپوری شخصیت اورادبی خدمات	خلیق انجم	کتاب نما خصوصی شمارہ مکتبہ جامع دہلی انڈیا	۱۹۹۲
۲	ڈاکٹر فرمان فتحپوری حیات وخدمات (تین جلدوں میں)	امراؤ طارق	فتح پور ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی پاکستان	۱۹۹۴
۳	ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایک جیت نما صاحب قلم	سلیم اختر	عاکف بک ڈپو دہلی	۲۰۰۵
۴	حیات جاوید	حالی	آئینہ ادب لاہور	۱۹۶۹
۵	کلام طنز مزاج	فاروق ارگلی	فرید بک ڈپو دہلی	۲۰۰۴
۶	ڈاکٹر فرمان فتحپوری احوال وآثار	ڈاکٹر طاہر تونسوی	وقار پبلیکشنز لاہور	۱۹۹۸
۷	کلیات غالب فارسی	امیر حسن نورانی	منشی نول کشور لکھنؤ	۱۹۶۸
۸	مطالعہ غالب	مرزا جعفر علی اثر لکھنوی	طبع دوم لکھنؤ	۱۹۸۷
۹	غالب شناسی اور نیاز ونگار	سلیم اختر	لاہور	۱۹۹۸
۱۰	غالب سب اچھا کہیں جسے	پروفیسر کرار حسین	ادارہ یادگار غالب کراچی	۱۹۹۶
۱۱	شرح دیوان غالب	جوش ملسیانی	دہلی	۲۰۰۵
۱۲	غالب کی فارسی شاعری	پروفیسر وارث کرمانی	دہلی	۲۰۰۵
۱۳	دیوان غالب کامل	نسخہ رضا	باردوم ممبئی	۱۹۹۰
۱۴	نقوش غالب نمبر ۳		لاہور	۱۹۷۱
۱۵	سہ ماہی غالب نامہ		غالب اکیڈمی شمارہ جنور	۲۰۰۰
۱۶	اقبال شناسی اور نیاز ونگار	ڈاکٹر سلیم اختر	وقار پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۸
۱۷	اقبال شناسی اور نیاز ونگار	ڈاکٹر طاہر تونسوی	وقار پبلیکشنز لاہور	۱۹۹۷
۱۸	نقوش اقبال	مولانا ابوالحسن علی ندوی	لکھنؤ	۱۹۹۵
۱۹	کلیات اقبال	ایس۔اے واحد	دہلی	۱۹۷۱
۲۰	فورٹ ولیم کالج	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	بیکن بکس کراچی	۱۹۷۹
۲۱	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر سلیم اختر	کتابی دنیا دہلی	۲۰۰۲
۲۲	مقدمہ شعر وشاعری	وحید قریشی	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۵۳
۲۳	غبار خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد)	مالک رام	ساہتیہ اکیڈمی دہلی	۲۰۰۱
۲۴	موازنۂ انیس ودبیر	علامہ شبلی	مفید عام آگرہ	۱۹۰۷
۲۵	مقدمہ خیالستان	معین الرحمٰن	تاج بک ڈپو لاہور	۱۹۷۶
۲۶	کلیات دلاور فگار	دلاور فگار	دہلی	۲۰۰۳
۲۷	حسرت کی غزل	مجنوں گورکھپوری	لاہور	۱۹۷۹
۲۸	ماہنامہ محفل	سلیم اختر	لاہور	۱۹۷۹
۲۹	اردو میں اصول تحقیق	ڈاکٹر سلطانہ بخش	قومی زبان کراچی جلد اول	۱۹۹۶
۳۰	ہماری زبان	مجنوں گورکھپوری	جون علی گڈھ	۱۹۶۰
۳۱				

نمبر شمار	نام کتاب و رسائل	نام مصنف/مرتب	ادارہ مطبع	سنہ اشاعت
۳۲	ماہنامہ آج کل فروری		دہلی	۲۰۰5
۳۳	ہماری زبان		۸/اگست دہلی	۱۹۷۶
۳۴	شب چراغ	حکیم نثار احمد علمی	کاکوری اکیڈمی ناظم آباد کراچی	۱۹۷۲
۳۵	جشن جمیل الدین عالی	عالمی سیمنار و مشاعرہ	ابوظہبی دبئی	۱۹۸۹
۳۶	ہمارے افسانے	وقار عظیم	اردو مرکز لاہور	۱۹۵۰
۳۷	اردو املا	رشید حسن خاں	دہلی	۱۹۷۴
۳۸	انڈیا ونس فریڈم (مولانا ابوالکلام آزاد)	ہمایوں کبیر	دہلی	۱۹۸۸
۳۹	ندائے دوست (مکتوبات ڈاکٹر فرمان بنام شباہت علی خاں)	شباہت علی خاں	انجمن ترقی اردو پاکستان	۲۰۰۶
۴۰	ماہنانہ شاعر ممبئی (شعرائے اردو کے تذکرے از محمد انصار اللہ نظر)		جون ممبئی	۲۰۰۸